دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

کراچی

ماہنامہ

سچی کہانیاں

November

2017



☆ ...... 'مسئلہ یہ ہے' قرآنی آیات کی روشنی میں آپ سے

ماہنامہ
سچی کہانیاں
کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



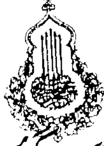
رابطے کے لیے
021-35893122
021-35893123

خط و کتابت کا پتا: C II-88 فرسٹ فلور خیابانِ جامی کمرشل ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ✲ جلد: 34 - شمارہ: 11 ✲ نومبر 2017ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی' سٹی پریس' OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی، رسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے' افریقہ 65 ڈالر' کینیڈا' آسٹریلیا 65 ڈالر' ایشیا' یورپ 55 ڈالر/ قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ



چڑیاں چگ گئیں کھیت

فرد جرم عائد، صحت جرم سے انکار، شاہانہ پروٹوکول، وفاقی وزراء کی عدالت آمد، گورنر سندھ کو منیر ہاؤس میں داخل نہیں ہونے دیا گیا...... عمران خان اور جہانگیر ترین کیا نا اہل ہونے جا رہے ہیں؟ ایم کیو ایم پاکستان نے ٹارگٹ کلر روانہ کر دیے۔ بلاول بھٹو کے خان پر کاری وار...... زرداری کے پنجاب میں ڈیرے، آئی جی سندھ جانے والے ہیں۔ حکومت سندھ کو اُن کی ضرورت نہیں...... آئی جی نے کورٹ سے Stay لے لیا...... کلثوم نواز علیل ہیں...... اب بہتر ہیں...... نواز شریف کے عدلیہ پر وار شہباز شریف کے نیب پر وار...... حمزہ شہباز کے بہن پر وار...... بہن کے اداروں پر وار...... ٹھہریئے اور سوچیے...... خدارا سوچیے اس سارے تماشے میں ہم کہاں ہیں، ہم عوام ہم پاکستانی...... ہماری بات کون کرے گا...... ہماری زندگیوں پر وار، ہماری عزتوں پر وار، ہماری جیبوں پر وار اور اب تو چھرا مار کے ہماری خواتین پر وار، مگر پھر بھی ہم خوش...... ہمارے بچے اسکولوں سے باہر، ہمارے بزرگ اسپتالوں سے باہر، ہمارے جوان نوکریوں سے باہر، کیا ان سب کے ذمہ دار صرف سیاست دان ہی ہیں یا ہمارا شمار ہی بے حسوں کی فوج میں ہوتا ہے۔ سیاست دان اگر بے ضمیر ہیں، اداروں کو تباہ کرنے والے ہیں...... تو پھر ہم بھی کون سا دودھ کے دھلے ہیں، جیسے اعمال ویسے حکمران...... اب بھی وقت ہے...... پھر یہ مت کہیے گا کہ خبر نہ ہوئی اور چڑیاں چگ گئیں کھیت......

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ‘ آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

محترم احوالی دوستو! سلامت باشد! سچی کہانیاں شمارہ اکتوبر (پُراسرار نمبر آپ کو بہت پسند آیا) اِس سلسلے میں آپ نے جو تعریف اور توصیف کی ہے اُس حوالے سے میں آپ تمام دوستوں کا دلی طور پر شکر گزار ہوں۔ ہمارے بے شمار قارئین کرام‘ خصوصاً سینئر قارئین کی یہ شکایت تھی کہ کہانیوں وغیرہ کا Fon بہت چھوٹا ہونے کے باعث اب پڑھنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے‘ سو زیرِ نظر شمارے سے کہانیوں وغیرہ کا Fon بڑھا دیا ہے۔ سچی کہانیاں آپ قارئین اور لکھاری دوستوں کا اپنا ماہنامہ ہے۔ ہم آپ کی ہر شکایت کا ازالہ کرنا اپنا فرض مانتے ہیں۔ اور کیا لکھوں؟ بس اپنے تمام پرانے اور نئے ہی نہیں‘ نو آموز قارئین و لکھاریوں کی تحاریر کا بھی انتظار رہے گا۔

لکھنے والا جو اپنے لہو سے لکھے
کوئی مضمون بھی پامال نہیں ہوسکتا

اور اب آغازِ احوال یہ سب سے پہلا خط ہے بھکر سے ملازم حسین شیرازی صاحب کا لکھتے ہیں۔ محترم ناصر رضا صاحب! آداب...... آپ کی کاوشوں اور لگن کے نتیجے میں سچی کہانیاں روز بروز نکھرتا جا رہا ہے۔ اس کی دل لبھا تبدیلیاں اور نت نئی دلچسپیاں قاری کو ہر دم محوِ مطالعہ رکھتی ہیں۔ تازہ شمارہ نہایت خوبصورت دلکش ہے۔ ساری کہانیاں نہایت دلچسپ ہیں۔ تاریخی کہانیاں کو سچی کہانیوں کی زینت بنا کر احسن قدم اٹھایا ہے۔ پُراسرار کہانیاں لکھنے والے لکھاریوں نے نہایت محنت سے عرق ریزی کی۔ ’وہ قادر ہے‘ از قلم م۔ ن۔ خ دلوں میں ایمان کو تازہ کرتی اللہ پاک کی واحدانیت کی تسلیم و رضا کو اجاگر کرتی سبق آموز کہانی‘ ماشاءاللہ‘ جنوں کی بددعا ام مناہل معلومات دیتی جنوں انسانوں کی دلچسپ روداد‘ نادیدہ مہربان سیمیں غزالہ نہاں غیر انسانی غیر مرئی مخلوق جنات بعض اوقات حسنِ سلوک مہربانیاں پیار و انس انسانوں سے روا رکھتی ہیں‘ خوبصورت کہانی‘ ’کوئلہ بنا سونا‘ اے حمید ہمدردی کے عوض غیر مرئی مخلوق کی طرف سے عطا شدہ کوئلہ جو سونا بن گیا دلچسپ تھا‘ روم میٹ حنا بشریٰ حنا بشریٰ کے جادوئی قلم سے لکھی گئی عمدہ کہانی‘ ایک بے بس مری خاتون کی سسکتی‘ بھٹکتی روح جو اپنی بے چارگی پر نوحہ کناں تھی بہت خوب‘ دو کاسنی پھول‘ منزہ سہام وہ چھوٹا سا درخت وہ پھول جو اپنے اندر اسرار پنہاں کیے ہوئے تھے۔ تجسس سے بھرپور دلچسپ کہانی‘ خوفناک ہانڈی کا رقص‘ تبسم زہرہ رضوی‘ جادونگری سے جڑی عمدہ کہانی‘ صحرا کا سفر ایم حسن نظامی جناتی اور غیر مرئی مخلوق سے پہچان وفا و محبت استوار کرنا یا ان سے ہمدردی مطلوب رکھنا انسانوں کے لیے نقصان دہ ہے سبق آموز کہانی‘ بس وہ خواب تحسین جونیجو ایک خوبصورت حقیقت سے جڑی دلچسپ تحریر‘ آ آسیب آ‘ حسن خواجہ جنات کو یا آسیب زدہ مخلوق کو چھیڑنا یا اُن کا تمسخر اڑانا مصیبت اور اذیت میں مبتلا کر دیتا ہے عمدہ کہانی‘ اسرار ہستی فیضان حسین عثمانی روحانی فیوض و برکات کے لیے اللہ کے نیک بندوں اور ولیوں سے رابطہ رکھنا روح میں ایمان کی تازگی اور ذہنوں میں شگفتگی پیدا کرتا ہے عمدہ تحریر‘ ماشاءاللہ‘ املتاس شازلی سعید مغل سلسلے کی اٹھان اور پھر شازلی سعید مغل کا ہوش رُبا قلم آگے چل کر ایک عمدہ ناول تخلیق کرے گا۔ ماشاءاللہ‘ روح کی کہانی سلیم اختر پر ہت کتھا سرت ساگر سے منتخب کی گئی دس تحریر کردہ و دیگر کہانیاں اسرار میں لپٹی ہندو میتھالوجی کے اندازِ فکر کو اجاگر کرتی ہیں۔ نواب حمیرا خان آخر ایک دلچسپ اور انتقام سے لبریز ناول اختتام پذیر ہوا‘ کتابی شکل میں پسندیدگی کی سند حاصل کرنے والا ماشاءاللہ‘ تھائی لینڈ ایک دنیا زین شمسی معلومات سے پُر‘ ایک خوبصورت ملک کی روداد‘ اپنے اندر دلچسپیاں سمیٹے ہوئے‘ معلومات مختصر تھیں تشنگی رہ گئی۔ ’خون آشام‘ راجہ‘ کرسٹوفر لی‘ ہالی وڈ کا بہترین اداکار ایک بے ضرر‘ اعلیٰ خوبیوں کا پیکر‘ اسکینڈلز سے دور‘ پُروقار انسان‘ جس کی ہارر فلموں نے اسے دوہری شخصیت کا مالک بنا دیا تھا۔ عمدہ کاوش اور اعلیٰ تحریر‘ وہ بلائے جان نجیب عمر غیر ملکی زبان کی کہانی کا ترجمہ بہت عمدہ رہا۔ نیل کے ساحل ڈاکٹر معین قریشی‘ شاعری اور شاعروں کے بارے میں ان کے کلام پر حاصل گفتگو بہت دلچسپ اور اہمیت کی حامل ہیں۔ آپ کی ڈائری‘ مسئلہ یہ ہے‘ دیگر کہانیاں بہت اعلیٰ ہیں آخر میں سب قارئین لکھاریوں کو سلام خاص کر حنا بشریٰ صاحبہ جن کی دعائیں ہمیشہ شامل حال رہیں اور ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھا۔ ناصر صاحب! آپ کو تین کہانیاں ارسال کی تھیں آپ کو مل گئی ہیں؟

❁ بھائی سید ملازم حسین شیرازی! آپ نے بہت سیر حاصل تبصرہ کیا ہے‘ آئندہ بھی ایسے ہی تبصرے کا انتظار رہے گا۔ آپ کی کہانیاں مل گئی ہیں۔ ایک کہانی زیرِ نظر شمارے میں شامل ہے۔

☆ ارشد اقبال چوہان جڑانوالہ سے لکھتے ہیں‘ السلام علیکم! میری تحریر احوال میں شامل کرنے کا شکریہ حکم کے مطابق جلدی حاضری دے رہا ہوں۔ اصل میں میرا زیادہ وقت سفر میں گزرتا ہے۔ اس لیے جہاں سے پرچہ ملے لے لیتا ہوں۔ اس طرح کبھی کبھی حاصل کرنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ اور تبصرہ تو پڑھنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ میں صرف تعریف کا ہی نہیں تنقید کا بھی قائل ہوں۔ حمیرا خان صاحبہ کے نواب نے بہت متاثر کیا۔ انجام بہت اچھا ہے۔ بدی کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔ امید ہے وہ آئندہ بھی ہماری بصیرتوں کو رزق دیں گی۔ نمایاں شخصیات میں

اگر اپنے ملک سے لوگوں کا انتخاب کیا جاوے تو زیادہ اچھا لگے گا۔ اپنے دیس میں بھی نمایاں لوگوں کی کمی نہیں ہے؟ نئے سلسلے 'املتاس' پر دوسری قسط پڑھنے کے بعد تبصرہ کروں گا۔ میجر عبدالقدوس صاحب کی اپنے جیون ساتھی کے ساتھ عقیدت قابل تعریف اور قابل تقلید بھی ہے۔ آخر گڈی آپا میں بھی تو خوبیاں ہوں گی۔ ایسے لوگ واقعی پرستش کے قابل ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ بہت حساس اور اصول پسند ہوتے ہیں پچھلے دنوں بانو قدسیہ کے بارے میں ایک تحریر (داسی) نظروں سے گزری۔ لکھاری نے لکھا ہے کہ آپا نے اپنے بیٹوں کو کہا کہ میرے ساتھ جو بھی کرلو مگر باپ کی شان میں گستاخی برداشت نہ کروں گی۔ میجر صاحب کو میرا پتہ دیں تاکہ میں بھی اُن کے کاغذی تاج محل کو دیکھ سکوں۔ انشاءاللہ اُن کے حکم کی تعمیل ہوگی تمام احوالیوں کو سلام۔

❁محترم بھائی ارشد چوہان صاحب! میری دعا ہے کہ آپ کو ہر سفر کے دوران سچی کہانیاں زادِ راہ کی صورت ضرور ملتا رہے۔ نمایاں شخصیت میں اِس بار اپنے وطن کا فلمی سرمایہ وحید مراد صاحب موجود ہین۔ اور ہاں آپ جیسے ادب نواز محبت شناس بندے کا پتہ میں میجر عبدالقدوس صاحب کو پہنچا رہا ہوں تاکہ آپ اُن کے کاغذی تاج محل کا دیدار کر سکیں۔

☆ نظر علی برمانی دادو سے لکھتے ہیں محترم ناصر رضا بھائی' السلام علیکم! پُراسرار نمبر چار تاریخ کو ملا سرورق بہت خوفناک تھا۔ اداریہ میں منزہ سہام کی دعا پر دل نے بے اختیار آمین کہا۔ کہانیوں میں وہ قادر ہے منورہ نوری خلیق کی ایک شاہکار کہانی تھی۔ آپ نے پھر سے منورہ نوری خلیق کی تاریخی کہانیوں کا سلسلہ شروع کر کے بہت اچھا کام کیا ہے۔ شفق شیکی کی کہانی مائی ناجو اور بلیاں' بہت ہی پُراسرار لگی' اُم مناہل کی جنوں کی بددعا ایک زبردست کہانی تھی۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ اے حمید کی کہانی کوئلہ بنا سونا اچھی تھی اس سے ملتی جلتی کہانی میں کافی عرصہ سے اپنے بڑوں سے سنتا آ رہا ہوں یہ کہانی بھی کچھ ایسے ہی موضوع پر تھی۔ حنا بشریٰ کی روم میٹ ایک اچھی کہانی تھی۔ الماس فاطمہ ارمان کی کہانی روحانی رشتہ ایک دکھ بھری کہانی تھی۔ ادی تحسین جونیجو کی کہانی بس وہ خواب زبردست تھی۔ اس کے علاوہ ہانڈی کا رقص' صحرا کا سفر' آآسیب آ' سانپ کا جسم' اسرار ہستی' یہ اسرار کیا ہے' روح کہانی اور وہ ہمارے خاص مہمان سب بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ مجموعی طور پر پُراسرار نمبر بہت اچھا رہا اور جس لکھاری نے میری کہانی چوری کی میں نے ان کو معاف کیا میں کوئی لکھاری تو ہوں نہیں اور وہ بھی میری ایک عام سی کہانی تھی کوئی بڑی شاہکار کہانی نہیں تھی اس لیے اگر میرے معاف کرنے سے ادارے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے تو ادارہ بھی انہیں معاف کر دے۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔

❁نظر علی برمانی! آپ نے اپنی کہانی سرقہ کرنے والے کو معاف کیا یہ بڑے دل اور ظرف کی بات ہے۔ آئندہ مجھے احوال میں صرف آپ کے تبصرے کا ہی نہیں کہانی کا بھی انتظار رہے گا۔

☆ مور شاہد حسین قمبر شہداد کوٹ سے لکھتے ہیں پیارے انکل ناصر رضا السلام علیکم' امید ہے کہ

دعائے صحت

معروف ایڈورٹائزنگ REPCOM کے روح رواں محترم شمیم احمد کے جواں سال صاحبزادے صابر شمیم اِن دنوں علیل ہیں۔ ادارہ پرل پبلی کیشنز صابر شمیم کی مکمل صحت یابی کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہے' ساتھ ہی تمام قارئین سے التماس ہے کہ وہ بارگاہِ الٰہی میں صابر شمیم کی کامل صحت یابی کے لیے دعا کریں۔

آپ خیریت سے ہوں گے۔ سچی کہانیاں میں واپسی پر (بھلی کرے آیا' خوش آمدید) اور مبارکباد' سید سرور ندیم' اشعر جواد' سیمیں غزالہ نہاں' فیضان حسین عثمانی' ارشد اقبال چوہان آپ لوگوں کی آمد نے محفل احوال کو چار آٹھ نہیں سولہ چاند لگا دیے ہیں۔ ماشاءاللہ ایم حسن نظامی' تحسین خواجہ ڈاکٹر فرمان علی' نظر علی برمانی' بارش علی' ساحل ابڑو' سلام و دعائیں میجر عبدالقدوس گڈی آپا کی مغفرت اور درجات کی بلندی کے لیے دعائیں میری تحسین کتاب مل سکتی ہے؟ ادی تحسین جونیجو' ادی زرینہ جونیجو ڈھیروں سلام و دعائیں نیک تمنائیں' وہ قادر ہے زبردست تحریر تھی۔ مائی ناجو اور بلیاں اسرار سے پُر تھی۔ جنوں کی بددعا' نادیدہ مہربان کوئلہ بنا سونا بہترین تھیں۔ بس وہ خواب بے حد پسند آئی۔ آآسیب آ اچھی تھی۔ حمیرا خان' نواب' بہترین سلسلہ تھا جواب اپنے اختتام کو پہنچا۔ اسرار ہستی یہ اسرار کیا ہے۔ روح کہانی' سانپ کا جسم ایک سے بڑھ کر ایک تحریریں پڑھنے کو دی بہت شکریہ۔

❁مور شاہد حسین! آپ احوال میں آئے شکریہ آئندہ بھی آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

☆ قاضی فیضان حسین عثمانی حیدرآباد سے لکھتے ہیں۔ قابل احترام ناصر رضا بھائی السلام علیکم! آپ کا بھیجا ہوا شمارہ ملا دل خوش ہوا اور پُراسرار نمبر میں اپنی کہانی دیکھ کر دل کو بے حد خوشی ہوئی' کچھ ہی کہانیاں پڑھیں ہیں ایک کہانی کسی نوآموز رائٹر نے لکھی ہے جو شاید اپنے خاندانی پس منظر کو بیان کیا ہے مگر شاید کہیں کہیں اُس پس منظر اور واقعات میں جھول موجود ہے۔ جو اُن کے ناپختہ ذہن' کم علمی اور نوآموز رائٹر ہونے کی نشاندہی کر رہا ہے' اگر ہر شخص اپنے خاندانی واقعات اور حالات کو اُس دور سے بیان کرنا شروع کر دے جس دور میں اُس کے دنیا میں آنے کا دور دور تک پتہ ہی نہ ہو تو معلومات میں کمی تو نظر آئے گی ہی' اور اگر وہ اس کے وقت کے حالات اور واقعات کو کسی بڑے سے سن کر بیان کرتا ہے تو بھی اُن واقعات کی خاندان کے اُن بڑوں سے بھی تصدیق کروالے جو شاید اُن واقعات کو بہت ہی قریب سے جانتے ہوں اور اِس وقت دنیا میں موجود ہوں' یہ کم علمی نہیں تو کیا ہے کہ خاندانی واقعات لکھنے والوں کو یہ تک نہیں پتہ کہ نئی نسل میں دین کی تعلیم کس نے حاصل کی اور دینی تعلیم اور دینی معلومات میں کون کون ہے جو علم رکھتا ہے۔ ڈھول میں لٹ چلا دینا تو ہر کسی کو آتا ہے مگر پختگی اور بالغ نظری سے حالات و واقعات بیان کرنا ہر ایک کا خاصہ نہیں ہوتا۔ اللہ پاک ہمارے علم و عمل میں خیر و برکت عطا فرمائے آمین۔ ناصر

بھائی میری طویل کہانی جو میں نے بھیجی تھیں۔ انتظار رہے گا۔ امید ہے کہ آپ میری اُس کہانی کو شرف قبولیت بخشیں گے۔ آپ کی ڈائری کے لیے کچھ چیزیں بھیج رہا ہوں ذرا نظر توجہ فرمائیں ناصر بھائی' آج کل ہر ایک شخص کو دوسرے کو تکلیف پہنچانے اور دکھ دینے میں شاید لذت محسوس ہونے لگی ہے تب ہی اپنے گھروں کے صحن کو صاف رکھا جاتا ہے اور دوسروں کے گھروں کے دروازوں پر کچرا ڈال دیا جاتا ہے۔ اپنی تسکین اور سکھ کے لیے دوسروں کو پریشان کرنا آج کل ہر انسان کا وطیرہ بن گیا ہے اور شاید یہ ہی وجوہات ہیں جو ہم حقوق العباد کو درست طرح سے ادا نہیں کر پارہے اسی لیے ہم لوگ آج کل پریشانی' تکلیف مصیبتوں اور آزمائشوں میں مبتلا ہیں اللہ پاک اپنا رحم و کرم فرمائے آمین۔

☆ بھائی فیضان حسین عثمانی! آپ کی طویل کہانی اللہ نے چاہا تو آئندہ ماہ سچی کہانیاں کے طویل کہانی نمبر کا حصہ ہوگی۔

☆ عبدالغفار عابد چیچہ وطنی سے لکھتے ہیں۔ قابل احترام ناصر رضا دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کی نعمت سے ہمیشہ مالا مال رکھے آمین۔ آپ کی دعا سے میں خیریت سے گھر واپس پہنچ گیا ہوں۔ سچی کہانیاں آفس میں آپ کے ساتھ گزرا وقت میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ناصر بھائی جب کلیان نگری میں بے دید راجہ کا دور تھا اس وقت میرٹ کو نظر انداز کیا گیا جس سے ادب کی رسوائی ہوئی سچی کہانیاں کی مقبولیت میں کمی آئی اس وقت میں نے بھرپور احتجاج کیا۔ آپ کے ہوتے ہوئے میں احتجاج کروں مجھے گوارا نہیں اس لیے میں خاموش ہوگیا تھا' پھر مجھے کراچی آنا پڑا آپ نے سچی کہانیاں آفس بلایا وہاں جو مجھے عزت ملی وہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں' میری رائے کو اہمیت دی گئی یہ میری نہیں بلکہ ادب کی جیت ہے۔ ناصر بھائی انسان نفرت کرکے خوش نہیں رہ سکتا۔ وہ محبت بانٹ کے سکھی رہتا ہے' مگر عطا کرنے کا عرفان ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا جو عطا کرنے کا اہل نہیں ہے وہ پانے کا بھی حقدار نہیں ہے اس کی جیت عارضی ہوتی ہے جو جلد شکست کے دکھ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ کاش سمجھنے والے سمجھ جائیں۔ سسٹر رفعت شبنم ادب کے بابا گردت رام رحیم سنگھوں کے خلاف میرا قلم جنگ جاری رکھے گا کیونکہ ادب کی رسوائی مجھے ہرگز گوارا نہیں۔ جن کے اپنے من میں اندھیرا ہو ان کا دب خاک روشنی کرے گا روح کا پھول نہ مہکے تو باغ میں جانے کا فائدہ چھوٹے بھائی حسین خواجہ آپ کی دعائیں شامل حال رہیں تو میں چور اور جعلی رائٹروں کو بے نقاب کرکے دم لوں گا' باجی منزہ کی دعا کے ساتھ اپنی آمین شامل کرتا ہوں۔ شازلی سعید مغل کی سلسلے وار تحریر 'املتاس' کی پہلی قسط بہت زبردست رہی۔ حمیرا خان کے ناول نواب کی آخری قسط پڑھ کر محسوس ہوا کہ انسانی زندگی حادثات سے بھری پڑی ہے۔ اگر حکمت سے کام لیا جائے تو انسان اپنی اس فانی زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ وجود کی سمجھو کے زینے سے ذہن کائنات کے لازوال کو جان پاتا ہے' پھر باقی زینے طے کرتا ہے۔ جس میں ایثار' صبر' ملال'

کسر نفسی' عفو و درگزر و دیگر حیثیت رویے شامل ہیں جو انسان کے اندر نرمی اور انسانیت سے ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔ ذات کی نفی کے بغیر وہ فاصلہ طے نہیں ہو پاتا جو محبت کی منزل پر جاکے ختم ہوتا ہے غرض انتقام سے نہ کامیابی حاصل ہوتی ہے اور آدمی ذہنی سکون پا سکتا ہے۔ راجہ کی تحریر خون آشام پر بھی یہی رائے رکھتا ہوں۔ اشعر جواد اپنی کہانی یہ اسرار کیا ہے میں یہ بات کرنے کی کوشش کررہے تھے اگر آدمی کا من صاف ہو تو ہر طرف روشنی ہے۔ محترم سلیم اختر کی تحریر روح کہانی حسب معمول سبق آموز تحریر تھی۔ خالق کائنات تک پہنچنے کا وسیلہ بھی وہ احساس بنتا ہے۔ جو انسانیت کی روح سے جڑا ہوا ہے۔ سلیم بھیا کے لیے بہت سی دعائیں اللہ تعالیٰ ان کو حاسدوں کے حسد سے بچائے آمین۔ ایم حسن نظامی کی تحریر صحرا کا سفر' پڑھ کر پتہ چلا کہ سفر کی اہمیت منزل سے کہیں زیادہ ہے جو سفر پر یقین رکھتا ہے۔ منزل بھی انہی کو ملتی ہے۔ تبسم زہرہ رضوی کی خوفناک ہانڈی کا رقص جاہلیت کے دور کی نشاندہی کررہی تھی۔ مبشر سعید کے شعر نے ہی عقیلہ حق کی کہانی کی وضاحت کردی اس پر اتنا ہی کافی ہے۔ زیڈ اے راجپوت کی عبرت کی نشانیاں بہت غور طلب تھی۔ انسان ابدی زندگی کو چھوڑ کر فانی زندگی کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ انسان کی اس زندگی میں کچھ نہیں سوائے سفر کے تحسین جونیجو کی بس وہ خواب نیناخان کی سانپ کا جسم' فیضان حسین عثمانی کی اسرار ہستی' اور سیمیں غزالہ نہاں کی نادیدہ مہربان وغیرہ سب تحریریں سبق آموز تھیں۔ ناصر بھائی اگلے تبصرے سے پہلے آپ کو کہانی مل جائے گی۔ آخر میں سستی شہرت کے بھوکے جعلی رائٹروں کے لیے یہ شعر

یہ شہر چھوڑ دے کہ شرافت اسی میں ہے
رسوائے شہراب تیری عزت اسی میں ہے

یااللہ' یا کریم و رحیم ہم پناہ چاہتے ہیں ہر بری گھڑی سے آنے والے وقت کی آفات' مصیبتوں' پریشانیوں' تکالیف اور بیماریوں سے بری نظر اور بری نیت کے شر سے یااللہ ہم سب کو ہمیشہ اپنی حفظ و امان میں رکھے آمین۔

☆ بھائی عبدالغفار عابد! آپ کہانی کی دنیا سے' جعلی لکھاری بونوں کا صفایا کرنا چاہتے ہو' یہ مقصد برا نہیں ہے بس ذرا یہ احتیاط رہے کسی کا دل نہ ٹوٹے کسی کی عزت پر حرف نہ آئے۔

دیے میں ڈھل گئی تو دیکھ لینا
یہ مٹی روشنی دینے لگے گی

☆ غلام مرتضیٰ علوی گوجرہ سے لکھتے ہیں۔ محترم ناصر رضا صاحب! السلام علیکم! کے بعد عرض ہے اکتوبر کا شمارہ کتنے ہی ماہ بعد بروقت ملا۔ ورنہ گزشتہ چار ماہ سے شمارہ دس یا بارہ کو ملتا تھا جس کی وجہ سے تازہ شمارے پر تبصرہ بھیجنا ممکن نہیں ہوتا تھا کہ اتنا لیٹ اگر ہم ارسال کریں گے تو پھر آپ کس طرح شائع کریں گے۔ بہرحال اِس ماہ شمارہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ملا۔ امید ہے آئندہ

اور جلدی ملا کرے گا۔ پُراسرار نمبر کے ٹائٹل کی تعریف نا کرنا زیادتی ہوگی۔ آرٹسٹ نے بھرپور محبت سے ایک عمدہ سرورق بنایا۔ شمارہ کھولا نئے سال کی دعا پڑھی اور آمین کہا۔ احوال کی بیٹھک میں ہمارے ساتھی بیٹھے گزشتہ شمارے پر مزے مزے کے تبصرے کررہے تھے۔ تمام ہی خطوط بہت اعلیٰ ہیں جو زیادہ پسند آئے ہیں ان میں کراچی کے اشعر جواد صاحب محترمہ سیمیں غزالہ نہاں صاحبہ بھائی حسین خواجہ صاحب ڈاکٹر فرمان صاحب نظر برمانی صاحب حیدرآباد کے فیضان عثمانی صاحب ارشد اقبال جڑانوالہ کے اور میجر (ر) عبدالقدوس کے خط بہت لطف دے گئے۔ خدا ان تمام دوستوں اور سچی کہانیاں کے تمام قارئین کو سدا سلامت رکھے اور یہ چمن یوں ہی آباد رہے۔ اب بات کرتے ہیں تحریروں کی چونکہ ابھی صرف تین تحریریں پڑھی ہیں اور تینوں کی تینوں عمدہ ہیں ان میں اے حمید کی کوئلہ بنا سونا شفق شیکی کی مائی ناجو اور بلیاں اور روحانی رشتہ کے علاوہ کسی تحریر پر رائے نہیں دے سکتا کہ ابھی اور تحریریں پڑھی ہی نہیں۔ اور ناصر بھائی میں بہت جلد آپ کو ایک یا دو ترجمہ شدہ تحریریں اور معاشرتی مسائل پر اپنی تازہ تحریر ارسال کروں گا امید ہے کسی کونے میں مجھے بھی جگہ مل جائے گی اور ایک بات یہ کہنی تھی کہ میرے پاس سچی کہانیاں کے 1995ء سے 2005ء تک کے پُراسرار نمبروں کا مکمل سیٹ موجود تھا جو ایک دوست پڑھنے کے لیے لے کر گیا تو اُس نے گم کردیے۔ کیا مجھے ادارے سے قیمتاً 1995ء سے 2005ء کے تمام خاص نمبرز مل جائیں گے اگر مل جائیں گے تو میرے پتے پر وی پی پی کردیں میں وصول کرلوں گا۔ زندگی رہی تو آئندہ ماہ تبصرے اور تحریر کے ساتھ حاضر ہوں گا۔

☫ بھائی غلام مرتضیٰ علوی! ہماری کوشش تو یہی ہے کہ سچی کہانیاں ہر ماہ جلد سے جلد اپنے قارئین تک پہنچے۔ آپ کے ترجمہ شدہ اور طبع زاد تحاریر کا انتظار رہے گا ٹائٹل کی تعریف کے لیے ہمارے آرٹسٹ کاشف صاحب آپ کے شکر گزار ہیں۔ رہی پرانے شماروں کی بات تو ہم نے آپ کا یہ مسئلہ اپنے سرکولیشن ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھا دیا ہے۔

☆ بارش علی ثمیر چک جیوے والا سے لکھتے ہیں۔ ناصر انکل جی! آداب پانچ تاریخ کو پُراسرار نمبر ملا واہ کیا کہنے آپ نے تو اِس بار غضب کردیا یہ شمارہ اپنی نوعیت کا بہت ہی منفرد نمبر تھا۔ سرورق شوخ کے ساتھ ساتھ خوفناک بھی تھا جو کہ بہت ہی اچھا لگا۔ منزہ آپی کا اداریہ ہر بار کی طرح اس بار بھی اعلیٰ رہا۔ میری طرف سے سب کو نیا اسلامی سال مبارک ہو محفل احوال میں صدارت کی کرسی پر سید سرور ندیم صاحب براجمان تھے وہ بھی انتہائی مختصر تبصرے کے ساتھ باجی سیمیں غزالہ کا تبصرہ اور کہانی دونوں ہی شاندار رہے۔ بھائی حسن نظامی کا تبصرہ اور کہانی بھی کمال کی تھی بھائی حسین خواجہ کی کہانی بھی اچھی رہی اور تبصرہ تو ہمیشہ کی طرح خوب تھا ڈاکٹر فرمان بھٹی بہت مختصر تبصرہ کرتے ہیں پتا نہیں کیوں؟ امیر حمزہ خان احوال میں ویلکم نظر علی برمانی بھائی میں آپ کے ساتھ ہوں ناصر انکل آپ ناانصافی نہیں ہونے دیں گے۔ فیضان حسین عثمانی صاحب آپ کی شکایت بھی دور ہوجائے

گی ارشد اقبال صاحب زبردست تبصرہ تھا آپ کا ہمارے من پسند پرچے کی کہانیاں ہر دفعہ کی طرح اس بار بھی انتہائی منفرد تھیں میں نے ساری کہانیاں پڑھی ہیں۔ انکل جی سچی کہانیاں کا فیملی نمبر کب تک آئے گا؟ جس میں خاندان سے جڑی کہانیاں ہوں گی؟

☫ بارش علی ثمیر! آپ کو شمارہ اکتوبر پسند آیا شکریہ فیملی نمبر کا آئیڈیا اچھا ہے اِس پر غور ضرور ہوگا۔

☆ حسین خواجہ منچن آباد سے لکھتے ہیں۔ محترم ناصر رضا سلام تین اکتوبر کی صبح رحیم یار خان ریلوے چوک چوہدری نیوز ایجنسی سے سچی کہانیاں کا پُراسرار نمبر خریدا جو کہ بہت ہی زبردست تھا اور اوپر سے میری کہانی بھی شامل تھی اس نے تو میری خوشی ڈبل کردی میری کہانی کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ نئے سال کی دعا محترمہ منزہ سہام صاحبہ کی طرف سے بہت اچھا پیغام تھا احوالی محفل خوب رہی۔ سید سرور ندیم صاحب بھائی ایم حسن نظامی صاحب اشعر جواد بہن سیمیں غزالہ نہاں بہت خوب ڈاکٹر فرمان بھٹی صاحب بھی خوب رہے امیر حمزہ خان بہت اچھے بھائی بارش علی ثمیر بہت اعلیٰ بھائی فیضان حسین عثمانی کی شکایت بجا تھی اور تبصرہ اچھا تھا۔ ساحل ابڑو بھائی آپ کی کہانی کب پڑھنے کو ملے گی؟ ایم افضل آپ کا شعر اچھا تھا اور تبصرہ مختصر تھا بہرحال پڑھ کر اچھا لگا بہن سیمیں غزالہ نہاں کی کہانی نادیدہ مہربان بہت اچھی تھی۔ بہن نے ایک جگہ لکھا ہے۔ وہ غریبوں کا علاج مفت کرتے تھے وہ صرف وڈیروں اور زمینداروں سے پیسے لیتے تھے...... بہن خدا کا خوف کرو آپ کس دور میں رہتی ہو بھلا وڈیروں نے بھی کبھی پیسے دیے؟ بہرحال آپ کی کہانی حقیقت کے قریب ترین تھی بھائی فیضان حسین عثمانی صاحب کی کہانی اسرار ہستی واہ واہ کیا کہنے بہن تحسین جونیجو آپ کی تحریر لاجواب ہی نہیں باکمال بھی تھی پیارے بھائی ایم حسن نظامی بھائی صحرا کا سفر خوب رہی محترم اشعر جواد یہ اسرار کیا ہے بہت اچھی تحریر تھی تشنہ بریلوی صاحب سپرہٹ بہن شازلی سعید مغل املتاس لاجواب رہی پڑھ کر اچھا لگا خون آشام راجہ صاحب بہت اچھا موضوع تھا آپ نے قلم بند کیا ہے اچھا جی اب چلتے ہیں آپ کی ڈائری کی طرف بات تو سچ ہے بھائی سید سرور ندیم صاحب کا انتخاب اچھا ہے بہن تحسین کا بھی انتخاب اچھا رہا پیارے شیخ صاحب موبائل فون پر بہت خوب فرمایا آپ نے محترم ناصر رضا اس بار پرچہ سرورق سے لے کر اختتام تک آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ناصر صاحب آپ کی نظر ایک شعر اور اسی کے ساتھ ہی اگلی دفعہ تک کے لیے اجازت۔

کیا کوئی ہم سا ہوگا صاحب اعزاز
حادثے تعاقب میں گردِ شوق دامن گیر

☫ بھائی حسین خواجہ! آپ کو پُراسرار نمبر پسند آیا ہماری محنت وصول ہوگئی۔

☆ طاہر بٹ آزاد کشمیر سے لکھتے ہیں۔ عزیزم ناصر رضا سلام عرض ہے۔ سچی کہانیاں کا پُراسرار نمبر بہت پسند آیا۔ ایک بھی ایسی کہانی نہیں تھی جسے پڑھ کر ایسا لگا ہو کہ میں نے تو وقت ہی

برباد کیا ہے' ہر تحریر اپنے اندر ایک خوبی رکھتی تھی' آخر سچی کہانیاں نے یہ ثابت کر ہی دیا کہ اس کے پلیٹ فارم پر سبھی برابر ہیں' اس پرچے میں سبھی کے لیے ایک خاص مقام ہے' مجھے زیادہ لکھنا آتا نہیں اور کسی ایک فرد کا نام لے کر باقی لوگوں کا دل نہیں دکھا سکتا' اور ویسے بھی جہاں سبھی ایک دوسرے پر بھاری ہوں وہاں کسی کا نام لے کر دشمنی مول لینے والی بات ہے' ناصر صاحب! آپ کی محنت نے مجھے احوال میں خط لکھنے پر مجبور کیا ہے' ورنہ مجھے کہاں کچھ لکھنا آتا ہے۔

☫ طاہر بٹ صاحب! آپ نے محبت سے جو لکھا اچھا لکھا' میں اِس کے لیے دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔

☆ فوجی یاسین بھٹی لاہور سے لکھتے ہیں۔ احوالی برادری کو میری طرف سے پیار بھرا سلام' اس بار سچی کہانیاں نے تو دھوم ہی مچادی' سپر سے بھی اوپر ہے کیا کہنے' سچی کہانیاں کے اِس پُراسرار نمبر کو میں منفرد نمبر بھی کہنا چاہوں گا' کہانی آآسیب آ' نادیدہ مہربان' روم میٹ' املتاس اور دیوی کا انتقام لاجواب رہیں' تبصرے سبھی اچھے تھے' ڈائری کے انتخابات بھی خوب تھے' ایک عدد تحریر میں بھی قلم بند کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اگر کامیاب ہوا تو ضرور ارسال کروں گا' ورنہ آج سے پہلے کی طرح اُسی ردی کی ٹوکری میں ڈال دوں گا جس میں اب تک تبصرے ڈالتا آیا ہوں۔

☫ بھائی یاسین بھٹی! آئندہ اپنا تبصرہ ردی کی ٹوکری میں نہیں اِس بار کی طرح احوال کے لیے پوسٹ کیجیے گا' آپ کو پُراسرار نمبر پسند آیا بہت بہت شکریہ۔

☆ ایم افضل کراچی سے لکھتے ہیں۔ محترم ناصر بھائی سلام' امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ اپنے ناقص تبصرے کے ساتھ پھر حاضرِ خدمت ہوں۔ ماہ اکتوبر کا پُراسرار نمبر اپنی مثال آپ ٹھہرا۔ سرورق سے اندازہ ہو رہا تھا کہ شمارہ اپنے اندر اک پُراسرار دنیا رکھتا ہے۔ سلیم اختر صاحب کی روح کہانی تو سب سے ممتاز ٹھہری' اگر راجہ جواب نہ دیتا تو ہر کہانی پہلی کا درجہ رکھتی' دو کاسنی پھول کا بھی جواب نہیں اسرار میں لپٹی کہانی اپنے اختتام پر ایک معمہ چھوڑ گئی۔ اور روم میٹ کا بس ایک جملہ دل میں اتر گیا کہ خواب آدھی زندگی ہوتے ہیں۔ یہ اسرار کیا ہے بھی اپنی طرز کی منفرد کہانی تھی۔ یہ سچ ہے کہ دنیا اسرار سے بھری پڑی ہے اگر اس پر گفتگو کی جائے تو خط طویل ہو جائے گا بس اس شعر کے ساتھ اجازت ہے جو میر صاحب نے کہا

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتے ہیں دیوار کے بیچ

☫ بھائی ایم افضل! آپ نے اپنے تبصرے کے ساتھ 'ناقص' کا لفظ یقیناً 'نظر بٹو' کے طور پر ارسال کیا ہے۔ پلیز اپنی ناقص کارکردگی میں مزید اضافہ کریں مطلب یہ کہ تبصرہ ذرا طویل کریں۔

☆ فوزیہ اختر کراچی سے لکھتی ہیں۔ ناصر رضا صاحب! السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے میں تقریباً پندرہ سال سے سچی کہانیاں کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ لیکن پہلی بار لکھنے کی

جسارت کر رہی ہوں۔ سچی کہانیاں ایک منفرد اور معیاری ڈائجسٹ ہے۔ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے' ایک کہانی ارسال کر رہی ہوں جو کہ سچی ہے مجھے امید ہے جلد شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔

☫ فوزیہ اختر صاحبہ! آپ نے پندرہ سال بعد آخر کار سچی کہانیاں میں خط لکھ ہی دیا جس کے لیے ہم دل سے آپ کے شکر گزار ہیں۔ آپ کی ارسال کردہ پہلی سچی کہانی' زیرِ نظر شمارے میں شامل ہے۔ اب آپ کے مزید خطوط اور کہانیوں کے لیے ہمیں زیادہ انتظار تو نہیں کرنا ہوگا۔

☆ جیجل میتلو کراچی سے لکھتے ہیں۔ محترم ناصر رضا! السلام علیکم! سارے سچی کہانیاں کے اسٹاف ممبران سمیت سب خوش و خرم ہوں گے انشاء اللہ' آپ پھر سچی کہانیاں کی بزم میں آگئے ہیں بہت اچھا ہوا' آپ میرے محسن ہیں میری پہلی کہانی آپ ہی نے سچی کہانیاں میں چھاپی تھی یہ میں کبھی نہیں بھولی' میری ایک طویل کہانی آپ کے دفتر میں موجود ہے اور اب ایک کہانی اور ایک غزل بھیج رہی ہوں امید ہے جلد شائع کر کے مجھے شکریہ کا موقع دیں گے۔ تاریخی کہانی اور سارے سلسلے جو آپ نے نئے شروع کیے ہیں سب پسند آئے ہیں اب انشاء اللہ ہر ماہ تبصرہ بھیجوں گی کچھ مہینوں سے بہت مصروف تھی نہ رسالہ پڑھ سکی نہ تبصرہ بھیج سکی آخر میں سب کو سلام۔

☫ اچھی بہن جیجل میتلو! احوال میں آپ کی آمد اچھی لگی۔ آپ کی ہمارے دفتر میں موجود کہانی آئندہ ماہ سچی کہانیاں کے طویل کہانی نمبر کا حصہ ہوگی۔ اور ہاں اب ہر ماہ تبصرے بھیجنے والی بات بھول مت جانا۔

☆ اُمِ مناہل ایبٹ آباد سے لکھتی ہیں۔ جناب ناصر انکل! السلام علیکم! اس دفعہ خط لکھنے میں دیر ہوگئی ہے ہو سکتا ہے جب تک یہ آپ کے پاس پہنچے رسالہ پریس میں جا چکا ہو اس لیے کہانیوں پر بھی تبصرہ نہیں کر سکتی' لیکن ایک کہانی آپ کو بھیج رہی ہوں جو میرے پردادا کی روحانیت کی ہے کہانی اگر اچھی لگے تو کسی شمارے میں جگہ دے دیں میں چاہتی ہوں دسمبر یا جنوری میں چھپ جائے کیونکہ دو کہانیاں مزید رکھی ہوئی ہیں اس کے بعد وہ بھیجوں گی اس کہانی کے بھیجنے میں اس لیے دیر ہوئی ہے کہ اس پر میں نے بہت محنت کی ہے تفصیل فون پر بتاؤں گی ابھی کے لیے اتنا ہی۔

☫ اُمِ مناہل! آپ کی یہ ارسال کردہ کہانی اللہ نے چاہا تو سچی کہانیاں کے جنوری 2018ء کے شمارے' جو پُراسرار نمبر ہوگا میں شامل ہوگی۔ آئندہ ماہ تبصرے کا انتظار رہے گا۔

☆ معروف ادبی شخصیت محمد سلیم اختر کی لاہور سے آمد ہوئی ہے' لکھتے ہیں۔ محترم جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! سچی کہانیاں سے وابستہ تمام احباب کو میرا سلام پہنچے۔ سچی کہانیاں ایک مدت سے پڑھ رہا ہوں اور ہر ماہ اس کا انتظار بڑی شدت سے رہتا ہے۔ بعض کہانیاں تو واقعی ہی ناقابلِ فراموش ہوتی ہیں۔ میں خط پہلی بار لکھ رہا ہوں اور ریڈیو کی یادیں کے حوالے سے ایک کہانی ماہنامہ سچی کہانیاں کے لیے بھیج رہا ہوں اگر پسند آجائے تو اسے ضرور شامل کریں آپ کی

حوصلہ افزائی کے لیے میں مشکور رہوں گا اور ایک نئے جذبے سے مزید لکھنے کی کوشش کروں گا۔

ایک زمانہ تھا جب ریڈیو تفریح کا واحد ذریعہ تھا لوگ گھروں میں بیٹھ کر ریڈیو پروگرام بڑے شوق سے سنا کرتے تھے آج ہماری تفریح کے لیے کئی چیزیں آ گئی ہیں جس میں ٹیلی ویژن' کیبل' انٹرنیٹ اور ڈی وی ڈی وغیرہ شامل ہیں اگرچہ ٹیلی ویژن نے بہت ترقی کر لی ہے اور ریڈیو کی جگہ بھی لے لی ہے' لیکن ہم ماضی کے ریڈیو پروگراموں کو کبھی نہیں بھلا پائے' ریڈیو کی بھولی بسری یادیں آج بھی ہمارے دل و دماغ پر اس طرح نقش ہیں جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔

☸محترم بھائی محمد سلیم اختر! آپ کا خط اور تحریر ریڈیو کی یادیں پڑھ کر ہمارا دل شاد اور آباد ہوگیا۔ ریڈیو کی یادیں تو میرے بھی دل کے دامن سے جڑی ہوئی ہیں۔ آپ کی یہ تحریر انشاء اللہ آئندہ شمارہ دسمبر کے صفحات کی زینت ہوگی۔ آپ کی مزید تحاریر کا بھی انتظار رہے گا۔

☆محترم میجر (ر) عبدالقدوس لاہور سے شریک احوال ہوئے ہیں ۔ ناصر بیٹا! دعائیں' رسالہ مل گیا' اور اس کی قبا میں چھپا تمہارا احترام' پیار محبت ایثار' فہم و فراست درد محسوس کرنے کی صلاحیت اپنے محسوسات کو زبان دینے کی اہلیت' سب ایک ساتھ مل گئے۔ میں کہتا تھا کہ میں دنیا کا خوش قسمت ترین شخص ہوں' جسے تحسین مل گئی' اور اب دنیا کا بدقسمت ترین شخص جس سے تحسین چھن گئی۔

اک نقطے پر آ کر
تھم گئی زندگی مری
تحسین میرے ساتھ جو تھی
تھا سب کچھ میرا
اور اب......!
کچھ بھی نہ رہا میرا
تم نے میری حالتِ زار کو کیسے جان لیا اپنی نظم
صرف تم
تم......!
تم......!!'
اور صرف تم......!!!'
لو ختم ہوگئی ہماری داستاں......!

سینکڑوں میل مجھ سے دور بیٹھ کر' کبھی میری شکل نہ دیکھنے کے باوجود تم نے میرا دل کیسے دیکھ لیا۔ اُس میں چھپا درد کیسے بھانپ لیا؟ اتنے دنوں کے غور و غوض کے باوجود میں سمجھ نہ پایا' لگتا ہے یہ تحسین کی پہچان ہے۔ وہ جو سب کی گڈی آپا تھی' جس نے سب میں پیار بانٹا' ماں کا پیار' بہن کا

پیار بیٹی کا پیار' وجہ جو مجسمہ پیار تھی۔ وہ گڈی آپا جو سارے زمانے کی گڈی آپا تھیں۔ اور جسے میں اپنی تحسین سمجھتا تھا۔ میری تحسین کہتا تھا۔ یہ اُسی کی ذات کرشمہ ساز ہے جو آج بے شمار لوگ میرے بن گئے ہیں۔ وہ لوگ جو مجھے کبھی جانتے نہ تھے۔ جنہوں نے کبھی مجھے دیکھا تک نہیں' آج میرا دکھ سمجھنے لگے ہیں۔ مجھے جاننے لگے مجھے پہچاننے لگے' بیٹا ناصر تم اُن لوگوں میں نمایاں نظر آتے ہو۔ تحسین کی کرشمہ ساز شخصیت کو میں نے اپنی ہی ایک نظم میں کبھی یوں لکھا تھا۔

اُس کی چاہت میں چھپی
حدت کا یہ کرشمہ تھا
اُس کے قرب میں آنے والے
ہیرے بھی پگھل جاتے ہیں

حالانکہ دنیا بھر کا سائنسی علم اس بات پر متفق ہے کہ ہیرے پگھلتے نہیں! اسی تحسین کی یاد میں گزرنے والے شب و روز میں اک نئے عظم نے جنم لیا ہے۔ تم سے فون پر کچھ بات ہوئی تھی۔ 'Tehseen Educational' کے نام سے شروع ہونے والے اِس کارِ خیر کی تفصیل تمہاری خواہش کے مطابق منسلک کر رہا ہوں۔ آؤ سب مل کر میرے ساتھ ہاتھ اُٹھا کر 'میری تحسین' کی مغفرت اور درجات کی بلندی کے لیے دعا کریں۔ تمہیں 'تم' کہہ کر مخاطب کیا۔ تحسین کا بیٹا سمجھا' تحسین اور اپنی شفقت کا حق دار سمجھا بیٹی منزہ سہام اور دیگر تمام لوگوں کو جو ماہنامہ سچی کہانیاں اور پرل پبلی کیشنز کے تحت چھپنے والے تمام رسائل و جرائد سے منسلک ہیں سب کو میرا پیار پہنچانا۔

☸محترم (ر) میجر عبدالقدوس صاحب! آپ نے مجھے جو محبت اور مان دیا ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔ سچی کہانیاں کے شمارے (اکتوبر 2015' اکتوبر 2017ء) جلد آپ کو مل جائیں گے۔ میرے لیے اور کوئی حکم......؟

اور اب اجازت سے پہلے آج کی آگ اور بارود سے جھلسی دنیا میں سانس لیتے ہوئے بھی روشن امید کا ایک پیغام......

پیغام
میری نگاہیں بھی منتظر ہیں
اُس سحر کی
کہ جس کی کرنیں پیام دیں گی
لو اب سے دنیا میں امن ہوگا
کچھ ایسی خوشیوں کا منتظر ہوں
جو گولہ بارود دفن کر کے
محبتوں کو دوام دیں

پھر ملیں گے گر خدا لایا
ناصر رضا

تاریخ کے جھروکوں سے جھانکتی علم سے آباد ایک زندہ تحریر

تحفۂ خاص

حسرت موہانی کا خیال

> اے زہد عشق تیری ہدایت کے واسطے
> سوغاتِ عشق لارہے ہیں کوئے بتاں سے ہم

م۔ن۔خ

ستاروں کے چراغ روشن ہوئے تو آسماں جگمگا اٹھا۔شب کی تاریکی انہیں مزید نمایاں کررہی تھی۔آبادی کی طرف جانے والی سڑک‘ اس پر دورویہ درختوں کی قطاریں اورچشمہ سبھی



اندھیرے میں ڈوب گئے تھے۔ آبادی اور ویرانے کا فرق مٹ گیا تھا۔ ہاں‘ دور کہیں کتوں کے بھونکنے کی آواز یقین دلا رہی تھی کہ آبادی زیادہ فاصلے پرنہیں۔ایسے میں دریا کے کنارے ٹھنڈی ریت پر لیٹے وہ ایک دوسرے میں گھل مل گئے‘ان کے انداز بتارہے تھے کہ ان کی یہ ملاقات پہلی نہیں ہے پھر جب ستاروں کے چراغ یکے بعد دیگرے بجھنے شروع ہوئے تو تاریکی میں سرگوشی ابھری۔

’’اب مجھے جانا ہے۔‘‘

’’ابھی نہیں‘ کچھ تو اور ٹھہرو۔‘‘ یہ بھی سرگوشی ہی تھی۔

’’میں چاہتا ہوں‘ صبح ہونے سے قبل ہی اپنا سفرشروع کردوں۔اگران سب سے پہلے پہنچ گیا تو کام بن جائے گا ورنہ ناکامی......‘‘

سسکیوں کی آواز نے جملہ قطع کردیا۔

’’ارے‘ تم رو رہی ہو؟ پاگل ہو گیا؟ میں نے کہا نا کہ کام بنتے ہی واپس آؤں گا اور تمہیں ہمیشہ کے لیے لے جاؤں گا‘ صرف چند روز کی تو بات ہے‘ مجبوری نہ ہوتی تو کبھی نہ جاتا۔‘‘

’’اور شادی؟‘‘ سسکیوں کے درمیان سرگوشی ابھری۔

’’واپسی پر؟‘‘ لہجہ محبت پاش تھا۔’’ہاں‘ محبت کا‘ شادی کا یا پیار کا‘ جو سمجھو‘ یہ تحفہ ابھی لے لو۔جانتی ہو کیا ہے؟‘‘

’’کیا ہے؟‘‘

’’یہ وہ قیمتی طلائی ہار ہے جس کے لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ صرف اس لڑکی کو دوں گا جسے عمر بھر کے لیے اپناؤں گا۔‘‘

’’سچ‘ تم مجھے اپناؤ گے نا؟‘‘

’’ہاں‘ خاندانی ہار ہرلڑکی کو تو نہیں دیا جاتا نا۔‘‘

پھر اندھیرا کم ہونے سے قبل بچے کھچے ستاروں کی دھندلی دھندلی روشنی میں وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔دونوں میں سے کسی کو بھی علم نہ تھا کہ دوسرے کے دل میں کیا ہے؟ایک جانب اطمینان تھا‘ طوفان گزر جانے کے بعد کا سکون تھا‘ سفر کی تیاری اور درخشاں مستقبل کا تصور تھا اور دوسری جانب اضطراب تھا‘ کچھ کھو دینے کی گھبراہٹ‘ جدائی کا غم اور بچھڑ جانے کا احساس تھا‘ مستقبل کے لیے امید نہیں بلکہ التجا تھی‘ کھو دینے کے بعد حاصل کرنے کی بے چینی تھی‘ خوف تھا‘ چاہت تھی۔

•......•......•......•

اس واقعے کے چند یوم بعد دوپہر کا وقت تھا‘ دھوپ جھلسائے دے رہی تھی‘ لُو کے جھکڑ چل رہے تھے اور پرند تک گرمی سے بچنے کے لیے گھونسلوں میں دبکے ہوئے تھے لیکن دونوں شہ سوار گفتگو کرتے ہوئے اس طرح مصروفِ سفر تھے جیسے سفر کی تھکان سے قبل ہی انہوں نے منزل پالی ہو۔ فضا ان کے قہقہوں سے گونج رہی تھی۔زان دوسرے گھوڑے سوار کے نزدیک گھوڑا لاتے ہوئے بولا۔

’’باصر‘ بس سمجھو کہ ہماری منزل چند گام ہی رہ گئی ہے۔‘‘

’’یقین کرو‘ میرے دوست‘ تم ساتھ ہو تو منزل کی طرف جانا پڑ رہا ہے ورنہ منزل تو خود چل کے آتی ہے۔‘‘ باصر نے کہا۔

’’تمہاری خوش نصیبی سے ہمیں کب انکار ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنا بڑا مطلق العنان سردار تمہیں یہ اسامی کیوں دیتا؟ نہ جانے اس نے تم

میں کیا دیکھا ہے؟ تمہارا حسن یا صلاحیت یا ذہانت؟''

''نہیں' اس نے یہی دیکھا ہے کہ میں شکار خوب کھیلتا ہوں۔'' باصر نے فخر سے کہا۔''آج تک جال ڈالنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ہاں' اس بار ذرا سی دِقت ضرور پیش آئی۔''

''وہ کیا؟'' زان نے اس کے خوشی سے چمکتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

''دراصل وہ تھی بھی بہت خوب صورت اور لگتا تھا' صرف بیوی بننا چاہتی ہے۔ کئی ہفتے شیشے میں اتارنے کے لیے ضائع کردینے پڑے' تب اسے محبت کا یقین دلا سکا اور پھر ایک خاص ہار کا انتظام بھی کرنا پڑا جس کے بعد ہی اسے یقین آیا کہ......''

''وہ تمہارا خاندانی ہار ہے جو تم خاص لڑکی کو ہی دو گے اور وہ لڑکی وہی ہے؟'' زان نے قہقہہ لگاتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''یہ تمہاری پرانی عادت ہے' بھلا بتاؤ تو کتنے ہار اور کتنی انگوٹھیاں خرید چکے ہو؟''

''لڑکیوں کی تعداد نہیں' ہار اور انگوٹھیوں کی تعداد دریافت کر رہے ہو؟'' باصر نے لطف لیتے ہوئے کہا۔''بات دراصل یہ ہے کہ ہم لڑکوں کی بھی مشکل ہے' جس لڑکی پر محبت کی نظر ڈالو' وہی امیدیں وابستہ کرلیتی ہے' اپنے دل میں بٹھا کر پوجنا چاہتی ہے اور تم تو جانتے ہو کہ ہمارے پاس دل میں بیٹھنے کے لیے وقت ہی کہاں ہے؟ ارے بھئی' کچھ دیر قیام کرو' مزہ لو' تھکن اتارو اور سفر پھر سے شروع کردو لیکن لڑکیاں اس اصول کی پابندی نہیں کرتیں' جسے دیکھو' سفر تمام کردینے کو نظر آتی ہے۔''

''لیکن اب تمہیں اپنے لیے نہیں' اپنے مالک کے لیے انتظام کرنا ہے۔'' زان نے کہا۔''وہ شاید تم سے زیادہ ضرورت مند ہے جبھی تو تمہیں اتنے بڑے مشاہرے پر رکھ لیا۔''

''ہاں' یہ نوکری بڑی ٹھاٹ دار ہے۔'' باصر نے جواب دیا۔''لیکن دوست' یوں نگری نگری پھر کر مال ڈھونڈنا بھی تو آسان نہیں ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے' کیا یہ سب اتنا ہی سہل ہے جتنا وہ سمجھتے ہیں؟''

''نہیں' یہ کام مشکل ہوگا پھر بھی اس پر تم مبارک باد کے مستحق ہو۔''

''جو تم نے مجھے ابھی تک نہیں دی۔'' باصر نے مذاق کیا اور دونوں دوست کھلکھلا کر ہنس دیئے پھر زان نے کہا۔

''دراصل میں نے سوچا' تمہیں مبارک باد کل ہی دوں گا' آج تو تمہاری پہلی حاضری ہے نا۔''

''ہاں' امیر کے سامنے پہلی بار حاضر ہونا ہے اور اتنی بڑی محفل میں جانے کا یہ پہلا اتفاق ہے۔ اس سے قبل میں نے انہیں تو دیکھا ہے' ان کی محفل کو نہیں۔'' باصر نے کہا۔

''بس تو آج اسے بھی دیکھ لو تاکہ تمہیں اندازہ ہو کہ کسی علاقے کے مطلق العنان سردار کی محفل کیسی ہوتی ہے؟ جو ایک بار دیکھ لیتا ہے' مدتوں اس کی لذت فراموش نہیں کرسکتا۔'' زان بولا۔

''تو پھر ذرا جلد چلو' ایسا نہ ہو کہ ہمیں دیر ہوجائے۔'' باصر نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔

دونوں دوست تیز تیز سفر کرنے لگے۔ فضا میں دور دور تک ٹاپوں کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔

•......•......•......•

''خوش ماہ! اب تو وہ طویل تر سفر طے کرکے تیرے علاقے سے بہت دور جا چکا ہوگا۔'' خیزران نے اپنی سہیلی خوش ماہ کے مرجھائے ہوئے حسین چہرے کو دیکھا۔''تو پندرہ دن سے خواہ مخواہ اس جگہ صبح و شام آکر اس کا انتظار کرتی ہے۔ خود ہی بتا' بھلا اب وہ کیوں آئے گا؟ جو کچھ تو نے بتایا ہے' اس کے بعد اسے شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیا تو نہیں جانتی کہ مرد کس لڑکی سے شادی کرنا پسند کرتا ہے؟ اس سے جو شادی کے بغیر اس منہ زور گھوڑے کو گھاس نہ ڈالے اور تو......تو نے تو کچھ بھی باقی نہیں رکھا۔'' یہ کہتے کہتے خیزران کی آواز بھرا گئی اور خوش ماہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس وقت دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے وہ بری طرح سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کا جسم آہستہ آہستہ کانپ رہا تھا۔ بال منتشر' چہرہ بے رونق' وہ سرتاپا اجڑی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ خیزران چپ چاپ اس پر نظریں جمائے اسے روتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے وہ اسے دل کا غبار نکل جانے کا موقع دے رہی تھی یا اس کے بارے میں سوچ رہی تھی؟ وہ دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں' شاید یکجائی تھی یا حالات کی یکسانیت کہ ان دونوں میں دوستی اور بہناپے سے بڑھ کر والہانہ پن تھا۔ ان کی کوئی بات بھی ایک دوسرے سے چھپی نہ تھی۔

خیزران غریب والدین کی بیٹی تھی اور کم عمری میں ہی زندگی کے بہت سرد و گرم دور دیکھ چکی تھی لہٰذا عمر کا فرق بہت کم ہونے کے باوجود تجربے اور علم کا فرق بہت تھا۔ مستزاد یہ کہ خوب صورتی سے محرومی نے اسے غور و فکر کرنے کا عادی بنا دیا تھا۔ اسے ہر مرد ہی حسن کا شیدائی نظر آتا۔ وہ سوچتی کہ خوب صورتی اور دولت مندی کی کمی ہی تو ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی چاہنے والا تو کیا آتا' چاہت طلب کرنے والا بھی نہیں آیا۔ ہاں' شوہر بننے کی تمنا لے کر آیا بھی تو بوڑھا قرض خواہ جو دو بیویوں کا خاوند اور چھے بچوں کا باپ تھا اور جانتا تھا کہ خیزران کا باپ اپنا سب کچھ دے کر اس کا قرض ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ وہ اس سب کچھ یعنی گھربار اور مال و اسباب کی بجائے ایک جوان بیوی چاہتا تھا۔ خیزران نے اس بات کو بھی ایک تجربہ سمجھا' اس کے والدین نے گھر بیچ کر بوڑھے قرض خواہ کا قرض ادا کردیا تو وہ ان کے ساتھ جھونپڑی میں آ گئی۔ اس نے شادی اور محبت کا تصور ہی ذہن سے جھٹک دیا لیکن ان حالات نے اس کے دل کو محبت سے بھر دیا اور یہی محبت اسے خوش ماہ کے قریب لے آئی تھی جو بے حد خوب صورت اور معصوم تھی۔ ماں باپ کی محبت سے محروم' ماموں اور سخت گیر ممانی کے رحم و کرم پر زندگی گزارنے والی خوش ماہ ظاہرداری کو بھی محبت سمجھ لیتی تھی اور اس کی اسی معصومیت سے فائدہ اٹھا کر کوئی اس کا سب کچھ لوٹ کر لے گیا تھا مگر کب اور کیسے؟ اس کی خبر خیزران کو بھی نہ تھی' بس اپنے گلے کا قیمتی ہار دکھاتے ہوئے خوش ماہ نے کہا تھا کہ اس کا محبوب چند دن کے بعد آنے والا ہے پھر اس کی شادی ہوجائے گی لیکن چند دن بعد واپس آنے والے کو ہفتوں گزر گئے تھے۔ خوش ماہ صبح' شام اور رات کو اس جگہ کا طواف کر رہی تھی۔

خیزران دکھ اور حسرت سے دیکھتے ہوئے سوچوں میں گم تھی اور خوش ماہ دیر تک رونے کے بعد اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن لگتا تھا کہ اس کے اندر ایک طوفان اٹھ رہا ہے جس پر کوئی بند نہیں باندھا جاسکتا' کوئی روک نہیں

لگائی جاسکتی۔اس کا نتیجہ بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے' شاید خیزران کوئی سوال کرتی' اس کی اس عجیب وغریب محبت کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی' جانے والے کے بارے میں معلومات فراہم کر کے اس کے دل کو مزید ہلکا کرنے کا موقع دیتی کہ خوش ماہ نے ٹوٹے ہوئے لہجے اور دل میں اتر جانے والی آواز میں کہا۔

''خیزران! میں برباد ہوگئی ہوں' لٹ گئی ہوں' مجھے تو یہ احساس بھی نہیں کہ مجھ پر کیا گزرنے والی ہے لیکن......''

خوش ماہ کو اپنی بات مکمل کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑی کیوں کہ اندر سے اٹھنے والی ابکائی نے وہ کام کردیا جس کے اظہار کے لیے اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔خیزران پاگلوں کی طرح اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔اس بار فضا میں خوش ماہ کی ہی نہیں' خیزران کی سسکیاں بھی گھلی ہوئی تھیں۔دور دور سکوت طاری تھا' کہیں کہیں مزدور پیشہ لوگ دن بھر محنت کے بعد اپنا کام ختم کر کے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اور خیزران سوچ رہی تھی کہ یہ تاریکی' یہ اندھیرا خوش ماہ کے مقدر کی سیاہی سے بہت کم ہے۔خوش ماہ ایک نامعلوم آدمی کے بچے کی ماں بننے والی تھی' وہ آدمی جو ایک بار محبت کی نشانی یا عصمت کی قیمت کے طور پر ادا کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا چکا تھا اور وہ خود اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔اس کی قسمت کا اندھیرا لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

....

رات کا وقت تھا لیکن خطۂ ارض کے مکینوں نے اس کی تاریکی کاٹنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ہر طرف چراغاں کا سماں تھا۔یہ روشنی شب کی رعنائیوں میں اضافہ کررہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کائنات کا ہر ذرہ ہمہ تن نگاہ بن کر اس حسین رات کا نظارہ کررہا ہے۔

ان دنوں کسکر کا تمام علاقہ نرسی کے زیر حکومت تھا اور چونکہ نرسی فارس کے کسریٰ کا خالہ زاد بھائی تھا لہٰذا اسے دیگر مراعات کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ کرنے کی اجازت تھی۔اس کی زندگی کے رنگ ڈھنگ کسریٰ سے ملتے جلتے تھے بلکہ وہ خود ایک طرح سے مطلق العنان سردار کی حیثیت سے حکومت کررہا تھا۔اس وقت اس کے محل کا ایک طویل وعریض کمرا بقعۂ نور بنا ہوا تھا اور دور دور تک آہ اور واہ کی آوازیں غمازی کررہی تھیں کہ یہاں محفل رقص وسرور گرم ہے۔نرسی اپنے نئے اور پرانے مصاحبوں اور خوشامدیوں کے ساتھ رقاصاؤں کی گلے بازیوں میں ڈوبتے ہوئے جام پر جام چڑھا رہا تھا۔چھم چھم کی ہر آواز اسے اپنے دل پر لگتی محسوس ہوتی۔وہ داد دیتا اور چاپلوس خوشامدی اس کی بات بڑھاتے۔یہ روزانہ کا معمول تھا۔اس وقت بھی حاکم' کسکر کی فوج کا سپہ سالار جالینوس اور نرسی کا منہ چڑھا مصاحب بوران اس کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ان دو کے علاوہ محفل میں اور بھی بہت سے لوگ تھے جو سردار نرسی کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اس کی خوشنودی کے لیے مصروف عمل رہتے تھے۔ دیر تک رقص ونغمہ سے دل بہلانے کے بعد نرسی نے اردگرد دیکھا اور جالینوس سے بولا۔

''جالینوس' کل تم نے جس نوجوان کا تذکرہ کیا تھا' کیا وہ پہنچ گیا ہے؟''

''عالی جاہ' میں نے باصر کا ذکر کیا تھا اور وہ خدمت میں موجود ہے۔جناب کو یاد نہیں رہا کہ جناب نے خود ہی اسے اس محفل میں شریک ہونے کی اجازت دی تھی۔''

نرسی نے شراب کے نشے میں چور نظریں اٹھائیں۔واقعی نشے میں ہوش کی اور ہوش میں نشے کی باتیں یاد رکھنا اس کی عادت نہ تھی۔اس نے دیکھا' سامنے ایک خوش شکل جوان اسے دیکھ رہا تھا۔اس کی جانب نظر کی تو وہ سجدے کی حد تک جھک گیا۔نرسی نے کہا۔''تمہارا ہی نام باصر ہے؟''

''جناب نے صحیح نام یاد رکھ کر غلام کو عزت بخشی ہے۔''باصر نے ادب سے کہا۔

''اپنا کام جانتے ہو؟''نرسی نے دریافت کیا۔

''جناب' غلام خوب جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔''

''تو پھر جلدی کرو اور یاد رکھنا' ہر بار نیا مال ہی آنا چاہیے' اس کے لیے تم جس قدر طلب کرو گے' مل جائے گا۔''

''آپ غلام کو وفادار اور چاق و چوبند پائیں گے عالی جاہ......''

....

اس محفل سے واپس جاتے ہوئے باصر' زان سے کہہ رہا تھا۔

''زان' میرے دوست' دولت ہو' جوانی ہو تو پھر انسان اسی طرح زندگی گزارے جس طرح سردار نرسی گزار رہے ہیں۔''

''اس زندگی سے متاثر ہو رہے ہو تو فارس کے کسریٰ کی محفلیں دیکھ کر کیا کرو گے؟''زان نے کہا۔''سنا ہے' وہاں تو ملک بھر کا حسن جمع رہتا ہے۔''

''یہی تو کہہ رہا ہوں کہ زندگی زندوں کی طرح گزارنی چاہیے۔''باصر نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

''تمہیں تو کل سے ہی یہ مزہ شروع کردینا ہے۔''زان نے پوچھا۔''کوئی دیکھی؟''

''ہاں' نشیبی علاقے میں ایک دیکھی ہے اور اس کے والدین سے سودا بھی کیا ہے۔آج ہی اسے حاضر کرنا ہے' سردار کا یہی حکم ہے۔''

نوکری کا پہلا دن اور یہ پہلا تجربہ اس کے لیے بڑا عجیب تھا' منتخب علاقے کی ایک حسین لڑکی کا سودا کرتے وقت اس نے خاص خیال رکھا۔ اس دن لڑکی پر اچانک نظر پڑی تو اس نے گھوڑا پیچھے ڈال دیا۔وہ لڑکی اپنا کونپل سا وجود لیے آگے بھاگتی رہی اور ایک تنگ گلی میں روپوش ہوگئی۔باصر گھوڑے سے اترا اور ایک راہ گیر سے بولا۔''یہ لڑکی کون ہے اور کس کی ہے؟''

راہ گیر نے اس کی شان وشوکت' گھوڑے اور لباس سے اندازہ کرلیا کہ رئیس آدمی ہے۔ لجاجت سے بولا۔''جناب' یہ غریب مہرجان کی بیٹی ہے جسے بیماری اور مفلسی نے کہیں کا نہ رکھا لیکن جناب' اس لڑکی نے کیا کیا ہے؟ جناب سے کوئی گستاخی کی ہے؟''

''نہیں......''باصر نے کہا۔''اس نے کچھ نہیں کیا لیکن ہم اس کے باپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''آیئے' میں آپ کو مہرجان تک پہنچا دوں۔''راہ گیر اس کے ساتھ ساتھ چلنے کو عزت تصور کررہا تھا لیکن اس راہ گیر سے زیادہ اس گھرانے نے اس کی آمد کو عزت محسوس کیا۔باصر گفتگو میں ماہر تھا۔سودا طے ہونے میں بہت دیر نہیں لگی اور اس دن عمر میں پہلی بار اسے خود تسلیم کرلینا پڑا کہ حسن سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہے جو عاشق مزاج لوگوں کو جیت لیتی ہے اور یہ چیز

ہے، دولت، پیسا، کل تک وہ حسینوں کو اپنے لیے پھانستا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی اس کا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ وہ انہیں ملائم آواز میں مخاطب کرتا اور الفاظ کا سہارا لے کر ان کے دل میں اتر جاتا تھا پھر جب تک مطلب حاصل نہ کر لیتا، اس کا اضطراب اور بے چینی کم نہ ہوتی لیکن آج نہ کوئی بے چینی تھی نہ دل دھڑکا نہ اس نے پھانسنے والے انداز سے اسے مخاطب کیا بلکہ تاریکی پھیل جانے کے بعد طویل راستہ طے کر کے وہ اسے نرسی کی تنہائیوں تک لے آیا تھا اور اسے کچھ بھی نہ ہوا تھا کیوں کہ اب وہ ''جوہری'' نہیں ''دلال'' تھا جو حسن پرست نہیں، دولت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اشرفیوں سے بھری تھیلی لیے جب وہ پلٹ رہا تھا تو نرسی کے خاص کمرے سے ایک معصوم لڑکی کے سسکنے، چلانے اور شور مچانے کی آواز اس کے جذبات کو چھو بھی نہ سکی تھی کیوں کہ اس وقت اس کے ہاتھ اشرفیوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنی حیثیت کا اندازہ کر رہے تھے، حیثیت جو ایک دم سے ہی بڑھ گئی تھی۔ اب وہ دل پھینک، خوب صورت عاشق مزاج جوان نہیں بلکہ کسکر کے سردار نرسی کا معزز مصاحب تھا جسے ہر وقت سردار نرسی کے سامنے حاضر ہونے کی اجازت تھی۔

باصر کے سفر طویل ہوتے گئے، لڑکیاں لائی جاتی رہیں، اشرفیوں کی تھیلیوں میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ کسکر کے معززین میں جگہ پاتا گیا۔ دولت، قلعہ نما مکان، متعدد خدمت گار، وسیع حلقہ احباب، معزز گھرانے کی خوب صورت بیوی اور اولاد، یہ سب نعمتیں عزت داروں کو ہی نصیب ہوتی ہیں جو اسے نصیب تھیں اور جن پر وہ اکثر فخر کیا کرتا تھا۔

اس وقت بھی سفر کا لباس پہنے وہ اپنی بیوی سے محو گفتگو تھا جو اکثر اس سے ان طویل سفروں کے بارے میں دریافت کرتی تھی، تب وہ ٹال جاتا تھا۔

''فیروزہ، تم سے کہا نا کہ بس چند یوم کے لیے جانا ہے، کہاں اور کیوں؟ ان سوالوں کے جواب کوئی نہیں ہوتے۔''

''بھلا اس سوال کا جواب کیسے نہیں ہے کہ آپ کہاں جاتے ہیں؟''

''کسکر کے کام سے باہر جاتا ہوں۔'' باصر نے اطمینان سے کہا۔ ''تم میرے جانے سے پریشان کیوں ہو جاتی ہو؟''

''ہر بیوی پریشان ہو سکتی ہے۔'' فیروزہ بولی۔ ''جبکہ شوہر کبھی یہ وضاحت بھی نہ کرے کہ آخر وہ کون سا کاروبار ہے جو اسے مسلسل سفر میں رکھتا ہے؟''

''فیروزہ......!'' باصر محبت سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولا۔ ''تمہارا شوہر کسکر کے مطلق العنان حاکم کا خاص آدمی ہے جو اپنے کام کی سب سے زیادہ قیمت لیتا ہے۔ جب اس قدر دولت طلب کرتا ہے تو مالک اسے کبھی بھی، کہیں بھی بھیج سکتا ہے۔ تمہیں عیش کے لیے دولت، آرام کے لیے لونڈی، غلام، قیمتی ملبوسات وزیورات اور رہنے کے لیے بہترین گھر چاہیے نا، کیا باصر نے یہ سب کچھ تمہیں نہیں دیا؟''

اس سوال کا جواب فیروزہ دیتی لیکن اسی وقت چند سالہ ارمیدہ نے ان دونوں کی توجہ اپنے طرف مبذول کرالی۔ اس میں باصر اور فیروزہ دونوں کا حسن سمٹ آیا تھا اور گفتگو کا انداز بھی دل موہ لینے والا تھا۔ وہ دوڑ کر آتے ہوئے باصر کی ٹانگوں سے چمٹ گئی اور اس کا سفری لباس دیکھ کر بولی۔ ''باباجان! آپ آج پھر جا رہے ہیں؟''

''ہاں بیٹی......!'' باصر نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔ ''آج ہمیں بہت ضروری کام ہے لیکن ہم رات ہونے سے پہلے ہی لوٹ آئیں گے۔''

''وعدہ ہے نا؟'' ارمیدہ نے حسب عادت اپنی بات پکی کرنا چاہی، تب باصر ہنس دیا، اس نے کہا۔

''ہاں بیٹی......! وعدہ ہے، ہم شام ہونے تک واپس آجائیں گے۔ اب تم اپنی اماں جان کو بھی سمجھا دو، وہ ہماری بات نہیں سمجھتیں۔''

''آپ سمجھانا ہی نہیں چاہتے۔'' فیروزہ نے گلہ کیا۔ ''شاید آپ کے خیال میں عورت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مرد کے ذاتی معاملات میں مداخلت کرے؟''

''تم ذاتی معاملات کی بات کر رہی ہو، ہم نے تو تمہیں اپنے تمام حقوق میں داخل کر لیا۔'' باصر نے مذاق میں بات اڑانی چاہی۔ ''ذاتی اور کائناتی تمام معاملات تمہاری منشا سے ہی طے پاتے ہیں۔''

ابھی وہ بیوی اور بیٹی سے باتوں میں مصروف ہی تھا کہ غلام نے اطلاع دی۔ ''جناب، آپ کی سواری تیار ہے، تشریف لے چلیے۔''

باصر نے گھر والوں سے رخصت لی، ارمیدہ کو پیار کیا، فیروزہ کو محبت سے الوداع کہا اور روانہ ہو گیا۔

•......•......•

اس بار جو دریا میں طغیانی آئی تو متعدد نشیبی علاقوں کو برباد کر گئی، ہزاروں انسان اور مویشی طوفان کی نذر ہو گئے اور جو بچ سکے، وہ بھی گندگی میں اضافہ کرنے کے لیے بالائی حصے میں آگئے تھے اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے بھیک مانگ رہے تھے یا چوریاں کر رہے تھے جس کے سبب کسکر کے معززین بڑا اضطراب اور بے چینی محسوس کر رہے تھے لہٰذا سردار نرسی کا حکم تھا کہ ان مفلس اور قلاش مصیبت زدہ لوگوں کو مناسب جگہ ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل کے لیے باصر اور زان ان لوگوں کو دیکھنے جا رہے تھے لیکن باصر ہمیشہ کے انداز سے مختلف انداز لیے سوچوں میں گم گھوڑا بڑھائے جا رہا تھا۔ جب کافی دیر ہو گئی تو زان نے اس کی طرف توجہ دی، اسے محسوس ہوا کہ چند برس کے اندر اندر باصر میں بہت بڑا فرق آچکا ہے۔ کہاں وہ تیز طرار، چاق و چوبند اور ہر دم مستعد رہنے والا جوان اور کہاں اب یہ سنجیدگی اور رخ پر سوچوں کی شکنیں۔ چند لمحے دیکھنے کے بعد وہ بولا۔ ''کیا سوچ رہے ہو دوست؟''

''ہوں......'' باصر نے کچھ اس طرح چونک کر دیکھا جیسے سوال سننے کے باوجود سمجھ نہ سکا ہو، تب زان نے پھر کہا۔

''ایسا لگتا ہے کہ یہاں سے بہت دور ہو، خود گھوڑے پر آگے جا رہے ہو مگر تصور پیچھے کی طرف دوڑ رہا ہے۔ کیا گھر کی یاد ستا رہی ہے یا اس سفر پر جاتے ہوئے بھی کسی اور سفر کا پروگرام بنا رہے ہو؟''

اس بار باصر نے بڑے غور سے یہ بات سنی اور گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔

''حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت نہ میں اس سفر کے بارے میں سوچ رہا ہوں نہ کسی دوسرے سفر کے لیے اور نہ ہی گھر کی یاد ستا رہی ہے بلکہ لگتا ہے، کچھ تھک گیا ہوں۔''

''کیوں؟ ابھی سے تھک جانے کا کیا سوال ہے؟ ابھی تو تمہیں بہت کچھ کرنا ہے۔''

''دل چاہتا ہے' کچھ بھی نہ کروں۔'' باصر نے واقعی تھکے ہوئے انداز سے کہا۔

''یہ ناممکن ہے۔'' زان نے گھوڑا نزدیک لاتے ہوئے قدرے سرگوشی کی۔ ''تم جانتے ہو کہ سردار نرسی کو تم پر کس قدر اعتماد ہے' اتنا کہ بوران اور جالینوس پر بھی نہیں' ان دونوں کو انہی کے شعبے تک محدود رکھا ہوا ہے اور تمہیں بیک وقت متعدد امور پر مامور کردیتے ہیں۔ کیا تم اسی لیے تھکن محسوس کرنے لگے ہو؟''

''نہیں......'' باصر نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''بس کبھی کبھی طبیعت پر اضمحلال کی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔''

''کیا محنت زیادہ اور صلہ کم ہے؟'' زان نے کریدنا چاہا۔

اس جملے پر باصر کو ہنسی آ گئی' اس نے کہا۔ ''تم خود کیا سمجھتے ہو؟''

''میں سمجھتا ہوں' جتنی دولت تم نے ان چند برسوں میں کمائی ہے' بڑے سے بڑا کاروبار بھی کرتے تو حاصل نہ کرسکتے مستزاد یہ کہ سردار نرسی کا اعتماد اور چاہت تمہیں شہنشاہ تک لے جاسکتی ہے اور ایک بار شہنشاہ کے دربار سے وابستہ ہوجانے کے معنی جانتے ہو؟''

''سب جانتا ہوں۔'' باصر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''دراصل اب میں مسلسل سفر سے گھبرا گیا ہوں۔''

''ہاں' یہ بات درست ہے۔'' زان نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔ ''ان سفروں سے نجات اور اس ٹھاٹ باٹ کو قائم رکھنے کی اب ایک ہی صورت ہے۔''

''وہ کیا......؟'' باصر نے اسے دیکھا۔

''کوئی تگڑا مال نرسی کے قدموں میں ڈال کر رخصت لے لو ورنہ اپنی جگہ کوئی اپنے ہی جیسا کامیاب شکاری ان کی خدمت پر مامور کردو۔''

یہ مشورہ سن کر باصر کو ہنسی آ گئی۔ بات معقول اور دل کو لگنے والی تھی لہٰذا اس نے خوش دلی سے کہا۔

''میں دونوں باتیں پوری کرنے کی کوشش کروں گا یعنی انہیں ان کا من پسند مال بھی اور قابل اعتماد خدمت گار بھی فراہم کردوں گا۔''

''تب سردار نرسی تم سے خوش ہوکر منہ مانگا انعام دیں گے' اچھا ہی ہے' بہت سی دولت سمیٹ لو اور دل مطمئن ہوجائے تو اسے مطمئن کردو۔''

اسی وقت ان دونوں کی منزل قریب آ گئی اور باصر نے اس مشورے کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا' شاید وہ عمل کرنے کی سوچ رہا تھا یا سامنے اس پرانی کھنڈر نما عمارت کو دیکھ رہا تھا جہاں ان مفلس لوگوں کا ہجوم تھا جنہیں غربت کی کہانی بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ باصر اور زان دونوں گھوڑوں سے اترے اور ان کی جانب بڑھ گئے۔ سیلاب زدہ لوگوں میں انہیں دیکھتے ہی ہلچل سی مچ گئی تھی۔ کوئی دور سے بیٹھا للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا' کوئی ان کے قدموں سے لپٹ کر بھیک مانگ رہا تھا اور کچھ نرسی کے ان معزز سرداروں کی آمد کو اپنے لیے باعث نجات تصور کرکے رو رہے تھے۔ الغرض ہر نفس عبرت کی تصویر بنا ہوا بربادی کا نمونہ پیش کررہا تھا۔ زان نے سرگوشی کرتے ہوئے اشارہ کیا۔

''باصر' اس بچی کو دیکھو' کس قدر حسین ہے۔''

باصر نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا تو بس

دیکھتا ہی رہ گیا۔ لمحے بھر کو اسے محسوس ہوا کہ ان کھنڈرات میں بیٹھنے والی مصیبت زدہ بچی نہیں بلکہ حسن کی دیوی ہے' یہ سنہرے بال' سفید رنگت اور گلابی رخسار' اس نے پہلے کہیں دیکھے ہیں لیکن کہاں؟ نہ اسے یاد تھا اور نہ یاد کرنے کا وقت' بس لمحے بھر کے لیے اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا اور قدم اسی جانب اٹھ گئے جہاں اس بچی کے ساتھ ایک عام سی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ باصر نے پوچھا۔ ''یہ بچی کس کی ہے؟''

عورت نے اس جانب دیکھا۔ بچی کو اپنے نزدیک کرکے چادر سے چھپاتے ہوئے بولی۔ ''جناب' یہ بچی میری ہے۔''

اس جواب پر باصر حسرت زدہ سا رہ گیا۔ اس نے تعجب سے زان کو دیکھا جس کے اپنے رخ پر استعجاب تھا' شاید دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے کہ اتنی حسین بیٹی کی ماں یہ عام سے نقش و نگار کی عورت نہیں ہوسکتی مگر وہ دونوں کے سامنے بیٹھی اپنے تعلق کا اظہار کررہی تھیں تب اپنی حیرانی کو چھپاتے ہوئے باصر نے کہا۔ ''اس بچی کا نام کیا ہے؟''

''مراجل۔'' عورت نے جواب دیا۔

''اس کا باپ؟'' وہ بولا۔

''شاید طوفان کی نذر ہوگیا......'' عورت نے جواب دیا۔

چند لمحے باصر مضطرب سا دیکھتا رہا۔ عورت کی آنکھوں میں غم کم اور صبر کرلینے کا انداز زیادہ تھا جیسے طوفان کی نذر ہوجانے والے اور بہت سے لوگوں پر صبر کیا جاچکا تھا۔ چند ثانیے سکوت کی نذر ہوگئے پھر اس نے دوسرا سوال کیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''خیزران۔'' عورت نے جواب دیا۔

''اب تم کیا کرنا چاہتی ہو؟''

''کوئی بھی کام۔'' خیزران نے کہا۔ ''اب میں صرف اسے پرورش کرنا چاہتی ہوں' اس کے سوا میرا کوئی نہیں اور میرے سوا اس کا کوئی نہیں ہے۔''

اس وقت باصر سب کو نظر انداز کرکے اسی کی طرف متوجہ تھا اور اس کا یہ انداز باقی سب کو متوجہ کررہا تھا۔ کچھ لوگ اپنی جگہ سے اٹھ اٹھ کر ادھر آنے لگے تھے جس کے سبب یہاں ہجوم اکٹھا ہورہا تھا' بھلا سردار باصر اس عورت سے اتنی طویل گفتگو کیوں کررہا ہے؟ باصر نے ان سب کو ٹالنے کے لیے معاملہ جلد طے کرنا چاہا اور بولا۔

''خیزران بی بی' اگر تم پسند کرو تو میرے

جلوس روکنے کا عجیب طریقہ

ہم نے سکندر مرزا کے ساتھ آج شب کھانا کھایا۔ وہ ایک دلکش شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ سرحد میں ایک بہت کامیاب پولیٹیکل افسر رہے تھے اور گورنر سرحد سر جارج کنگھم ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ سرحد کی سیاست پر چھائے ہوئے تھے۔ پٹھان ان سے محبت کرتے تھے۔ جب وہ پشاور میں ڈپٹی کمشنر تھے تو سرخ پوشوں نے جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔ سکندر مرزا کو ہدایت کی گئی کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ انہوں نے جلوس روکنے کا ایک عجیب طریقہ واضح کیا۔ جلوس نکالنے والوں کے ناشتے میں انہوں نے کوئی سہل شے شامل کرادی۔ جیسے ہی جلوس روانہ ہوا' اس میں شرکت کرنے والوں کو رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی اور آہستہ آہستہ جلوس منتشر ہوگیا۔

ساتھ چلو، تمہیں گھر کے کام کاج کرنے ہوں گے اور یہ بچی تمہارے ساتھ رہے گی۔ تم اسے اطمینان سے پرورش کرسکو گی۔''

خیزران نے حیران ہوکر دیکھا۔ اس کے چہرے سے ممنونیت اور آنکھوں میں اشک چھلک رہے تھے۔ شاید مسلسل مصائب کے بعد وہ اچھی زندگی سے مایوس ہوگئی تھی۔ اس نے اپنے سامنے کھڑے اس سردار کو احسان مندی سے دیکھا جس کے چہرے اور آواز میں شفقت ہی شفقت تھی اور جس کی بات اسے زندگی کا پیغام دے رہی تھی۔ لمحہ بھر اپنی بیٹی کو سینے سے چمٹائے وہ اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔

''سردار...... آپ بہت رحم دل ہیں۔''

باصر اپنی تعریف سے ذرا بھی خوش نہ ہوا' یہ جملے تو وہ صبح و شام سنتا تھا۔ اس وقت تو اس کا ذہن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا' ایسی بات جس کی خبر اس کے رازدار ساتھی زان کو بھی نہ تھی۔ چند ثانیے ان سوچوں کی گرفت میں رہ کر وہ پھر اسی دنیا میں لوٹ آیا۔ اس نے دیکھا' خیزران اسے قابل اعتماد انسان سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ چلنے پر راضی تھی اور یہ خبر آن واحد میں ان مصیبت زدہ لوگوں میں مشہور ہوگئی تھی۔ کچھ ان دو ماں بیٹی کو رشک سے دیکھ رہے تھے اور کچھ باصر اور زان کے سامنے ہاتھ پھیلائے گڑگڑا رہے تھے۔ انہوں نے ان سب لوگوں کی ضروریات کے مطابق مدد کی۔ ان میں کھانا اور کپڑے تقسیم کیے گئے۔ باصر دن بھر انہی لوگوں میں مصروف رہا لیکن آج نہ تھکن کا احساس تھا نہ بے زاری بلکہ جب وہ اس علاقے سے لوٹ رہا تھا تو اسے محسوس ہوا کہ ایک دُرِّ نایاب اس کے ساتھ ہے جس کے عوض وہ اپنی آرزوؤں سے زیادہ دولت حاصل کرسکتا ہے مگر ان خیالات کی پردہ پوشی کے لیے وہ زان سے باتیں کرنے لگا۔ کل اسے نئے سفر پر جانا تھا' نئے علاقے کا دورہ کرنا تھا' مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کے لیے نہیں بلکہ تلاش و جستجو کے لیے۔ زان نے کہا۔

''میرے دوست' کل کے سفر کی بات کررہے ہو' آج رات کی بات کیوں نہیں کرتے؟''

''کیا مطلب؟'' باصر نے پیچھے آنے والی گھوڑا گاڑی میں خیزران اور مراجل کو دیکھا جو ان کے گھوڑوں کے عقب میں اپنا سفر طے کرتی ہوئی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ زان نے کہا۔

''اپنی ذہانت پر ناز بھی بہت کرتے ہو لیکن بھول بھی جلد جاتے ہو' کیا بھول گئے کہ آج شب کو جشن ہے۔ سنا ہے' رقاصائیں مدائن سے آئی ہیں۔''

''اوہ...... مجھے یاد آیا لیکن میں بھولا ہوا نہیں تھا بلکہ ایسے رقص اور محفلیں زندگی کا ایک حصہ بن گئی ہیں لہٰذا......''

''اس کا مطلب ہے کہ یادداشت پر اب بھی اصرار ہے؟'' زان نے ہنس کر کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں ہے۔'' باصر بھی ہنس دیا۔ ''یقین کرو' آج تک کوئی بات' کوئی چیز بھول نہیں سکا البتہ خود سے بھلا دوں تو بات دوسری ہے۔ بھُلا دینا ذہانت کی کمی نہیں بلکہ بذات خود ایک صفت ہے۔''

''سنا ہے' جو لوگ کوئی بات نہیں بھلا سکتے' وہ خطرناک حد تک ذہین ہوتے ہیں اور ان کا انجام بھی سب سے نرالا ہوتا ہے یا تو کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیتے ہیں ورنہ پاگل ہوکر مرجاتے ہیں......'' اس جملے پر باصر قہقہہ لگا کر ہنسا اور بولا۔

''میرے دوست' میرا فی الحال مرنے یا پاگل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے البتہ کارنامے تو ہم انجام دیتے ہی رہتے ہیں جو آج انجام دیا ہے' کیا یہ معمولی ہے؟''

''بالکل نہیں۔'' زان نے پیچھے نظر ڈالی۔ غیر معمولی خوب صورت بچی' ماں کی آغوش میں سواری کے جھٹکے لگنے سے سوگئی تھی۔ وہ بولا۔

''تم نے اپنا مستقبل محفوظ کرلیا۔''

اسی لمحے باصر پھر سے کسی سوچ میں گم ہوگیا۔

•......•......•......•

اس شب جب حسب دستور کسکر کا سردار نرسی اپنے خوشامدیوں کے درمیان بیٹھا ہوا رقص و سرود سے دل بہلا رہا تھا۔ باصر اسے دن بھر کے واقعات سناتے ہوئے اپنی کارکردگی کی داد طلب کررہا تھا اور نرسی کی توجہ اس کی طرف تھی۔ ان چند برسوں میں اس نے ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں کلیاں اسے پیش کی تھیں جن کی اب کوئی خبر نہ تھی۔ دوسری بار ایک پھول کو سونگھنا نرسی کی عادت نہ تھی' یہ بات سبھی جانتے تھے۔ اسی کے پیش نظر اسے اردگرد کی لڑکیوں کی خبریں پہنچانے کے لیے پوری ایک جماعت مستعد رہتی تھی اور انہیں حاصل کرنا باصر کا کام تھا جس کے بعد اسے تعریف بھی ملتی اور انعام بھی۔ اس وقت بھی کچھ یہی ماحول تھا۔

''زان...... تیری نظر باصر کی طرح دور تک نہیں جاتی یا تو کچھ حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا؟'' نرسی نے پوچھا۔

اس جملے پر زان جھینپ گیا اور خوشامدی امراء بات بڑھانے کے لیے ہنسنے لگے۔ زان نے کہا۔

''دیکھیے صاحب' سردار جو بھی کہیں لیکن آپ لوگوں کو مذاق اڑانے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

زان کی اس بات پر نرسی بھی ہنس دیا اور بولا۔

''سچ تو یہ ہے کہ تو نے ہمارے لیے کوئی حسینہ تو کیا' ایک خبر تک نہیں مہیا کی لیکن تو ہمیں پھر بھی بہت عزیز ہے۔''

''ذرہ نوازی ہے جناب کی......'' زان نے کہا۔

اسی وقت ایک رقاصہ ناچتے ناچتے بل کھاتی ادھر آئی تو وہ سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے اور نرسی جھومنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے ناچتی ہوئی رقاصہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا' شراب کا نشہ نرسی کو بے خود کرتا تو وہ خلوت اور جلوت کا فرق بھول جاتا تھا' یہی کیفیت اس وقت بھی تھی۔ مصاحب یہ سب منظر دیکھتے ہوئے اپنی عیاش طبیعتوں کو تسکین دے رہے تھے لیکن باصر کا دل آج دن بھر کی تھکن کے بعد آرام کے لیے مچل رہا تھا۔ اسے بے چینی سی محسوس ہورہی تھی مگر وہ صبح تک یہاں حاضر رہنے پر مجبور تھا کیونکہ یہی اس کا پیشہ تھا' یہی نوکری اور یہی اس کی حیثیت تھی۔

•......•......•......•

وقت گزرتا رہا' جشن منائے جاتے رہے اور باصر اپنا 'فرض' ادا کرتا رہا۔ اس کے ہاتھوں ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں لڑکیاں نرسی تک پہنچ چکی تھیں۔ ان میں وہ بھی تھیں جو اپنی خوشی سے آگئی تھیں اور وہ بھی تھیں جنہیں زبردستی سردار تک پہنچایا گیا تھا۔ آج بھی باہر کی اس زندگی اور مصروفیت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن اس کے گھر کے اندر بہت بڑا انقلاب آچکا تھا۔ فیروزہ اس کی مصروفیت کی نوعیت اور طویل سفروں کی وجہ

دریافت کرتے کرتے بڑھاپے کی دہلیز تک پہنچ چکی تھی۔ ارمیدہ ایک خوب صورت اور دل موہ لینے والی دوشیزہ کا روپ دھار چکی تھی اور مراجل کی شخصیت میں وہ حسن اور سحر تھا کہ باصر کبھی کبھی دیکھ کر چونک جاتا' یہ لے پالک لڑکی اسے اپنے دل کی گہرائیوں میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھی' ایسے میں خیزران کی پکار یا کوئی جملہ اسے حقیقت کا احساس دلا دیتا اور اسے یاد آتا کہ مراجل کو کسی خاص مقصد کے لیے پرورش کر رہا ہے۔ دس برس انہی کیفیات کی نذر ہو گئے۔

....

صبح کا وقت تھا' ارمیدہ اور مراجل حسب معمول پائیں باغ میں چہل قدمی کر رہی تھیں۔ یہ باغ بہت خوب صورت اور طویل و عریض تھا۔ صبح اور شام کے وقت یہاں آ کر محسوس ہوتا تھا کہ کائنات نے اپنا تمام حسن اسی گوشے پر نثار کر دیا ہے۔ وہ دونوں یہاں ہوتیں تو زمانے بھر کے موضوع چھڑتے۔ وہ کبھی حوض کے کنارے بیٹھی پاؤں پانی میں ڈالے باتیں کرتیں اور کبھی درختوں کی قطار کے سائے میں سنگ مرمر کی بینچوں پر بیٹھ کر ہنسی مذاق ہوتا لیکن آج چہل قدمی کرتے ہوئے کسی خاص موضوع پر گفتگو کر رہی تھیں۔ ارمیدہ نے کہا۔

''اماں جان کو بوران بتا رہی تھی کہ جشن نوروز کے موقع پر کسریٰ نے دور دراز کے علاقوں سے بھی حسینوں کو طلب کرنے کا حکم دیا ہے اور بہت سے لوگ خوشی خوشی مدائن جانے کی تیاری کر رہے ہیں اور تم تو جانتی ہو کہ بوران برائے نام ہی نوکری کرتی ہے ورنہ دراصل اس کا کام تو خبر رسانی کرنا ہے۔''

''خیر' گھر کی ملازمائیں ہمیشہ خبر اِدھر اُدھر پہنچاتی ہیں لیکن میں تو اس حکم اور اس کی تعمیل کرنے والوں کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔''

مراجل نے ارمیدہ کو دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ ''کیا معززین اتنے گر گئے ہیں کہ کسریٰ کے حکم کی تعمیل میں خوشی محسوس کر رہے ہیں؟''

''نہیں.....'' ارمیدہ نے ناگواری سے کہا۔ ''یہ گرنا ہی نہیں بلکہ پستی کی انتہا ہے کہ دربار سے فیض حاصل کرنے کے لیے اپنی بیٹی کا نذرانہ دیا جائے۔ ان لوگوں میں غیرت نفس کا فقدان ہے۔''

''دراصل یہ ماحول انہوں نے اور ان کے آباؤاجداد نے ابتدا سے ہی دیکھا ہے۔ یہ وہی سردار ہیں جن کے بزرگوں نے ٹیکسوں کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ نذرانے بھی دیئے تھے اور تم جانتی ہو کہ نذرانوں کو ایران بھر میں 'آئین' کہا جاتا ہے جس کے عین مطابق جشن نوروز اور مہرگان کی تقریب کے وقت ہر سردار اپنے ماتحت سے وصول کرتا ہے۔ اس کے انداز مختلف رہے' ایک انداز یہ بھی تھا جس نے سب سے زیادہ فروغ پایا اور کسی طور بدلنے میں نہیں آ رہا۔ تم کیا سمجھتی ہو' کیا مختلف علاقوں کے چھوٹے سردار عیاشی کے مواقع چھوڑ دیتے ہیں؟''

''توبہ.....'' ارمیدہ نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے تمہیں اس دن بتایا تو تھا کہ میں بوران کے ساتھ بازار گئی تو ایک سردار نے دور تک میرا پیچھا کیا نہ جانے کون تھا؟ وہ تو شکر ہے کہ میرے جیسی تین گاڑیاں اور تھیں جن پر پردے تنے ہوئے تھے' جب مختلف سمتوں میں مڑ گئیں' تب وہ اندازہ نہ کر سکا کہ میں کس میں ہوں ورنہ گھر تک گھوڑا دوڑاتا۔''

''تو خوب صورت بھی تو بہت ہے۔''

مراجل نے ازراہ مذاق بات بدلی۔ ''اگر تو بے پردہ ہوتی تو ملک بھر میں چرچا ہو جاتا اور کچھ سردار تمنا کرتے کہ.....''

''ہش.....'' ارمیدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میرے بابا جان کا نام باصر ہے اور تم جانتی ہو' باصر' سردار نرسی کے خاص مصاحب ہیں جن کا کام دور دراز کے سفر کر کے عوام کی حالت کو بہتر بنانا ہے' بھلا وہ یہ کیوں برداشت کریں گے کہ ان کی بیٹی پر کوئی نظر رکھے؟''

''میں نے بابا جان کی بات نہیں کی۔'' مراجل بولی۔ ''میں انہیں تمہاری طرح ہی جانتی ہوں اگرچہ انہوں نے صرف مجھے پرورش کیا ہے لیکن میں انہیں تمہاری طرح ہی چاہتی ہوں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ عام قسم کے وہ سردار جو اپنے حاکموں کو خوش کرنے اور فیض اٹھانے کے لیے گر جاتے ہیں' آخر کیسے ہوتے ہیں؟''

ابھی وہ دونوں مصروف گفتگو ہی تھیں کہ ایک درخت کی آڑ سے باصر نکلا جسے دیکھتے ہی دونوں حیران ہو گئیں پھر مراجل نے اپنے انداز سے سلام کیا اور ارمیدہ بولی۔

''بابا جان! آپ یہاں کب آئے؟''

''ابھی تھوڑی دیر قبل ہی۔'' باصر نے کہا۔ ''میں اس چمن کی حد پار کر کے ادھر آیا تو تم دونوں کی آواز نے متوجہ کر لیا۔ معلوم ہوا کہ ہماری بیٹیاں ہمارا ہی ذکر کر رہی ہیں۔''

اس جملے پر مراجل ہنس دی اور بولی۔ ''ہم تو ہمیشہ آپ ہی کا ذکر کرتے ہیں۔''

''چلو' مقام شکر ہے کہ کوئی تو محبت سے ہمارا ذکر کرتا ہے۔''

باصر نے ہنس کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہی اس کی بیٹیاں نظر آتی تھیں۔ مراجل حیرت سے بولی۔

''کوئی سے کیا مراد ہے آپ کی؟ میرا خیال ہے' آپ تو بہت مقبول سردار ہیں۔'' ''آپ سے سبھی محبت کرتے ہیں اور پھر آپ جس کام پر مامور ہیں' وہ آپ کی مقبولیت کا ضامن ہے یعنی دور دراز کے علاقوں میں جانا اور عوام کے دکھوں کا مداوا کرنا.....''

اس جملے پر لمحے بھر کو باصر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے ان دونوں کی جانب سے رخ موڑ لیا۔ دنیا اسے کیا سمجھتی تھی اور وہ کیا تھا۔ ایک ایسا بے ضمیر آدمی جو اپنے سردار کے لیے لڑکیاں پھانستا اور خریدتا تھا اور اس خدمت کے عوض چند ٹکے حاصل کر لیتا تھا لیکن یہ احساس صرف لمحے بھر کو ہوا پھر سینے کے اندر ہی دفن ہو گیا کیونکہ خادمہ نے سردار زان کے آنے کی خبر دے دی تھی۔

....

اس دن ناشتے پر انواع و اقسام کی اشیاء موجود تھیں لیکن سردار باصر اور سردار زان سرگوشیوں میں گفتگو کرتے ہوئے صرف قہوے پر اکتفا کر رہے تھے اور وہ بھی اس طرح کہ اس کی لذت کا احساس نہ تھا۔ زان کے انداز میں غصہ بھی تھا اور شرمندگی بھی۔ اس نے کہا۔

''باصر' تم میرے برسوں کے دوست اور مجھے بہت عزیز ہو لہٰذا یہ بات میں صرف تمہیں بتا رہا ہوں کہ گزشتہ شب بھری محفل میں سردار نرسی نے جس طرح میری توہین کی ہے' وہ ناقابل برداشت ہے۔''

''ہاں' میں نے سنا ہے لیکن میں موجود نہ تھا' بھلا بات کیا تھی؟'' باصر نے دھیرے سے پوچھا۔

''بات کی ابتدا تو اسی انداز سے ہوئی جس سے وہ ہمیشہ کرتے ہیں کہ زان تو حرام کی کھاتا ہے۔ آج تک کوئی کام نہ کرسکا۔'' زان نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''پھر انہوں نے عجیب بات کی' کہنے لگے...... '' زان کے لہجے میں جھجک ہی نہیں' خفت اور غم و غصے کا انداز تھا' لگتا تھا' وہ اپنی بات پوری کرنے کی ہمت نہیں رکھتا اور کرنا بھی چاہتا ہے۔
باصر نے کہا۔
''تسلی رکھو زان' مجھے پوری بات بتاؤ' شاید میں کچھ کرسکوں۔''
زان نے یہ بات سن کر ممنونیت کے انداز سے اسے دیکھا۔ اپنی پوری طاقت جمع کی اور بولا۔
''سردار نرسی نے کہا' اگر کچھ اور نہیں پیش کرسکے تو اپنی دختر ہی لے آؤ' ہم اسے سب سے زیادہ چاہیں گے۔''
باصر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں قہوے کا پیالہ کانپ کر رہ گیا جسے اس نے دھیرے سے رکھ دیا اور بولا۔ ''کیا نرسی نے یہی کہا ہے؟''
''ہاں......'' زان نے دکھ سے کہا۔ ''اور یہ جملہ سراسر میری توہین ہے۔''
''تمہاری ہی نہیں' یہ ہم سب کی توہین ہے۔'' باصر نے جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے کہا۔ ''نرسی کے دربار سے وابستہ ہو کر عمر بھر کی خدمت کا یہی صلہ ہے کہ اب وہ مصاحبین کی بیٹیوں کے بارے میں بات کرنے لگا ہے؟ اسے خبر کیسے ہوئی کہ تمہاری بھی ایک بیٹی ہے؟''
''مجھے اس سے غرض نہیں کہ اسے خبر کیسے ہوئی' غم یہ ہے کہ نرسی کی نظر مجھ تک پہنچ گئی ہے اس نے کہا نہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ انکار کی صورت میں وہ مجھے اپنی طاقت کے زور پر دبائے گا اور کھلے عام میری تذلیل کرے گا پھر بھی میں اپنی عزت نہ بچا سکوں گا۔''
اب کہنے سننے کو کچھ باقی نہیں رہا تھا البتہ ان کی سوچ کا اظہار چہروں سے ہو رہا تھا جو غم و غصے سے سرخ ہو گئے تھے۔ کبھی کسی خوف کا احساس کر کے وہ پیلے پڑ جاتے اور کبھی اپنی مٹھیاں بھینچ کر اپنے اندرونی جذبات کو دباتے۔ لگتا تھا کہ بڑی مشکل سے خود کو قابو کر رہے ہیں۔ چند منٹ انہی کیفیات کی نذر ہو گئے پھر باصر نے کہا۔
''پچھلے ہفتے تم کسی لڑکی کا تذکرہ کر رہے تھے جسے تم نے بازار میں دیکھا تھا؟''
''ہاں۔'' زان نے ہوش کی دنیا میں آتے ہوئے کہا۔ ''بچ کر نکل گئی۔ غضب کی حسین تھی۔ جب سے تلاش میں ہوں کہ مل جائے تو اسے نرسی کو پیش کردوں۔''
باصر ہنس دیا اور بولا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ تم کسی اور دنیا کے انسان ہو۔ ہاتھ آئی ہوئی لڑکی کو نکال دیا اور اب تلاش کر رہے ہو؟ بھلا اسی وقت ہی کیوں تعاقب نہ کیا اور اس کا ٹھکانا دیکھ لیا؟''
''دراصل وہ جس سواری میں سوار ہوئی' اسی طرح کی دو تین سواریاں اور بھی تھیں اور سب پر پردے تنے ہوئے تھے۔ میں نے تعاقب کیا تو سب مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئیں اور میں فیصلہ نہ کرسکا کہ کس کے پیچھے جاؤں لیکن دوست' وہ لڑکی قیامت تھی۔''
موضوع بدل گیا تو دونوں کے جلتے جذبات پر جیسے چھینٹا پڑ گیا۔ باصر نے کہا۔
''خیر' تم اپنی قیامت کو تلاش کرو' میں تو ان دنوں مدائن جانے کی سوچ رہا ہوں۔''
''مدائن کیوں؟'' زان نے دریافت کیا۔

''مجھے خبر ملی ہے کہ نوروز کے موقع پر لوگ بادشاہ کو نذرانے پیش کر رہے ہیں جن میں خوب ... لونڈیاں اور لڑکیاں بھی شامل ہوں گی۔ میں اپنا نذرانہ کسریٰ کے دربار تک پہنچا کر اور منہ مانگی رقم لے کر بہت دور چلا جانا چاہتا ہوں' نہ جانے اس زندگی سے تھک گیا ہوں یا مسلسل سفر سے۔ جو بھی ہے' اب کسکر سے کہیں اور جاؤں گا۔''

''ہاں......'' زان نے دھیرے سے کہا۔ ''تمہارے پاس نذرانے میں دینے کے لیے بڑی انوکھی شئے ہے۔''

''ہاں' یہ میرا آخری نذرانہ ہوگا پھر یہ سلسلہ ختم۔'' باصر نے جیسے فیصلہ کر دیا۔ ''اور اب مجھے یہ زندگی زیب نہیں دیتی۔ میں چاہتا ہوں کہ میری بیٹی مجھے جو کچھ تصور کرتی ہے' میں اب وہی بن کر دکھاؤں اور یہ تبھی ممکن ہے کہ یہ اندازِ زندگی اور علاقہ چھوڑ دوں۔''

''باصر......'' زان نے لجاجت سے کہا۔ ''میں بھی یہی چاہتا ہوں لیکن مجبور ہوں۔ تم تو کسریٰ کے دربار میں اپنا آخری نذرانہ پیش کر کے یہاں سے جا سکتے ہو لیکن میں پھنس گیا ہوں' تم بتاؤ' میں کیا کروں؟''

باصر نے ہمدردی کے انداز سے اسے دیکھا اور جھک کر سرگوشی کی۔

''تمہارے بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ جس لڑکی کا تذکرہ کر رہے ہو' اسے تلاش کرو' اس کا سودا کرو اور اسے اپنی بیٹی کہہ کر نرسی کے حوالے کر دو پھر ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلے جاؤ۔''

زان کا چہرہ اس تجویز پر کھل گیا' تفکرات کے بادل چھٹ گئے۔ اس نے احسان مندی کے انداز سے دیکھا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''اب ایسا ہی ہوگا' میں اس حسین لڑکی کو تلاش کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھوں گا اور تم جب تک مدائن سے لوٹو گے' یہ کام ہو جائے گا۔''

•.......•.......•

مراجل نے جس طرح اس گھر میں پرورش پائی تھی' اس سے نکال کر اسے مدائن تک لے جانا معمولی بات نہ تھی۔ اول تو فیروزہ اور ارمیدہ اسے اسی گھر کا فرد تصور کرتے ہوئے محبت کرتی تھیں' دوسرے خیزران اس کی ماں موجود تھی جس نے برسوں ایک پہرے دار کی طرح اس کی حفاظت کی تھی اور اس گھر کے ہر فرد کی خدمت کرتے ہوئے صرف اسی کی خوشی طلب کی تھی اور کچھ بھی نہیں لیکن باصر کے غیر معمولی ذہن نے اس کا انتظام بھی بڑی خوب صورتی کے ساتھ کر لیا تھا۔ مدائن روانگی سے چند دن قبل ہی خیزران نہ جانے کس طرح چھت سے اس طرح گری کہ زخموں نے اسے چُورا کر دیا۔ باصر نے اس کے لیے معقول علاج کا بندوبست کیا اور دوسرے ہی دن بولا۔

''عجب پریشانی کا عالم ہے' اِدھر فیروزہ علیل ہے' اس کے لیے ارمیدہ کی دیکھ بھال بہت ضروری ہے اور اُدھر مجھے ایک ایسے علاقے کا سفر کرنا ہے جہاں میرے ساتھ کسی عورت کا ہونا ضروری ہے۔ معاملات ہی ایسے ہیں۔'' یہ سنتے ہی مراجل نے اسے حیرت سے دیکھا اور بولی۔

''بابا جان! اس علاقے میں کیا کام ہے جو آپ کو عورت کی ضرورت ہے اور اگر شدید ضرورت ہے تو میں آپ کے ساتھ چلوں گی؟''

''لیکن خیزران زخمی ہے اور طبیب کا کہنا ہے کہ ہفتوں بعد وہ حرکت کرنے کے قابل ہوگی

اور وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ جاتی ہے۔‘‘

’’اب میں حفاظت کی عمر سے نکل گئی ہوں اور پھر آپ جو ساتھ ہیں۔‘‘

ایک لمحے کے لیے باصر کو اس کی حفاظت کا احساس ہوا جو وہ برسوں سے کر رہا تھا‘ شاید اس کا مقصد اسے پریشان کرتا لیکن اندر کے آدمی نے باصر کو کچھ سوچنے کا موقع نہ دیا اور پھر کسریٰ کا دربار‘ وہاں کی مراعات و انعامات کوئی معمولی اعزاز تو نہ تھے۔ اس نے کھوئے ہوئے سے انداز سے دیکھا‘ شاید ایران بھر میں مراجل کے حسن کی برابری کوئی نہیں کرسکتا تھا مگر اس کے لیے حسن سے زیادہ دولت کی اہمیت تھی جس کے تصور سے ہی وہ بہک جاتا تھا سو اب بھی وہ بہک رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ’’سفر کی تیاری کرو۔‘‘

یہ حکم سن کر اس کی سوچوں سے بے خبر مراجل خوش ہوگئی۔ اس کے خیال میں سردار زری نے اس کے محسن اور منہ بولے باپ کو کسی ایسے علاقے کی طرف سفر کا حکم دیا تھا جہاں اسے عورتوں کے مسائل سے نبٹنا اور ان کے معاملات کی اصلاح کرنا تھا۔ اسی سوچ کے ساتھ وہ تیزی سے سفر کی تیاری میں مصروف ہوگئی۔ یہ اس کا پہلا سفر تھا جو وہ خیزران کے بغیر کر رہی تھی لیکن باصر کی موجودگی سے وہ پوری طرح مطمئن تھی۔ ادھر باصر کی کیفیت بھی مختلف نہ تھی۔ کسکر سے مدائن تک کا سفر اس نے کئی بار کیا تھا جو موسم کے لحاظ سے دشوار تھا لیکن مستقبل کے سہانے تصور نے جیسے ہر مشکل کو آسان کر دیا تھا اور مدائن کی طرف بڑھنے والا ہر قدم مراجل کے حسن و رعنائی اور اس سے حاصل ہونے والی بے پناہ دولت کے خیال کو تقویت دے رہا تھا۔

•......•......•......•

باصر جس وقت مدائن پہنچا تو رات ہوچکی تھی اور محافظ قلعے کا دروازہ بند کر کے اپنے روزمرہ کے عیش میں مصروف ہوچکے تھے۔ یوں بھی جشن کا موقع تھا‘ امیر غریب سبھی تو شہ خانۂ شاہی سے شرابیں پی پی کر مست تھے لہٰذا اندر داخل ہونے کی کوئی کوشش بار آور ثابت نہ ہوئی اور وہ باہر ہی کسی مناسب سرائے میں قیام پر مجبور ہوگیا لیکن یہ ناکامی اس کے حق میں بہتر ہی تھی کیونکہ عید کا اصل جشن اگلے دن ہونے والا تھا۔ اس نے خوش ہوکر اوپر والے کا شکر ادا کیا اور جشن کا انتظار کرنے لگا۔

دوسرے دن باصر نے دربار کسریٰ سے وابستہ منہ چڑھے مصاحبین سے رابطہ قائم کیا جن کے سہارے وہ بادشاہ تک پہنچ سکتا تھا۔ ایسے میں مراجل ان تمام تیاریوں سے بے خبر جشن کی تیاریوں کو تعجب سے دیکھ رہی تھی۔ اول تو ایران کے پایۂ تخت مدائن آنے کا یہ پہلا اتفاق تھا‘ دوسرے موقع بھی خوب اور عید کی تیاری بھی لاجواب۔ دور دور بازاروں اور سڑکوں پر چراغاں کیا گیا تھا۔ ہر طرف روشنیوں کی بارش سی نظر آرہی تھی۔ اس پر گھروں اور دکانوں کی آراستگی حواس قائم نہ چھوڑتی۔ یہ سب دیکھتے ہوئے وہ اپنے علاقے سے یہاں کا مقابلہ کر رہی تھی۔ چند منٹ سوچنے کے بعد بولی۔

’’بابا جان! اس قدر سجاوٹ اور عید کی یہ تیاریاں کسکر میں کیوں نہیں ہوتیں؟‘‘

’’کیوں کہ کسکر ایک عام علاقہ ہے جبکہ مدائن ایران کا دارالسلطنت ہے‘ دوسرے یہ کہ تم آئی بھی خاص موقع پر ہو۔ اگر کہو تو تمہیں بادشاہ کے دربار تک لے چلیں؟‘‘

مراجل نے حیران ہوکر باصر کی طرف

دیکھا۔ ایران کے جلیل القدر بادشاہ کے بارے میں اس نے جو کچھ سنا تھا اور وہاں کی شان و شوکت کے جو جو واقعات اس کے علم میں آئے تھے‘ ان کے تحت اس کے خیال میں اس دربار تک رسائی معمولی بات نہ تھی۔ وہ بولی۔

’’بابا جان! کیا آپ کو بادشاہ سے ملاقات اور دربار تک جانے کی اجازت ہے؟‘‘

باصر نے اس لمحے فخر محسوس کیا۔ یہ حاضری تو وہ پہلے ہی دے چکا تھا‘ اس بار تو نذرانہ پیش کرنا تھا سو اس کی اجازت بھی مل چکی تھی۔ اس نے کہا۔

’’ہاں‘ مجھے اجازت ہے بلکہ جشن کے لیے تو خاص طور پر بلایا گیا ہے۔‘‘

مراجل نے بڑی خوشی محسوس کی۔ اس کا دل چاہا کہ ارمیدہ بھی یہاں موجود ہوتی تو دونوں جشنِ عید کا سماں دیکھتیں۔ خیر‘ وہ پل پل کی ہر بات اسے بتائے گی۔ ان سوچوں میں غرق وہ جانے کی تیاری کرنے لگی‘ ایسی تیاری جو اس بڑی محفل کے شایانِ شان ہو لیکن جب وہ دونوں باپ بیٹی وہاں پہنچے تو مراجل اس محفل کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بادشاہ اس وقت بھی حسینوں کی محفل میں بیٹھا ہوا تھا اور خوشامدی امیر اس کے دائیں بائیں چاپلوسی کر رہے تھے۔ مراجل نے گھبرائے ہوئے سے انداز میں اس شان و شوکت اور نرالی محفل کو دیکھا۔ اسی وقت باصر‘ شاہ ایران کے سامنے سجدے میں گر گیا تب اس کی سماعت سے کسی امیر کی آواز ٹکرائی۔

’’عالی جاہ‘ کسکر سے معزز باصر اپنا نذرانہ ایک تحفۂ خاص کی صورت پیش کرنے کے لیے حاضر ہوا ہے۔‘‘

بادشاہ نے یہ جملہ سنتے ہی اس جانب دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس وقت جب مراجل سوچ رہی تھی کہ بابا جان تو کوئی نذرانہ نہیں لائے‘ بادشاہ بڑی پسندیدگی اور حریصانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بری طرح سٹپٹا گئی۔ باصر نے سجدے سے سر اٹھایا اور لجاجت سے بولا۔

’’عالی جاہ‘ غلام حاضر ہے اور جس تحفۂ خاص کا وعدہ کیا تھا‘ وہ بھی۔‘‘

مراجل نے باصر کا یہ لب و لہجہ اور یہ انداز کبھی نہ سنا تھا نہ دیکھا تھا لہٰذا حیران تھی لیکن جب پوری محفل کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں تو باصر کے آخری جملے نے اسے بری طرح چونکا دیا۔

اس وقت بادشاہ کی نظروں میں اسے دیکھ کر حیرت بھی تھی‘ چاہت بھی اور ہوس بھی۔ اس نے اپنے آگے دست بستہ کھڑے ہوئے باصر کو دیکھا اور بولا۔

’’یہ لڑکی تیری ہے؟‘‘

’’نہیں عالی جاہ......‘‘ باصر نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ ’’میں نے اسے آپ کے لیے پرورش کیا ہے اور پورے دس برس نگہداشت اور تعلیم و تربیت پر صرف کیے ہیں تاکہ آپ کو پسند آجائے......‘‘

اس لمحے مراجل کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اس عظیم انسان کا اصل روپ اس نے آج دیکھا تھا اور ان تمام سفروں کی نوعیت اس پر آج کھلی تھی جنہیں ارمیدہ بھی نہ جان پائی تھی۔ لمحہ بھر میں غم اور بے بسی کے ملے جلے جذبات نے اسے پاگل سا کر دیا لیکن ابھی شاید کوئی امید باقی تھی کہ اس نے کہا۔

’’بابا جان......! آپ......آپ......‘‘

’’ہاں‘ میں تمہیں اسی لیے لایا ہوں۔‘‘ باصر نے بے تعلق سے انداز سے کہا۔ ’’اسی دن کے

لیے میں نے تم پر اتنی رقم صرف کی ہے۔ اگر عالی جاہ خوش ہو جائیں تو میری خوش بختی ہے اور تمہاری بھی کہ یہ مقام ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔''

''مگر میں واپس جانا چاہتی ہوں۔'' مراجل نے بے بسی سے روتے ہوئے کہا۔

بادشاہ نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی حسین ہے اور اس کی آواز بھی۔ چند لمحے اسے تکنے کے بعد بولا۔

''اے لڑکی......! تو حسینوں کی ملکہ ہے‘ تیری قدر کوئی عام آدمی نہیں کر سکتا اور پھر اس شخص کے ساتھ جا کر تو کیا کرے گی؟''

مراجل نے بادشاہ کی بات کا کوئی جواب نہ دیا‘ بس لجاجت سے باصر کو دیکھتے ہوئے روتی رہی کہ وہ اتنا گھٹیا اور بے ضمیر ہے۔ یہ حیرت اگرچہ معمولی نہ تھی لیکن چند لمحوں میں ختم ہو گئی تھی کیونکہ اب وہ صرف اپنے بارے میں سوچ رہی تھی اور باصر جیسے ہر جذبے‘ ہر احساس کو ختم کر کے صرف کاروباری انسان بن گیا نہ اس کی خوشامد سے متاثر تھا نہ آنسوؤں سے۔ بادشاہ نے اس کا مطلب محسوس کیا اور تالی بجائی۔ غلام حاضر ہوا اور سجدہ کر کے اٹھا تو اس نے حکم دیا۔

''باصر کو اتنی دولت دے دو جو اس کی توقعات سے بھی بڑھ کر ہو اور خواہشات سے بھی۔''

باصر کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے بادشاہ کو سجدہ کر کے اس کا شکریہ ادا کیا اور رخ موڑ کر اس عشرت کدے سے نکل گیا لیکن دور تک مراجل کی چیخ پکار اور آوازیں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ وہ اس کی اصلیت جان کر بھی اس کو پکارتی رہی۔

''بابا جان......! بابا جان......!'' لمحے بھر کے لیے باصر کا دل چاہا کہ پلٹ جائے‘ مراجل کو بازوؤں میں نہیں بلکہ سینے کے اندر چھپا لے جہاں کسی عیاش کی نظر نہ جا سکے لیکن اول تو وہ وہاں پہنچ چکی تھی جہاں سے واپسی ممکن نہ تھی‘ دوسرے اشرفیوں سے بھری ہوئی دو تھیلیاں باصر نے اس سے قبل کبھی نہ دیکھی تھیں۔ ان کی چھنک نے ہر آواز کو دبا دیا تھا اور ان کی چمک سے ہر منظر ماند پڑ گیا تھا۔

چند گھنٹوں بعد جب تاریکی پھیل گئی تھی‘ گلیوں اور بازاروں میں بدمست جوان جشنِ عید کی خوشی میں دادِ عیش دے رہے تھے‘ ایسے میں باصر اپنے ٹھکانے پر بیٹھا ہوا وہ رقم گن رہا تھا جو اسے نذرانہ پیش کرنے کے عوض ملی تھی اور وہ رقم اس قدر تھی کہ اس کی آئندہ نسلوں کو بھی محنت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ باصر یہ پوری طرح بھول گیا تھا کہ قصرِ شاہی میں کسے پہنچا آیا ہے بلکہ اب وہ جلد از جلد کسکر کی طرف واپسی کا سفر کرنا چاہتا تھا۔

......•......•......•

مدائن میں کام ختم ہو چکا تھا لہٰذا مستقبل کے مسحور کن خیالات میں گم وہ اپنی دولت کی حفاظت کرتے ہوئے یہ سفر کرنے لگا۔ اس وقت اس کے علاوہ اس کی سوچوں کا مرکز چند اور باتیں بھی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب تک زخموں اور اس کے مقرر کردہ طبیب کی خاص دواؤں نے خیزران کو موت کی نیند سلا دیا ہو گا۔ ایسے میں مراجل کے لیے باقی سب کو مطمئن کرنے کو کوئی بھی بہانہ کارگر ہو سکتا ہے۔ خیزران کے سوا وہ کسی کو جواب دہ بھی نہیں تھا پھر ابتدا سے اسے اپنایا ہی اس لیے گیا تھا۔ سوچوں کے یہ تانے بانے بنتا ہوا وہ کسکر پہنچا تو اپنے علاقے میں سب سے پہلی ملاقات جس شخص سے ہوئی‘ وہ زان ہی تھا۔ اس پرانے دوست کو دیکھ کر باصر مسرور ہو گیا اور احوال پرسی کے بعد بولا۔

''کہو دوست‘ جشنِ عید کے یہ دن یہاں کیسے گزرے؟''

''ہمیشہ سے زیادہ اچھے۔'' زان نے خوش دلی سے کہا۔ ''تمہاری ہدایت پر عمل ہو گیا جس کے عوض سردار نرسی نے مجھے خوب خوب نوازا اور خاص عزت دی ہے۔''

''کیا مطلب‘ میری ہدایت؟'' باصر نے وضاحت طلب کی۔

''ہاں‘ میں نے جس لڑکی کا تذکرہ کیا تھا‘ اسے پا لیا۔ پہلے سودا کرنا چاہا پھر سختی سے کام لیا۔ تم نے کہا تھا نا کہ میں اسے اپنی بیٹی کہہ کر پیش کر دوں؟''

''ہاں‘ مجھے یاد آیا۔'' باصر نے اطمینان سے کہا۔ ''پھر تم کامیاب رہے‘ مجھے تفصیل بتاؤ۔''

''تفصیل محض اتنی ہے کہ جشنِ عید سے ایک دن قبل میں نے اس لڑکی کو ایک عورت کے ساتھ میلے میں دیکھا‘ جا کر معلوم کیا کہ اس کی گاڑی کون سی ہے پھر گاڑی بان کو صاف کر دیا‘ اپنا آدمی اس کے لباس میں بٹھا دیا۔ جب وہ دونوں عورتیں گاڑی میں سوار ہوئیں اور پردے تن گئے‘ تب گاڑی بان نے گاڑی ہانک دی جس کا رخ ان کے گھر کی طرف نہیں بلکہ میرے گھر کی طرف تھا چونکہ پردے تنے ہوئے تھے لہٰذا دونوں میں سے کسی عورت کو شک نہ ہوا پھر لڑکی کا نذرانہ پیش کر دیا گیا اور اس کی ساتھی عورت کو تہ خانے میں بند...... بس یہی تفصیل ہے اور یہی واقعہ۔''

باصر کو دلی خوشی ہوئی کہ اس کا دوست اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے کھلے دل کے ساتھ مبارک باد دی اور مسرور سے لہجے میں بولا۔

''زان‘ میرے دوست‘ تمہیں یہ کامیابی مبارک ہو‘ جہاں تک میرا تعلق ہے‘ مجھے اب نہ سردار نرسی کی ضرورت ہے نہ اس کی پروا‘ کامل بیس برس میں نے ان کی خدمت کی اور لاتعداد نذرانے انہیں پیش کیے لیکن اب دربارِ کسریٰ تک میری رسائی ہے‘ وہاں بادشاہ نے جس طرح میرے ایک نذرانے کو قبول کر کے مجھے اتنی دولت سے نوازا ہے کہ نرسی کے مصاحب اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں اب اس زندگی کو خیرباد کہنے والا ہوں۔''

اس لمحے زان کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا جسے دبانے کے لیے وہ باتیں کرنے لگا۔ اس لڑکی کی باتیں‘ اس کے اغوا کے انداز کی اور اس کی ساتھی عورت کی باتیں‘ اس نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ وہ عورت اس خوب صورت لڑکی کی ماں ہے کیونکہ بہکی بہکی سی باتیں کرتی ہے‘ بال نوچتی ہے اور کبھی رونے لگتی ہے‘ کبھی ہنستی ہے۔''

''چھوڑو اس ذکر کو۔'' باصر نے ناگواری سے کہا۔ ''اپنا اصول ہے کہ پھل کھاؤ اور چھلکے پھینک دو۔ تم نے اس عورت کو بند کر کے کیوں رکھا؟ سردار نرسی کی پشت پناہی تمہیں حاصل ہے‘ بھلا تمہارا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے؟ نکال کر پھینک دو اور اپنی جان چھڑاؤ۔''

''میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' زان نے اطمینان سے کہا۔ ''جنہیں نرسی اور بادشاہ تک کی پناہ حاصل ہو جائے‘ ان کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے لیکن مجھے خوف صرف اس عورت کی آوازوں سے آتا ہے‘ تھوڑی دیر کے بعد چلا چلا کر

پکارتی ہے۔''

''کیا پکارتی ہے؟'' باصر نے اپنے پیٹ سے بندھی ہوئی اشرفیوں کی تھیلیوں کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

''بس ارمیدہ' ارمیدہ پکارتی ہے۔'' زان نے بے پروائی سے کہا۔

''ارمیدہ......؟'' باصر نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں' غالباً اس لڑکی کا نام ارمیدہ ہی تھا۔'' زان نے اسی لہجے میں کہا۔

''ارمیدہ......!'' باصر نے اس بار حیرت سے نہیں' خوفناک سے انداز میں کہا۔''اس کی آنکھیں حیرانی اور غم سے پھٹ گئی تھیں پھر اس نے گھوڑے کو زور زور سے ایڑ لگائی اور اپنے گھر کی طرف دوڑانے لگا لیکن اپنے گھر کے باہر ہی خیزران کے طبیب کو موجود پا کر اس نے جیسے خود کو سنبھالا کہ شاید اندر اس کی بیوی اور بیٹی موجود ہوں مگر طبیب نے رازداری سے کہا۔

''معزز باصر' جس عورت کو آپ نے بہ غرضِ علاج میری تحویل میں دیا تھا' وہ مرگئی ہے اور یہ کچھ چیزیں بطورِ امانت دے گئی ہے کہ آپ تک پہنچا دوں لیکن تعجب ہے' گھر میں کوئی نہیں ہے؟''

باصر نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا اور ان چیزوں کو تھام لیا۔ ان میں ایک رقعہ بھی تھا جس پر چند سطور تھیں جو اس کو مخاطب کر کے لکھی گئی تھیں۔

''میرے محسن......

میں یہ خبر آپ کو کسی اور وقت دینا چاہتی تھی لیکن وقت قریب ہے' آپ کی واپسی کا انتظار نہیں کرسکتی لہٰذا اس بات کو آشکار کر رہی ہوں کہ مراجل میری بیٹی نہیں بلکہ آپ کی اور خوش ماہ کی ہے جو میری عزیز دوست تھی اور آپ سے محبت کرتی تھی۔ وہ آخری لمحے تک آپ کا انتظار کرتی رہی پھر مراجل اور آپ کی دی ہوئی یہ نشانی یعنی خاص ہار میرے سپرد کر کے مرگئی۔ میں نے آپ کو صرف ایک بار اس علاقے میں دیکھا تھا پھر اس دن دیکھتے ہی پہچان گئی تھی جب برسوں قبل آپ مجھے اور مراجل کو بے آسرا تصور کر کے اپنے ساتھ گھر لائے تھے۔ خوش ماہ کی بھی یہی تمنا تھی کہ جیسے بھی ہو' آپ کی یہ امانت آپ تک پہنچ جائے۔ جب تک آپ واپس آئیں گے' میرا وقت پورا ہو چکا ہوگا۔ میں آپ سے نہ مل سکوں گی لہٰذا یہ ہار واپس کر رہی ہوں اور خوش ہوں کہ آپ کی بیٹی آپ کے ہی سائے میں پرورش پا کر جوان ہوئی' یقیناً آپ اسے منزل تک پہنچا دیں گے۔

آپ کی احسان مند

خیزران'

باصر نے خط پڑھا' اس ہار کو دیکھا جو اس نے مدتوں قبل ایک خوب صورت لڑکی کو پہناتے ہوئے جلد لوٹ آنے اور شادی کرنے کا کہا تھا پھر اس نے اردگرد دیکھا' اس کی آنکھوں میں وحشت و دیوانگی تھی جو بڑھتی چلی گئی۔ سامنے کھڑے ہوئے طبیب نے حیرت سے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ پلٹ کر تیزی سے دوڑنے لگا اور باصر کے قہقہے اس کا پیچھا کرنے لگے۔ وہ ہنستا رہا' اپنے سینے سے بندھی ہوئی تھیلیوں کو نوچ نوچ کر پھینکتا رہا اور دیکھنے والے حیرت سے دیکھتے اور بکھری ہوئی اشرفیوں کو سمیٹتے رہے۔ کوئی نہ جان سکا کہ نرسی کا معزز مصاحب جس کی رسائی کسریٰ کے دربار تک تھی' کیوں پاگل ہوگیا ہے؟

☆☆......☆☆

ماہِ نومبر کی خصوصی کہانی

سقوطِ ڈھاکہ' بنگلہ دیش کے قیام کے حوالے سے چشم کشا تحریر

کھڑکی میں رکھی آنکھ

(پہلا حصہ)

علی آذر کی پروازِ فکر

> اک سمت ہیں دشمن مرے اِک سمت ہیں احباب
> میں سوچتا ہوں تیر یہ آیا ہے کدھر سے

رئیسہ خالد

میرے بیٹے اور میری بیٹی نے اصرار کیا ہے کہ میں اپنی سوانح حیات لکھوں میں سوچتی ہی رہی کہ شاید یہ میرے بس کی بات نہیں' مگر بچوں کے مسلسل اصرار نے مجھے اتنا مجبور کیا کہ آخر کار میں



اپنی سرگزشت حیات لکھنے بیٹھ ہی گئی۔ مجھے ہادی حسن رسوا کے مشہور ناول 'امراؤ جان ادا' کا وہ شعر یاد آ رہا ہے جس شعر سے اس ناول کی شروعات ہوتی ہے' یہ شعر اس ناول کی ہیروئن امراؤ جان کی طرف سے ادا کیا گیا ہے۔

کس کو سنائیں حالِ دلِ زار اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

میں 1942ء میں ہندوستان کے صوبہ بہار کے ایک چھوٹے سے شہر دانا پور میں پیدا ہوئی۔ اُن دنوں اس شہر میں بجلی تک نہ تھی۔ ریڈیو اور ٹی وی کا تو کسی نے نام تک نہ سنا تھا۔ ہندو مسلمان دونوں کی آبادی تقریباً برابر تھی لیکن سب مل جل کر رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرتے تھے۔ ابا سرکاری افسر تھے مگر چونکہ اصول کے پابند تھے۔ زیادہ دنوں تک اسی لیے رہ نہیں پاتے تھے' ہمیشہ اُن کا تبادلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہو جایا کرتا تھا۔ ان دنوں ابا کی پوسٹنگ دانا پور میں تھی۔ میں نے ایک خوشحال اور ذی وقار گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ یہ ایک تعلیم یافتہ گھرانہ تھا۔ ابا اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے دادا لندن سے بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر کے لوٹے تھے۔ انہوں نے اپنے سب بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی سوائے ایک بیٹے کے جو تیسرے نمبر پر تھے۔ یہ بچپن سے بیمار تھے اس لیے انہوں نے صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کی وہ زیادہ تر دادی کے ساتھ گاؤں میں رہتے اور زمینداری کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ ان کے علاوہ ان کے سبھی بچے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ لیکن عورتوں کو تعلیم دلانے کا وہاں کوئی رواج نہ تھا۔ ہماری دونوں پھوپیوں نے بھی صرف وہ تعلیم حاصل کی جو وہ گھر پر رہ کے کر سکتی تھیں۔

اماں کا تعلق بھی ایک پڑھے لکھے اور زمیندار گھرانے سے تھا۔ وہ اپنے والدین کی آخری اولاد تھیں۔ اُن کا کوئی بھائی نہیں تھا صرف ایک بڑی بہن تھیں جن کی شادی بہت چھوٹی عمر میں کر دی گئی تھی اور رخصتی سے قبل ہی ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ ان دنوں خاص کر ہمارے خاندان میں دوسری شادی کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے ان کی دوسری شادی نہیں کی گئی۔ نانا کے انتقال کے بعد وہ ہم لوگوں کے ساتھ رہتی تھیں' ہم سب بہن بھائی اُن کو ہی امی کہتے تھے۔ سچ پوچھیے تو ہم لوگوں کی تربیت میں اُن ہی کا زیادہ ہاتھ تھا۔ انہوں نے بھی کسی اسکول یا کالج سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ہر موضوع پر بہت اچھی طرح بحث کر لیتی تھیں۔ پابندی سے اخبار اور رسالے کا مطالعہ کیا کرتی تھیں۔ ہماری ننھیال میں سہیل عظیم آبادی کا نام اردو دنیا کے ایک مشہور افسانہ نگار اور زبان اردو کے مجاہد کی حیثیت سے بڑی عزت و اکرام سے لیا جاتا ہے' خاص طور سے چھوٹا ناگپور یعنی رانچی اور مضافات میں اردو کی بقا اور ترویج و اشاعت کے لیے جو خدمات انہوں نے انجام دی ہیں انہیں بھلایا نہیں جا سکتا۔ رانچی میں ہی قیام کے دوران انہوں نے شہرۂ آفاق افسانہ 'الاؤ' لکھا' جسے آج بھی نصاب میں شامل کیا جاتا ہے۔ ان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

ہماری امی کو خانہ داری سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی اس لیے وہ بچوں پر زیادہ توجہ نہیں دے پاتی تھیں۔ گھر میں نوکرانیوں کی کمی نہ تھی۔ مرد نوکر گھر کے اندر نہیں آ سکتے تھے۔ ان کا صرف باہر کا کام تھا کیونکہ ابا پردے کے زبردست حامی تھے۔ ملازمت کے آخری سال میں ان کا تبادلہ

رانچی ہو گیا تھا جو اب جھارکھنڈ کا دارالحکومت ہے۔ وہیں ریٹائر ہوئے اور وہیں کے ہو رہے۔ زندگی کے مدارج طے کرتے ہوئے ابا نے بہت عروج پایا۔ انگریز کے زمانے میں اعلیٰ سرکاری ملازمت بڑے لوگوں سے ذاتی مراسم اور دولت کی ریل پیل ہو تو دماغ خراب ہو ہی جاتا ہے۔ ابا کی گاؤں میں بڑی زمینیں تھیں جن کی دیکھ بھال دادی اور چچا کرتے تھے۔ اقتدار حاصل ہو جائے تو پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے۔ لیکن میرے ابا میں غرور' تکبر اور رعونت ذرہ برابر نہ تھی۔ خدا جانے وہ اعلیٰ ظرفی کے کس مقام پر تھے کہ ان پر کوئی چیز اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ آنکھیں بند کر کے لوگوں کی مدد کرنا' انہیں نوکریاں دلوانا اور جب تک انہیں پہلی تنخواہ نہ مل جاتی ان کے طعام و قیام کا انتظام اپنے ہی گھر پر کرنا اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتے تھے' اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تفریق نہ تھی۔ جب بھی کوئی ان کے پاس آتا وہ مدد کرنے سے کبھی انکار نہیں کرتے۔ بہت سے ضرورت مندوں کو ماہانہ رقم بھیجتے جن کا علم گھر والوں کو بھی نہیں تھا۔ اس بات کا پتہ تو اس وقت چلا جب ان کے انتقال کے بعد کئی لوگوں نے اس کا اظہار کیا' ان کے کاغذات سے بھی ان لوگوں کی بہت سی رسیدیں ملیں جن کو ابا رقم بھیجتے تھے۔ ہر شخص کو اپنے والدین بے مثل نظر آتے ہیں لیکن میرے ابا تو تھے ہی بے مثل۔ حسد' کینہ' بغض' وعناد جیسے لفظوں سے وہ یکسر ناآشنا تھے۔ زندگی بھر انہوں نے سلطان کی طرح راج کیا۔ دوسروں کی بھلائی مانگ کر انہوں نے اپنے بچوں کی بھلائی مانگی اور اس میں کامیاب بھی رہے۔

ابا گھر پر ہوتے تو ہم لوگوں کو کہیں آنے جانے کی جرأت نہ ہوتی' مگر جیسے ہی وہ دورے پر جاتے ہم بہنوں کی چاندی ہو جاتی۔ مگر کبھی غلط بیانی کر کے کوئی رعایت امی سے طلب نہ کی اور نہ ہی کبھی انہوں نے نصیحت کے انبار لگائے نہ ہی بات بات پر روک ٹوک' بس ان کا کردار اور سلوک سامنے تھا۔ اگر ہم نے ان کی کوئی صفت نہ اپنائی تو اسے اپنی کم نصیبی کہہ سکتے ہیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد ابا نے رانچی میں مکان خرید لیا جو بہت بڑے رقبے پر واقع تھا۔ گھر کیا تھا' فارم ہاؤس کہہ لیجیے جس میں طرح طرح کے پھل دار درخت لگے ہوئے تھے۔ ہر موسم کا پھل گھر میں مل جاتا تھا۔ ابا کی موجودگی میں ہمیں باہر نکلنے کی ہمت نہیں تھی لیکن جب وہ شہر سے باہر دورے پر ہوتے تو ہم سب بہنیں مل کر باغ میں جاتیں اور خوب پھل توڑ کر کھاتیں اور ہنسی مذاق کرتیں کیونکہ خود سے توڑ کر کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ کمپاؤنڈ کے بیچ میں ایک بڑا سا تالاب تھا جس میں کافی مچھلیاں تھیں۔ مہینے میں ایک بار مچھلیاں ضرور نکالی جاتیں۔ زمین کے ایک حصے میں مرغیوں کا بہت بڑا فارم تھا جہاں سے روزانہ پندرہ بیس انڈے اکٹھا کیے جاتے۔

ہمارے والدین کو جانور پالنے کا بھی بہت شوق تھا۔ طرح طرح کے جانور گھر میں پلے ہوئے تھے ان کی دیکھ بھال کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں ہم سب بھائی بہنوں نے پرورش پائی۔

ہم دس بہن بھائی تھے دو بھائی مجھ سے بڑے تھے ایک بہن مجھ سے بڑی تھیں۔ باقی بہنیں مجھ سے چھوٹی تھیں۔ سب سے چھوٹا ایک بھائی تھا جو چھ بہنوں کے بعد تھا۔ بچپن میں ہم سب بہنیں کبھی اسکول نہیں گئیں کیونکہ ابا کی ملازمت ٹرانسفر والی تھی۔ اس لیے کہیں بھی سال چھ ماہ سے زیادہ ٹھہر

نہیں پاتے تھے۔ کبھی کبھی تو پورا سامان کھلتا بھی نہیں تھا کہ ٹرانسفر کے آرڈر آ جاتے۔ اکثر ایسی جگہ ٹرانسفر ہو جاتا جہاں لڑکیوں کے لیے باقاعدہ اسکول بھی نہ ہوتا لیکن گھر پر باقاعدہ ماسٹر پڑھانے آتے تھے۔ میرے علاوہ ساری بہنیں گھر پر ہی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ سچ پوچھیے تو ابا کو اسکول بھیجنے کا شوق نہ تھا۔ میں نے اور میری بڑی بہن نے تو کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا جو کچھ بھی علم حاصل کیا گھر پر ہی کیا۔ بڑے دونوں بھائیوں نے چچا اور پھوپی کے گھر پر رہ کر میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کرنے کے بعد بڑے بھائی علی گڑھ چلے گئے اور آگے کی تعلیم وہاں سے حاصل کی جبکہ دوسرے نمبر والے بھائی جو مجھ سے بڑے تھے وہ میٹرک کرنے کے بعد رانچی آ گئے تھے، انہیں سینٹ زیویرز کالج میں داخلہ دلایا گیا۔ لیکن انہیں سائنس سے رغبت نہ تھی۔ انٹر تو انہوں نے کسی نہ کسی طرح سائنس سے کر لیا لیکن آگے وہ سائنس پڑھنے کو تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے انگلش آنرز کیا پھر انگلش میں ایم اے کیا اور کچھ عرصہ اسی کالج میں پڑھاتے رہے پھر اسکالرشپ پر پی ایچ ڈی کرنے کے لیے کیمبرج یونیورسٹی چلے گئے۔ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد وہ اسی یونیورسٹی میں پڑھانے لگے۔ ان کی بیگم بھی ڈاکٹر ہیں اور رانچی کے ہی ایک اسپتال میں ہیں۔ رہتی تو وہ کیمبرج میں ہیں لیکن ان کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ان کے دو بچے ہیں ایک لڑکی اور ایک لڑکا، ہمارے گھر کے سامنے ایک پہاڑ ہے جو رابندر ناتھ ٹیگور کے نام پر ٹیگور ہل کہلاتا ہے۔ مشہور ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور نے اسی ٹیگور ہل پر 'گیتا نجلی' کی تخلیق کی تھی، جس پر انہیں نوبل پرائز ملا تھا۔ جب ابا نے یہ گھر خریدا تھا تو اس وقت ہواں بالکل آبادی نہ تھی لیکن اب تو جگہ مکانوں سے بھر گئی ہے۔ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے۔ آبادی زیادہ ہونے کی وجہ سے علاقے کی خوبصورتی میں کمی آ گئی ہے۔

بڑے بھائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان آ گئے تھے۔ ان دنوں وہ اپنی فیملی کے ساتھ امریکہ میں مقیم ہیں۔ ان کے تین بچے ہیں' دو بیٹیاں اور ایک بیٹا' چھوٹا بھائی رانچی میں ہی ہے اور اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس کے بھی تین بچے ہیں ایک بیٹی اور دو بیٹے' سب بچے ماشاء اللہ خوش ہیں۔ سب بہنیں اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد دختری کے طور پر وراثت میں ملی ہوئی زمین پر مکان بنوا کر مستقلاً سکونت پذیر ہیں۔ سب کے بچے مختلف ملکوں میں ملازمت کرتے ہیں اور خوش ہیں۔

☆......☆......☆

میں چھوٹی عمر سے گاؤں میں اپنی دادی اور چچا کے ساتھ رہتی تھی۔ میری دادی بہت شفیق اور نیک خاتون تھیں۔ ان کے ساتھ رہتے ہوئے میں نے کبھی اپنے گھر والوں کو یاد نہیں کیا۔ میں گاؤں میں رہتی تھی۔ گاؤں کا ماحول ایسا ہوتا ہے کہ بچیوں کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں ملتی۔ پاس پڑوس میں ایسی کوئی فیملی بھی نہ تھی صرف میری ایک پھوپی کا گھر تھا۔ دونوں گھروں کا باہری دروازہ آمنے سامنے تھا۔ جہاں میں اکثر آیا جایا کرتی تھی۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں جن میں ایک میری ہم عمر تھی۔ ہم آپس میں مل جل کر کھیلتے' پڑھتے اور سلائی بُنائی کرتے۔ ہم نے جو کچھ سیکھا وہیں سیکھا۔ دادی اماں کو بھی بہت شوق تھا کہ میں

ہر چیز سیکھوں۔ میں جس چیز کی فرمائش کرتی وہ شہر سے منگوا دیتیں۔ گھر میں ایک ریڈیو بھی تھا۔ پڑھائی اور کھیل سے فارغ ہو کر میں ریڈیو ضرور سنتی۔ بلکہ کبھی کبھی ساتھ گاتی بھی تھی۔ دادی یا چچا نے مجھے کبھی گانا سننے یا گانے سے منع نہیں کیا بلکہ میری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ہفتہ میں ایک دو دن وہ مجھے ہارمونیم بجانا بھی سکھاتے۔ ان سب سرگرمیوں میں میرا وقت اچھا گزر جاتا۔ گھر کے برابر میں ایک بڑا باغ بھی تھا۔ ہم بچیوں کو باغ میں جانے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ باغ میں جانے کا راستہ باہر سے تھا۔ لیکن جب ہم لوگ امرود یا کوئی پھل کھانے کی ضد کرتے تو چچا ہم لوگوں کو چھت پر بھیج دیتے اور خود باغ میں جا کر امرود توڑتے اور چھت پر پھینکتے جاتے اور ہم بہنیں بھاگ بھاگ کر جمع کرتیں اور مزے لے لے کر کھاتیں۔ ایسا ہفتہ میں کئی بار ہوتا۔ میں نے وہاں جو وقت گزارا کافی خوشگوار تھا۔ سال میں ایک بار دادی مجھے لے کر ابا کے گھر ضرور جاتیں۔ دادی ایک ماہ سے زیادہ کسی بیٹے کے گھر نہیں رُکتی تھیں۔ بلکہ سال میں دو بار ان کے سب بچے' فیملی کے ساتھ ضرور آتے' ان دنوں گھر میں خوب رونق رہتی۔ گاؤں میں رہنے کے باوجود میری پڑھائی کا سلسلہ جاری تھا۔ بچپن کی ساری تعلیم میں نے دادی اور چچا سے حاصل کی۔ دادی دینی تعلیم دیتیں جبکہ چچا انگریزی' اردو اور حساب وغیرہ پڑھاتے۔ بارہ تیرہ سال کی عمر تک میں گاؤں میں رہی اس لیے میں نے اسکول کا منہ نہیں دیکھا۔ اگرچہ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا' اللہ نے ذہن بھی اچھا دیا تھا لیکن گاؤں میں رہ کر اس سے زیادہ نہیں سیکھ سکتی تھی۔ اب میری خواہش تھی کہ اپنے والدین کے پاس چلی جاؤں لیکن چچا اور دادی نہیں چاہتے تھے کہ میں انہیں چھوڑ کر جاؤں۔ پھر بھی جب دادی ابا کے گھر لے کر گئیں تو میں واپس جانے کو تیار نہیں ہوئی۔ دادی بہت افسردہ تھیں لیکن میری ضد کے آگے انہیں ہار ماننی پڑی۔ میری بہنیں گھر پر تعلیم حاصل کر رہی تھیں لیکن میں جس عمر میں تھی اس میں ماسٹر سے پڑھوانا گھر والوں کو مناسب نہیں لگا۔ جس شہر میں ابا کی پوسٹنگ تھی وہاں مسلم لڑکیوں کے لیے ایک اسکول تھا جہاں ساتویں درجے تک تعلیم دی جاتی تھی۔ میں نے ضد کر کے اسکول میں داخل تو لے لیا لیکن چند مہینوں بعد ہی ابا کا وہاں سے تبادلہ ہو گیا۔ بڑی بہن کی شادی ہو چکی تھی۔ اب ابا کا تبادلہ رانچی ہو گیا تھا۔ یہاں بڑے اچھے اچھے اسکول اور کالج تھے لیکن ابا اسکول بھیجنے کے قائل نہ تھے۔ میں روزانہ اسکول میں داخلے کے لیے ضد کرتی کہ اگر ٹیچر سے نہیں پڑھ سکتی تو اسکول ہی بھیج دیں۔ کبھی سوچتی کہ اس سے تو اچھا تھا کہ میں گاؤں میں ہی رہتی وہاں رہ کر کچھ نہ کچھ سیکھتی ہی رہتی' کیا کروں' دادی کے پاس چلی جاؤں۔ میں خاصی غمزدہ رہنے لگی تھی۔ گھر میں کوئی میری بات سننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ اس طرح کئی سال گزر گئے۔

☆......☆......☆

بڑے بھائی چھٹیوں میں گھر آ جاتے تھے۔ اس بار جب وہ آئے تو میں نے ان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا بلکہ رونے لگی کہ یہ لوگ مجھے اسکول نہیں بھیجتے اور نہ ہی گھر میں پڑھانے کا انتظام کرتے ہیں' آپ ابا سے میری سفارش کر دیں شاید ابا آپ کی بات مان لیں۔ بھائی جانتے تھے کہ ابا کبھی راضی نہیں ہوں گے اس لیے انہوں نے ایک ترکیب سوچی کہ مجھے ماموں یعنی

اماں کے پھوپی زاد بھائی کے گھر بھجوادیا جائے۔
ان کی کئی لڑکیاں تھیں اور سب اسکول کالج میں پڑھ رہی تھیں ان کی بڑی بیٹی ان دنوں تھرڈ ایئر میں تھیں۔ باقی دو بہنیں اسکول میں نویں جماعت کا امتحان دینے والی تھیں۔ اسکول میں تو مجھے داخلہ نہیں مل سکتا تھا۔ کیونکہ اس وقت میری صلاحیت شاید اتنی نہیں تھی لیکن پرائیویٹ امتحان کی تیاری کر کے امتحان تو دے ہی سکتی تھی۔ ان دنوں نویں اور دسویں کا امتحان ایک ساتھ دینا پڑتا تھا۔ اس طرح ماموں کے گھر آگئی اور پرائیویٹ امتحان کی تیاری میں جٹ گئی۔ ماموں کی بڑی بیٹی جو ان دنوں کالج میں تھیں انہوں نے میرا ساتھ دیا۔ وقت نکال کر وہ مجھے پڑھاتیں۔ ان دنوں پڑھنے کے علاوہ میرا اور کوئی کام نہ تھا۔ ان کی کوششوں سے میں نے گڈ سیکنڈ ڈویژن سے میٹرک پاس کرلیا۔ میں خود بھی پڑھنے کی شوقین تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ اگر میں نے موقع کھودیا تو دوبارہ موقع نہیں ملے گا۔

میٹرک کا امتحان دینے کے بعد میں اپنے گھر واپس آگئی۔ مجھے آگے پڑھنے کی کوئی امید تو تھی نہیں کیونکہ میں اپنے گھر کا ماحول جانتی تھی لیکن خلاف توقع میرے والد میری پڑھائی سے بہت خوش ہوئے اور خود ہی بھاگ دوڑ کر کے مجھے کالج میں داخلہ دلوایا۔ اب میں بہت خوش تھی۔ میری چھوٹی بہنیں جو اسکول نہیں جاتی تھیں انہیں بھی اسکول میں داخلہ دلوایا۔ میری تعلیم کا سلسلہ چل نکلا تھا میں نے دو سال میں انٹر کرلیا اور بی اے کے پہلے سال میں پہنچ گئی۔

کالج میں مسلمان لڑکیاں بہت کم تھیں بلکہ پورے کالج میں ان دنوں مسلمان لڑکیوں کی تعداد بمشکل سات تھی۔ فرسٹ ایئر میں چار لڑکیاں مسلمان تھیں' ان مسلمان لڑکیوں کے علاوہ کئی ہندو لڑکیاں میری سہیلیوں میں شامل تھیں جن میں مینا ہماری سب سے اچھی دوست تھی۔ ہم نے ساتھ بی اے کیا۔ اگرچہ اس کے گھر کا ماحول بڑا سخت تھا اس کے باوجود ہم ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے اور آج بھی ہیں۔ اگرچہ وہ رانچی میں نہیں رہتی لیکن جب بھی میں ہندوستان جاتی ہوں' فون پر اس سے رابطہ ہوتا ہے۔ اس بار تو چالیس سال بعد اس سے ملاقات بھی ہوئی اور اُس نے اور اُس کے شوہر نے میری بڑی خاطر مدارت کی بلکہ اپنے ہاتھ سے گوشت پکا کر مجھے کھلایا۔ جبکہ وہ خود لہسن پیاز اور انڈا تک نہیں کھاتے۔ اس کے دو بڑے بھائی جو سب جج اور دوسرے ہائی کورٹ کے وکیل تھے مجھے اپنی سگی بہن کی طرح پیار کرتے تھے' اب تو دونوں فوت ہوچکے ہیں لیکن بھابی اور ان کے بچے رانچی ہی میں رہتے ہیں' میں ان سے ملنے ضرور جاتی ہوں۔ بھائی کے بچے بھی میری بہت عزت کرتے ہیں۔

مینا کے دو بچے ہیں ایک لڑکا اور ایک لڑکی...... دونوں ہمارے بچوں کے ہم عمر ہیں۔ مینا کے علاوہ میری دو ہندو دوستیں اور ہیں اور وہ رانچی میں ملتی ہیں۔ بینا رانچی کالج میں سائیکالوجی میں پروفیسر تھیں اور جوتیکا انگلش کی پروفیسر تھیں' اب دونوں ریٹائر ہوچکی ہیں۔

ہمارے رانچی پہنچتے ہی انہیں خبر ہوجاتی ہے اور فون آنے شروع ہوجاتے ہیں۔ مجھے ان سے ملے بغیر چین نہیں آتا اور انہیں بھی میرے وہاں پہنچنے کا بڑا انتظار رہتا ہے۔ جب جب ان سے ملاقات ہوتی ہے ہم ایک ساتھ بیٹھ کر پرانی یادیں تازہ کرتے ہیں۔

میں جب بھی وہاں جاتی ہوں مینا اور اس

کے بچے مجھے ملنے آتے ہیں اور کئی بار ان کے گھر دعوت بھی ہوتی ہے۔

مسلمان سہیلیاں تو نہ جانے کہاں کہاں ہیں' کالج کے بعد ان لوگوں سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ جب بھی ہندوستان جانا ہوتا ہے ان سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

☆......☆......☆

میں نے بی اے میں داخلہ لے تو لیا مگر چند مہینے ہی کالج جاسکی کہ میرا رشتہ آگیا۔ یہ لوگ بھی ہمارے رشتے دار تو نہیں تھے مگر ابا کے قریبی جاننے والے تھے۔ لڑکے کے والد مجسٹریٹ تھے اور ابا سے ایک دو سال سینئر بھی تھے۔ ان کا بڑا لڑکا پاکستان میں تھا اور ان دنوں والدین سے ملنے ہندوستان آیا ہوا تھا۔ گھر والے چاہتے تھے کہ جانے سے پہلے ان کا کہیں رشتہ کروادیا جائے۔ میری امی پاکستان بھیجنے کے بہت خلاف تھیں کیونکہ ہمارے خاندان کے بہت کم لوگ ہی پاکستان آئے۔ مزید کہ میری تعلیم بھی ادھوری ہی تھی۔ وہ میرا شوق جانتی تھیں لیکن میری امی کی ایک نہ چلی اور میرا رشتہ طے کردیا گیا۔ لیکن اُن دنوں ہمارے خاندان میں لڑکیوں سے مشورہ نہیں کیا جاتا تھا۔ مجھے اپنی تعلیم مکمل نہ کرنے کا بہت افسوس تھا۔ لیکن میرے شوہر بہت اچھے انسان تھے۔ انہوں نے میری خواہش کا احترام کرتے ہوئے مجھے آگے تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے دی۔ طے پایا کہ جب تک تعلیم مکمل نہیں ہوجاتی میں ہندوستان میں ہی رہوں گی اور اپنے والدین کے گھر رہ کر تعلیم مکمل کروں گی۔ شادی کے ایک ماہ بعد وہ واپس پاکستان چلے گئے۔

میرے سسر ریٹائرمنٹ کے بعد اب اپنے آبائی گاؤں میں آکر رہنے لگے تھے۔ اس لیے میرا وہاں جانا کم ہی ہوتا تھا۔ جب شوہر آتے تب ہی میرا وہاں جانا ہوتا تھا۔ ایک سال بعد میرے شوہر ایک ماہ کے لیے پھر آئے۔

☆......☆......☆

1965ء کا زمانہ تھا۔ ہندوستان پاکستان کے تعلقات خاصے خراب تھے اس لیے تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی میرا جانا ملتوی ہوتا رہا۔ بی اے تو میں نے کرلیا تھا لیکن آگے پڑھنے کی اجازت ابا سے نہیں ملی کیونکہ کو ایجوکیشن میں پڑھنا انہیں پسند نہیں تھا۔ بی اے کے بعد میں نے کئی سال مزید ہندوستان میں گزارے۔ میرے شوہر نے آگے پڑھنے کی اجازت دے دی تھی لیکن ابا کی وجہ سے میں ایم اے نہ کرسکی۔ اس دوران میرا بیٹا بھی ڈھائی سال کا ہوگیا تھا اس لیے اسے امریکن پلے اسکول میں داخل کروادیا تھا اور خود کوئی ملازمت کرنا چاہتی تھی۔ ابا ملازمت کے لیے بھی راضی نہ تھے لیکن بچے کی اسکول فیس کافی تھی' لہٰذا ملازمت میری مجبوری تھی۔ ان دنوں پاکستان سے رقم بھیجنا اتنا آسان نہیں تھا' لیکن جب کبھی موقع ملتا وہ رقم ضرور بھیجتے تھے۔ میری ساری ضروریات والدین ہی پوری کرتے تھے۔ لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کہ میں ان پر مزید بوجھ بنوں اس لیے میں نے اسکول جوائن کرلیا۔ اسکول کے بعد ایک سلائی سینٹر بھی جاتی جہاں مجھے کئی گھنٹے لگ جاتے۔ بچے کی فیس ان دنوں بھی 50 روپیہ ماہانہ تھی۔ چھوٹے بچے کے ساتھ اور بھی بہت سی ضروریات ہوتی ہیں' اس لیے مجھے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا تھا۔ والدین کو میں نے بڑی مشکل سے راضی کیا۔ بچے کو اسکول لے جانے اور لانے اور دیکھ بھال کرنے کا مسئلہ اس لیے نہ تھا کہ میری آیا جو بچپن میں میری دیکھ بھال کرتی تھیں ابھی

باحیات تھیں اور اسی گھر میں رہتی تھیں۔ بیٹے کو بڑی آسانی سے اُن کے پاس چھوڑ کر جاسکتی تھی۔ وہ اب بھی میری ضروریات کا خیال رکھتی تھیں۔ اسکول میں اگرچہ تنخواہ بہت کم تھی لیکن ان دنوں اتنی مہنگائی نہ تھی اس لیے فیس اور دوسری ضروریات کے باوجود اچھی خاصی رقم بھی بچ جاتی تھی۔ اس اسکول میں' میں نے تقریباً ایک سال کام کیا اور اس کے بعد میرا ویزا آ گیا اور میں پاکستان آ گئی۔

اگرچہ میرے شوہر کی پوسٹنگ ڈھاکہ میں تھی' یہ 1966ء کا زمانہ تھا لیکن جب میں پاکستان گئی ان دنوں وہ کراچی میں تھے کیونکہ ٹریننگ کے سلسلے میں انہیں چھ ماہ کے لیے کراچی بھیجا گیا تھا۔ اس لیے میں ڈھاکہ کی بجائے کراچی آ گئی۔

میں مائیگریشن پر پہلی بار کراچی جارہی تھی۔ ان دنوں مائیگریشن بہت مشکل مسئلہ تھا۔ کیونکہ کچھ ماہ پہلے ہی ہندوستان اور پاکستان کی جنگ ختم ہوئی تھی۔ بڑی کوشش کے بعد میرے کاغذات تیار ہوئے۔ کاغذی کارروائی کے دوران عدالت جانے اور بیان دینے کا مرحلہ بھی آیا۔ میری ایک دوست مینا جس کا تذکرہ میں پہلے بھی کرچکی ہوں اس کا بھائی ہائی کورٹ میں وکیل تھا۔ اس نے میری بہت مدد کی اور مجھے عدالت جانے کے بجائے اپنی موجودگی میں گھر بلا کر بیان دلوایا۔ انہوں نے عدالت میں یہ کہہ کر کہ پردہ نشین مسلمان لڑکی عدالت نہیں جاسکتی جو کچھ بھی سوال و جواب کرنا ہے گھر پر ہی کریں میں وہاں پر موجود رہوں گا۔ خیر کسی طرح یہ مرحلہ طے ہوا اور کاغذات تیار ہوگئے۔ میرے دونوں بڑے بھائی ان دنوں ملک سے باہر تھے' اس لیے اپنے ایک منہ بولے بھائی عارف خان کے ساتھ میں دہلی پہنچی۔ اب ٹکٹ کا مسئلہ تھا۔ لفتھنسا ایئر لائن کا ٹکٹ ملا پرواز جو ایک ہفتہ بعد کی تھی۔ ان دنوں ہندوستان پاکستان کے درمیان ٹیلی فون کا رابطہ آسان نہیں تھا اور ٹیلی گرام بھی مشکل سے پہنچتا تھا' خط پہنچنے کی تو بات ہی الگ ہے۔

تقریباً رات بارہ بجے جہاز کراچی ایئرپورٹ پر اترا۔ کسٹم اور کاغذات کی خانہ پری کے بعد جب میں لاؤنج سے باہر نکلی تو اس وقت تک دو بج چکے تھے۔ باہر کوئی بھی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا۔ آخر کار میں لاؤنج میں واپس آ گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ صاحب جنہوں نے کاغذات پُر کرنے میں میری مدد کی تھی میرے پاس آئے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا کوئی آپ کو لینے نہیں آیا؟ انہوں نے بتایا کہ لفتھنسا ایئر لائن میں ملازم ہیں' ان کی ڈیوٹی کا وقت ختم ہورہا تھا اور وہ گھر جانے والے تھے' انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ کہیں تو میں کسی ہوٹل میں آپ کا انتظام کروادوں' صبح آپ وہاں سے گھر جاسکیں گی۔ میرے پاس پاکستانی کرنسی بالکل نہیں تھی' اس لیے ڈر رہی تھی کہ اگر صبح بھی میرے شوہر نہ پہنچ پائے پھر میں کیسے بل ادا کیے بغیر ہوٹل سے باہر نکل پاؤں گی۔ میں نے ان سے کہا میں یہیں انتظار کرلوں گی آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ انہوں نے کہا ایئرپورٹ تو تھوڑی دیر بعد بند ہوجائے گا' پھر آپ اکیلی یہاں کیسے رک سکتی ہیں...... آپ ایسا کریں کہ میں ٹیکسی کروادیتا ہوں ٹیکسی والا آپ کو پتے پر پہنچا دے گا۔ لیکن میں اتنی خوف زدہ تھی کہ اکیلے اتنی رات کو ٹیکسی والے کے ساتھ جانے کو راضی نہیں ہوئی' انہوں نے پھر اصرار کیا اگر آپ اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتیں تو آپ میرے ساتھ میرے گھر کو چلیں صبح

ڈیوٹی ختم ہوتے ہی آپ کو خود آپ کے صحیح پتے پر پہنچا آؤں گا۔ میرے لیے کوئی چارہ بھی نہیں تھا اس لیے میں ان کے ساتھ جانے کو راضی ہوگئی' لیکن دل ہی دل میں خوف زدہ بھی تھی۔ بہرحال ٹیکسی میں ان کے ساتھ ان کے گھر پہنچی وہ ایئرپورٹ سے قریب ہی سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے' دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد ہی ایک خاتون نے دروازہ کھولا جو بیشک ان کی بیوی ہی تھی۔ ان سے مل کر میری جان میں جان آئی۔ انہوں نے اپنی بیوی سے کہا تم انہیں اپنے کمرے میں لے جاؤ' میں واپس ایئرپورٹ جارہا ہوں' صبح واپسی ہوگی ان کا خیال رکھنا۔

صبح ہوتے ہی میں جانے کے لیے پریشان ہوگئی' ان کی بیگم ہزار کہتی رہیں کہ نہا دھو کر تازہ دم ہولیں ناشتہ کرلیں پھر کہیں جائیں۔ لیکن میں اتنی ذہنی پریشان اور اُلجھن کا شکار تھی کہ رُکنے کو قطعی تیار نہیں ہوئی۔ دس بجے وہ صاحب ڈیوٹی سے واپس آئے تو ہم لوگ ٹیکسی میں صحیح ایڈریس پر پہنچنے کے لیے نکلے۔ میرے پاس جو ایڈریس تھا وہ بہار کالونی کا تھا۔ وہ مجھے مسان روڈ بہار کالونی لے کر پہنچے مگر وہاں اس گھر کا پتہ ہی نہیں چلا جس کی مجھے تلاش تھی۔ تلاش کرتے کرتے دو بج گئے وہ صاحب خود بھی پریشان ہوچکے تھے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ میں واپس ان کے گھر چلوں مگر میں واپس جانے کو تیار نہ ہوئی۔ میں نے ان سے التجا کی ایک بار اور کوشش کرلیں۔ جن صاحب سے آخری بار پوچھا گیا تھا انہوں نے کہا کہ یہ نمبر تو جمشید روڈ بہار کالونی کا ہے آپ وہیں جائیں۔ خیر ہم لوگ وہاں سے نکل کر جمشید روڈ پہنچے تو وہاں ایک صاحب ملے جنہوں نے ہمیں صحیح گھر تک پہنچا دیا۔ گھنٹی بجاتے ہی تین بچے باہر آئے' نہ میں انہیں پہچان سکی نہ وہ مجھے پہچان سکے۔ میں فوراً ہی بولی آپ ذرا یہیں ٹھہریں میں اندر ہوکر آتی ہوں۔ میں جب اندر گئی تو میری نند سامنے نظر آئیں ان کی اپنے بھائی یعنی میرے شوہر سے بہت مشابہت تھی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ میں صحیح جگہ پہنچ گئی ہوں۔

سامان وغیرہ اتارنے کے بعد میں نے ٹیکسی کا کرایہ دینا چاہا تو وہ کئی سو روپے بن چکا تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں اتنی مہنگائی نہ تھی۔ میرے پاس تو پاکستانی کرنسی تھی نہیں میں نے اپنی نند سے لے کر دینا چاہا تو وہ لینے پر راضی نہیں ہوئے اور اسی ٹیکسی سے واپس چلے گئے۔ شام کو جب میرے شوہر آفس سے واپس آئے تو ہم لوگوں کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے کیونکہ انہیں تو ہم لوگوں کے پروگرام کی کوئی خبر ہی نہیں تھی ٹیلی گرام میرے پہنچنے کے کئی دن بعد ملا۔ جب میں نے سارے واقعات انہیں بتائے تو انہوں نے کہا کہ میں نے تمہیں اس کالونی کے ایک اور کوارٹر کا ایڈریس بھی بھیجا تھا' جس میں ان کے کزن رہتے تھے' اور وہ بھی کسی ایئر لائن میں ملازم تھے اور ان کی ڈیوٹی بھی زیادہ تر ایئرپورٹ پر ہوتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو ضرور جانتے ہوں گے۔ لیکن میں اتنی مضمحل ہوگئی تھی کہ مجھے وہ پتا یاد ہی نہیں رہا۔ حالانکہ میں نے جہاں رات گزاری اس کے برابر والا کوارٹر اُن ہی صاحب کا تھا۔ اگر میں اپنے حواس برقرار رکھتی تو یہ سب نہ ہوتا جو ہوا...... میں اتنی بڑی خواری اور ذہنی پریشانی سے بچ جاتی۔ دوسرے ہی دن ہم لوگ ان صاحب کے گھر گئے۔ ان کا نام اب مجھے یاد نہیں شاید ان کا نام احمد تھا۔ ہمارے شوہر نے انہیں ٹیکسی کا کرایہ دینے کی بہت کوشش کی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر

انکار کر دیا کہ یہ اب میری چھوٹی بہن ہے۔ اس سے کرایہ لیتے ہوئے کچھ اچھا لگے گا کیا؟ انہوں نے میرے شوہر کی بھی بہت عزت افزائی کی۔ جب تک ہم لوگ کراچی میں رہے' برابر ان کے گھر جاتے رہے۔ ان کی فیملی سے ایک والہانہ لگاؤ سا ہو گیا تھا۔

میرے شوہر کی پوسٹنگ ڈھاکہ میں تھی لیکن وہ چھ ماہ کی ٹریننگ پر کراچی آئے ہوئے تھے جس میں کئی ماہ تو میرے پہنچنے سے پہلے ہی گزر چکے تھے۔ تقریباً تین ماہ میں اور کراچی میں رہی۔ یہ وقت ہم لوگوں نے ناظم آباد اپنے کزن کے یہاں گزارا کیونکہ نند کا گھر کافی چھوٹا تھا اور میں پورے سامان کے ساتھ گئی تھی۔ ہمارے سارے کزن ان دنوں غیر شادی شدہ تھے۔

تین ماہ بہت جلد گزر گئے۔ ایک بار میں اسلام آباد اور لاہور بھی گئی وہاں خاصی تفریح رہی۔ اب ہم لوگ ڈھاکہ جانے کی تیاری میں لگ گئے۔ جانے سے پہلے احمد بھائی سے ضرور ملے۔ ان کے بچے بھی مجھے اپنی سگی پھوپی کی طرح پیار کرتے تھے۔ ڈھاکہ پہنچ کر بھی میرا اُن سے رابطہ رہا۔ ہر عید اور نئے سال پر میں انہیں کارڈ ضرور بھیجتی۔ جب 71ء میں بنگلہ دیش بنا اور اردو بولنے والوں کا جو خون بہا تو سب سے پہلے ریڈ کراس کے ذریعے انہوں نے ہی رابطہ قائم کیا۔ وہ ہم لوگوں کی خیریت جاننے کے لیے بہت بے قرار تھے۔ اس کے بعد ان سے کوئی رابطہ نہ رہا۔ کیونکہ ہم لوگ اپنا گھر چھوڑ کر کہیں اور پناہ لیے ہوئے تھے۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں خط و کتابت کا کوئی ذریعہ نہ رہا تھا۔ اس لیے ہم دونوں ہی مجبور تھے۔

جب 72ء اگست میں ہم لوگ کراچی پہنچے تو سب سے پہلے ان سے ہی رابطہ کیا۔ ان کے گھر پہنچے تو اس کوارٹر میں کوئی اور صاحب رہ رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ریٹائر ہو چکے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے گھر کشمیر جا چکے ہیں۔ ان کی ساری فیملی بھی وہیں ہے۔ ان کا پتہ ہمیں معلوم نہیں ہو سکا۔ اس لیے وہ ہمارے رابطے میں نہیں رہے۔ انہیں پتہ نہیں ہوگا کہ ہم لوگ کہاں ہیں لیکن وہ جہاں بھی ہوں میری دلی دعا ہے کہ خوش ہوں۔ ان کے بچوں نے خوب ترقی کی ہو (آمین) دنیا میں ایسے مخلص لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو دوسروں کے لیے اتنی ہمدردی رکھتے ہوں۔ اگر وہ اس دن ہماری مدد نہ کرتے تو نہ جانے آج میں کہاں بھٹک رہی ہوتی۔

☆......☆......☆

ٹریننگ ختم ہوتے ہی ہم ڈھاکہ واپس آ گئے۔ ڈھاکہ میں میرے بڑے بھائی بھی تھے لیکن ان کی فیملی ابھی ہندوستان میں ہی تھی کیونکہ ان کے ساتھ ویزے کا مسئلہ تھا۔ ویزا ملتے ہی چھ ماہ کے اندر ان کی فیملی بھی ڈھاکہ آ گئی۔ بھائی کا گھر قریب تھا' درمیان میں صرف ایک سڑک تھی۔ ہر وقت کے یہاں آنا جانا لگا رہتا۔ ان کے دو بچے تھے۔ میرا بیٹا اب چار سال کا ہو گیا تھا۔ اس لیے ہم لوگوں نے اسے قریبی اسکول میں داخل کر دیا تھا جہاں وہ پیدل ہی چلا جاتا تھا۔ ڈھاکہ میں ماسیوں کا بڑا آرام تھا۔ وہ گھر کا ہر چھوٹا بڑا کام کر جاتی تھی۔ اس لیے میرے پاس بہت وقت ہوتا تھا۔ میری بھابی نے کالج جوائن کر لیا تھا۔ میری بھابی میری وہی ماموں زاد بہن ہے جنہوں نے میٹرک میں میری بہت مدد کی تھی۔ اگر وہ نہ ہوتیں تو میں کبھی میٹرک پاس نہیں کر سکتی تھی۔ وہ آج بھی یہی کہتی ہیں تم میری پہلی شاگرد

ہو میں آج بھی ان کی عزت کرتی ہوں۔

میں بھی چاہتی تھی کہ کچھ کام کروں۔ بڑی مشکل سے میرے شوہر نے کچھ کرنے کی اجازت دے دی اور میں نے اسی اسکول کو جوائن کر لیا جہاں میرا بیٹا پڑھتا تھا۔ اس اسکول میں میں نے کئی سال پڑھایا۔ اس دوران میری بیٹی پیدا ہو گئی۔ بھائی کی دوسری بیٹی اس سے تقریباً ایک سال بڑی ہے۔ بیٹی کی دیکھ بھال کے لیے ایک اچھی اور شریف خاتون مل گئیں۔ یہ بہت مشفق اور مخلص تھیں۔ ہمیشہ صاف ستھری اور سفید ساڑھی پہنتی تھیں۔ ان کا تعلق کلکتہ سے تھا اور صاف اردو بھی بول لیتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ان کے ماسی ہونے کا گمان بھی نہیں ہوتا تھا' بلکہ اکثر آنے جانے والے انہیں میری ساس سمجھتے تھے۔ اسکول چونکہ قریب ہی تھا اس لیے وقت بہ وقت گھر آ کر بچی کو دیکھ لیتی تھی۔ وہ بہت ایماندار خاتون تھیں۔ ان کی موجودگی میں گھر اور بچی کی طرف سے بہت مطمئن رہتی تھی۔ اسی لیے اسکول میں ملازمت جاری رکھ سکی۔

ابھی تک ہم لوگ محمد پور میں تھے اور کرائے کے مکان میں رہ رہے تھے۔ اب بھائی نے اور ہم نے پلابی میں ساتھ ہی مکان خرید لیا تھا اور جلد ہی منتقل ہونے کا ارادہ تھا۔ اس لیے بیٹے کو اس اسکول سے ہٹا کر شاہین اسکول میں داخلہ کروایا' وہاں بس کا انتظام تھا اور جب تک ہم لوگ وہاں منتقل نہیں ہوئے تھے وہ بس سے ہی آتا جاتا رہا۔ لیکن اب ہم جہاں جا رہے تھے وہ جگہ اسکول سے بہت دور تھی' وہاں اسکول کی بس بھی نہیں جاتی تھی' اس لیے طے یہ ہوا کہ اسکول اس کے ابو دفتر جاتے ہوئے چھوڑ دیں گے اور واپسی میں اسے ساتھ لے کر آئیں گے۔ وہ دو بجے تک گھر آ جاتے تھے۔ بھائی کا گھر قریب ہی تھا جو ہم سے پہلے پلابی میں منتقل ہو چکے تھے۔

پلابی میں میرے شوہر کے کئی رشتہ دار رہ رہے تھے۔ اور بھی کئی لوگوں نے جو ہمارے جاننے والے تھے وہاں اپنا گھر بنا لیا تھا۔ پلابی نئی جگہ تھی' نئی نئی آبادی بسی تھی' اچھی اور صاف ستھری جگہ تھی' گھر کے آگے بڑا سا کمپاؤنڈ تھا جس میں ہم لوگوں نے قسم قسم کے پھول پودے لگائے تھے۔ ایک ہی ڈیزائن کے کئی کیٹگری کے مکانات تھے۔ دو بیڈ روم' ایک ڈرائنگ روم اور چھوٹا سا لاؤنج تھا' صحن بہت بڑا تھا' جس میں میں نے بہت سارے پھل دار درخت لگائے تھے۔

میرے گھر کے سامنے ایک بڑا سا پارک تھا۔ جہاں جھولے وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ وہاں شام کے وقت چھوٹے بچوں کا ہجوم ہوتا۔ کافی پُر رونق جگہ تھی' بچوں کے ساتھ ہم یہاں آ کر بہت خوش تھے۔ خوشی کی بات یہ بھی تھی کہ یہاں زیادہ تر اردو بولنے والے لوگ آباد تھے۔ لیکن بنگلہ بولنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ اگرچہ ان سے ہمارا زیادہ میل جول نہ تھا مگر اس کی وجہ صرف زبان سے ناواقفیت تھی۔ دوسری طرف مقامی لوگوں کی جھجک بھی تھی۔ پتہ نہیں کیوں ایسا محسوس ہوتا تھا شاید وہ ہم سے احساس کمتری میں مبتلا تھے' حالانکہ اس میں نفرت یا دشمنی کا جذبہ قطعی شامل نہیں تھا۔ بنگال میں رہ کر ایک بات اور جو میری سمجھ میں آئی وہ یہ تھی کہ بنگالیوں کو اپنی مادری زبان یعنی بنگلہ سے والہانہ عشق تھا۔ وہ اپنی زبان پر کسی دوسری زبان کی برتری کسی حال میں بھی تسلیم نہیں کرتے تھے۔ بنگال میں کامیاب زندگی گزارنے کا صرف ایک ہی گر تھا کہ بنگالی زبان سیکھی جائے اور بنگالیوں سے بنگلہ میں بات کی

جائے تو وہ آپ کے گرویدہ ہو جائیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ اِدھر کے لوگ بنگالیوں کو صحیح طور پر سمجھ ہی نہیں سکے۔ اِدھر چوہدری، ملک اور وڈیرہ سائیں اور پیر صاحب کے ٹکڑوں پر پلنے والے ہم اور ہمارے ماں باپ جیسے لوگوں سے بھی بزور ووٹ لے سکتے تھے۔ اس لیے کہ یہ ان کے مزارع اور ارادت مند ہوتے ہیں، مگر اِدھر کا عام آدمی ایسا نہیں تھا۔ میں جب تک وہاں رہی وہاں کے عام لوگوں کو نفرت ہی کرتے ہوئے پایا۔ ان کی محرومیوں سے پھوٹنے والی یہی وہ نفرت تھی جس نے ملک کے دونوں حصوں میں ایک خلیج قائم کردی تھی۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ہمارے لیے وہ نفرت بجا تھی یا بے جا، یقیناً وہ صد فیصد درست نہیں تھی۔ ہمارے دشمنوں نے بھی انہیں بھڑکا رکھا تھا مگر یہ بھی صحیح ہے کہ اس نفرت کو ہم نے خود ہی تیل ڈال کر بھڑکایا تھا۔ جن کے دل محبت سے جیتے جاسکتے تھے ان کے لیے ہماری بندوقوں میں گولیوں کے تحفے تھے۔ جو لوگ بنگال میں رہ چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ پاکستان کے لوگوں کے لیے بنگالیوں کے دل میں کس قدر جوش اور ولولہ تھا مگر آخر ایسا کیا ہوا اور کیوں ہوا کہ اُن کے اور اردو بولنے والوں کے درمیان خلیج پیدا ہوگئی۔

70ء کے شروع میں ہی ہم لوگ پلابی منتقل ہو چکے تھے اور زندگی خاصے خوشگوار خطوط پر گزر رہی تھی۔ مجھے پھولوں اور پیڑ پودوں کا ہمیشہ سے شوق رہا ہے لہٰذا میں نے صحن میں قسم قسم کے پھول اور پھل دینے والے پیڑ لگائے۔ اسکول سے آنے کے بعد میں زیادہ تر باغبانی میں لگ جاتی، بہت سے پودے تو میں نے ہندوستان سے منگوائے تھے جو یہاں خاصے مہنگے تھے، اور اسی قبیل کے کچھ اور بھی پودے میں نے ہندوستان سے منگوائے تھے۔

یہاں منتقل ہونے کے کچھ عرصہ بعد میں نے اسکول چھوڑ دیا اور ڈھاکہ یونیورسٹی جوائن کرلی تاکہ اپنی تعلیم مکمل کرسکوں۔ میری ہر ترقی کو میرے شوہر اپنی ترقی سمجھتے تھے، پڑھنے کے لیے انہوں نے مجھے آزادی دے رکھی تھی۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ میں زیادہ سے زیادہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکوں۔ حالانکہ بچی ابھی چھوٹی تھی مگر وہی بوا جواب تک میرے ساتھ تھیں میری بچی کی نگہداشت کرتی تھیں اور میں ان سے بہت مطمئن تھی۔ یونیورسٹی جہاں میں رہتی تھی وہاں سے کافی دور تھی، دو بسیں بدل کر وہاں پہنچتی تھی ٹرانسپورٹ کا وہاں بڑا اچھا انتظام تھا، ڈبل ڈیکر بس ہمارے گھر کے قریب ہی سے چلتی تھی اور اس کا آخری اسٹاپ قریب ہی تھا۔ آخری اسٹاپ ہونے کی وجہ سے بس میں رش نہیں ہوتا تھا، ویسے بھی عورتوں کے لیے سیٹ مخصوص تھی اور خالی ہونے پر بھی کسی مرد کو بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ میں نے ایم ایڈ میں ڈائریکٹ داخلہ لیا تھا کیونکہ وہاں بی ایڈ کا کورس تھا ہی نہیں۔ کلاسز سیمسٹر سسٹم کے تحت ہوتی تھیں اور ہر تین ماہ بعد نیا سیمسٹر شروع ہوجاتا تھا۔ کتابیں لائبریری سے دستیاب ہوجاتی تھیں، خریدنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی بلکہ ہر ماہ یونیورسٹی سے 70 روپیہ اسٹائپنڈ کے طور مل جاتا تھا۔ میں باقاعدگی سے کلاسز اٹینڈ کررہی تھی۔ اس طرح ایک سال گزر گیا اور 71ء کا سال شروع ہوگیا۔ زندگی بہتر طور پر گزر رہی تھی اور سب کچھ بہتر ہی طور سے چل رہا تھا لیکن وہ سیاسی طوفان جس کی زد میں ملک کا یہ حصہ آگیا تھا اب اپنے شباب پر تھا۔ اس کے لگائے ہوئے سیاسی اور معاشی پودے پوری طرح جڑ پکڑ چکے تھے۔ اردو

سے سیاسی نفرت بڑھتی جارہی تھی۔ اب کسی بھی دوکان پر سائن بورڈ اردو میں لکھا ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہاں کا نوجوان طبقہ اسی ماحول میں پروان چڑھ رہا تھا۔ یہ معاشرہ جیسا بھی تھا اچھا یا برا، ہمارے معاشرے سے یکسر مختلف تھا۔ ان کی نظر میں ان کی ہر کوتاہی کی ذمہ داری اس غیر مساوی سلوک پر تھی جو مغربی پاکستان نے اس حصہ کے ساتھ روا رکھی تھی، ان کا خیال کچھ حد تک صحیح بھی تھا۔ اس امنڈتے طوفان نے کیا کچھ تباہ کر ڈالا، اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب اس کی شدت میں کمی ہوئی۔ یہ سوال ہر ہوش مند کے ذہن میں آتا تھا کہ آخر ان کی غیر اطمینانی اور انتشار کا باعث کیا ہے۔ میرے ذہن میں اس کا جواب کچھ یوں لگتا ہے کہ بنگالی سیاسی طور پر ہمیشہ ہی بیدار رہے ہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں بھی بغاوت نے اسی سرزمین سے سر ابھارا تھا اور تحریک پاکستان کی مخلصانہ حمایت بھی اسی حصے کے ساتھ ہوئی تھی۔

یونیورسٹی جوائن کرنے کے دوران میں نے چند خاص باتیں نوٹ کیں وہ یہ کہ کلاس میں چند اردو بولنے والے لڑکوں کے علاوہ باقی سارے طالب علم بنگلہ ہی بولتے تھے۔ لڑکیوں میں واحد اردو بولنے والی میں ہی تھی۔ ہمارے گروپ میں اردو بولنے والے لڑکوں کے علاوہ چند بنگالی لڑکے اور لڑکیاں بھی تھیں۔ بظاہر وہ ہمارے دوست تھے مگر کبھی اردو بولنے والے لڑکوں میں سے کوئی بھی اگر ملکی صورتحال پر کچھ بول جاتا تو بنگالی لڑکے اور لڑکیوں کا لہجہ بدل جاتا اور ان کے لہجے تلخ ہوجاتے۔ ان کی طرف سے محرومیوں کی ایک طویل فہرست سامنے رکھ دی جاتی اور یہ سوال کیا جاتا کہ کیا یہ بھی دشمنوں کی سازش تھی؟ میں ڈر جاتی اور ہم سب دم سادھ لیتے۔ ان کا یہ کہنا کہ جسے تم لوگ ہمارا بنگلہ بندھو کہہ رہے ہو، اس کی پارٹی الیکشن میں بھاری اکثریت سے جیتی ہے، جب ادھر کے لوگوں کو جیتنے کے بعد بھی اقتدار سے محروم رکھا جائے تو بنگالیوں کو جن کی یہ دھرتی ہے، باغی ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

مشرقی پاکستان میں تعلیم مجموعی طور پر ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھی۔ خاص طور پر دیہی علاقوں میں...... اور وہ ملک کی یکجہتی کی بنیادیں آہستہ آہستہ کھرچ رہے تھے۔ بڑے شہروں میں اسکول اور کالجوں میں مسلمان ٹیچر اور پروفیسر کافی تھے لیکن چھوٹے علاقوں میں تعلیم کا دارو مدار زیادہ تر ہندو اساتذہ کے ہاتھ میں تھا۔ گاؤں میں تعلیم کی باگ ڈور زیادہ تر انہوں نے ہی سنبھال رکھی تھی۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں بچوں کے ذہن پر کیسے اثرات پڑسکتے تھے۔ مسلمان اس کے دباؤ میں تھے کیونکہ تعلیم میں ان سے پیچھے تھے اور اسی لیے محکوم بھی......

بنگالیوں کی طرف سے مادری زبان کے لیے چلائی جانے والی تحریک اس قدر بھرپور تھی کہ مغربی پاکستان کی حکومت بری طرح ہل گئی اور پھر اسے سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ آخر کار بنگالیوں نے کچھ بیرونی شرپسندوں کی مدد سے نیا روپ اختیار کرلیا۔ زبان کے نام پر چلائی جانے والی یہ تحریک، کچھ اپنوں کی غفلت اور غیروں کی چال بازیوں سے ملک کو توڑنے کا سبب بن گئی۔ سقوط ڈھاکہ انسانی تاریخ کا ایک دردناک واقعہ ہے، جب ہم اس کی وجوہات تلاش کرتے ہیں تو دیگر بے شمار باتوں کے علاوہ یہ صاف نظر آتا ہے کہ اس کی ایک خاص وجہ بنگالی عوام کو نظر انداز کرنا تھا۔ میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا دل کانپ گیا

اور سوچنے سمجھنے کی تاب نہ رہی۔

حالات سے میں اس قدر دلبرداشتہ ہوئی کہ ہندوستان جانے کے بارے میں سوچنے لگی۔ میرے شوہر نے بہت سمجھایا' منع بھی کیا مگر میں اڑی رہی' مجھے اپنے لوگ یاد آنے لگے' ماں باپ' رشتے ناطے' دوست و احباب گویا میں بے قرار ہوگئی اور آخر کار میں نے اپنے شوہر کو منا ہی لیا۔ سفر کے دوران میں سوچتی رہی' عزیزوں دوستوں کی محبت اور خلوص کا سرچشمہ میرے وجود کو سرشار کیے ہوئے تھا' میں سوچتی کیوں ہندوستان کی سرزمین کے لیے دل اتنا بے قرار ہے' جہاں سیاسی طور پر میں ایک غیر ملکی ہوں۔ شاید جس طرح خون کا رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا اسی طرح دھرتی کا رشتہ بھی اٹوٹ ہوتا ہے۔ اپنے پیدائشی وطن سے وہاں کی تہذیب و ثقافت سے تعلق رکھنے والوں کا جذباتی لگاؤ ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی کشش اب بھی میرے اندر باقی ہے سو جب بھی میں ہندوستان جاتی ہوں تو دلی پہنچتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ مٹی جس پر میں چل رہی ہوں۔ میری اپنی ہے لیکن بھلا جب اس سرزمین پر میرا کوئی حق ہی نہیں تو پھر یہ مٹی میری کیسے ہو سکتی ہے؟ خیر یہ تو سیاسی بکھیڑے کی باتیں ہیں۔ میں نے اور میرے جیسے بہتوں نے اسی مٹی میں جنم لیا مگر حالات کی پکار پر وہ پاکستان آ بسے' لیکن دل تو اتھاہ سمندر ہے نیا رشتہ قائم کرنے سے پرانا بندھن ٹوٹ تھوڑے ہی جاتا ہے۔ میرے ہندوستانی دوست جو مذہب' نسل کے تعصب سے بالاتر ہندو اور مسلمان دونوں ہی ہیں' جو میرے لیے غیر ملکی ہوتے ہوئے بھی میرے بہت ہی اپنے ہیں' ان سے میں ملنے آ گئی۔ جس مٹی نے مجھے جنم دیا' سہاگ بخشا آج پھر میں اسی دھرتی پر قدم رکھنے آ گئی۔ لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ مجھے لیا جہاں بھی گئی جس سے بھی ملی سب نے بچھڑا ہوا عزیز سمجھ کر گلے لگا لیا۔ اس میں ہندو' مسلمان' سکھ عیسائی کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ پاکستان آنے کے بعد پہلی بار ہوائی جہاز سے ہندوستان گئی۔ ڈھاکہ سے تو کلکتہ کا سفر طویل نہیں تھا۔66ء میں کراچی 71ء میں ہندوستان چھوڑے ہوئے ابھی سال ہی گزرا تھا۔ اپنوں کے پاس کیا کیفیت ہوگئی بیان نہیں کر سکتی۔ کلکتہ سے ٹرین پکڑ کر ہم دوسرے دن رانچی پہنچے تھے۔ اس لفظ رانچی میں کیا چاشنی ہے اسے بھی بھول نہیں پاتی۔ یہاں کی جگہوں' سڑکوں اور بازاروں کا مقابلہ بڑے بڑے شہروں سے کیا مگر میری نظر میں بازی رانچی ہی کی رہی۔

ایک جانب تو ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت اور سیکولر حکومت ہے جو دنیا کے صنعتی ممالک میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے دوسری طرف بھوک' غریبی اور بے روزگاری کے رونگٹے کھڑے کردینے والے حقائق سامنے نظر آئے۔ دسمبر جنوری کے کڑاکے کی سردیوں میں کثیر آبادی ایسی دیکھنے میں آئی جن کے جسم پر بنیان اور دھوتی کے نام پر چیتھڑوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ یہ لوگ بھیک مانگنے والے بھی نہ تھے بلکہ محنت کش افراد تھے۔ فٹ پاتھ پر نسل در نسل زندگی بسر کرنے والوں کی آبادی کا شمار مشکل ہے۔

ایک سال ہی گزرا تھا کہ گھر والوں کی یادیں دوبارہ دل میں گھر کرنے لگیں۔ پہلی آواز تو کانوں میں اذان کی ڈالی گئی ہوگی دوسری آواز جو کانوں میں رس گھولتی رہی اور دل کی دھڑکنیں بڑھاتی رہی وہ یہ تھی کہ ہم ہندوستانی ہیں اور یہ ہمارا مادرِ وطن ہے۔ بھلا جہاں ماں کا نام یا حوالہ

آ جائے وہاں عقیدت کا جذبہ اور ممتا کا جوش کیوں نہیں جاگے گا۔ مگر آدمی بھی بڑا مفاد پرست اور بے وفا ہے' وہ ماں کے ساتھ بھی فریب کرسکتا ہے۔ پاکستان بنایا گیا تو کوئی نہیں جانتا تھا کہ مسلمان ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیل کر غازی بنے پھریں گے۔ خود ایک دوسرے کو قتل کر کے امریکہ سے گلے کریں کہ مسلمان عورتوں کی حرمت بچانے کی اسے فکر نہیں ہے۔ اب ہندوستان ہمارا وطن نہ ہو' ہم اس کے شہری ہوں نہ ہوں مگر یہ ہماری جنم بھومی تو ہمیشہ رہے گی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح ناخلف اولاد اور والدین کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا اسی طرح انسان کا رشتہ بھی اس مٹی سے کبھی نہیں ٹوٹتا جہاں پیدا ہوا ہو۔

☆......☆......☆

میں نے اپنا تمام سمسٹر مکمل کرلیا تھا صرف پریکٹس ٹیچنگ باقی رہ گئی تھی۔ اس دن لائبریری میں نوٹس تیار کررہی تھی کہ اچانک محسوس ہوا کہ لائبریری تقریباً خالی ہو چکی ہے۔ میں کام میں ایسی مگن تھی کہ مجھے اندازہ ہی نہ ہوا کہ سارے لوگ جاچکے ہیں۔ اچانک ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ قدوائی صاحب جو اردو بولنے والے تھے لائبریری میں آئے اور مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے اور کہا کہ آپ ابھی تک گھر نہیں گئیں۔ آپ کو پتہ نہیں کہ شہر میں کس قدر ہنگامے ہورہے ہیں۔ بس وغیرہ سب بند ہو چکی ہیں۔ اب آپ کس طرح گھر جائیں گی میں ایک دم سے گھبرا گئی۔ جلدی جلدی کتابیں وغیرہ سمیٹ کر باہر آ گئی۔ بس اسٹاپ پر چند ایک بنگالی لڑکوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ لوگ بھی بس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ وہ لڑکے میرے کلاس فیلو ہی تھے۔ مجھے دیکھ کر حیران ہوگئے۔ بس کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ اگر کبھی کوئی آ بھی جاتی تو اس میں جگہ نہ ہوتی۔ وہ لڑکے بھی ہماری وجہ سے پریشان تھے لیکن مجھے دلاسہ بھی دے رہے تھے کہ آپ گھبرائیں نہیں ہم کسی نہ کسی طرح آپ کو گھر ضرور پہنچائیں گے۔ بہت دیر کے بعد ایک ڈبل ڈیکر بس آئی جس میں جگہ بالکل نہ تھی مگر ان لڑکوں نے مجھے کسی نہ کسی طرح بس پر چڑھا ہی دیا اور ڈرائیور سے کہا یہ جہاں اترنا چاہیں اتار دینا۔ غالباً ڈرائیور ان کا جاننے والا تھا۔ اس دن پہلی بار میں نے دیکھا کہ عورتوں کی سیٹ پر سارے مرد حضرات بیٹھے تھے۔ پچھلے حصے میں جو لوگ تھے ان سب کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے اور وہ جئے بنگلہ کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں ایک کونے میں سمٹی سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ چونکہ میں نے ساڑھی پہنی تھی اس لیے کسی نے میری طرف توجہ نہ دی۔ مجھے محمد پور میں اترنا تھا کیونکہ مجھے دوسری بس وہیں سے ملتی جو میرپور جاتی' وہاں سے بس میں کوئی بنگالی سوار نہیں ہوا۔ گھر میں پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی لیکن ابھی تک میرا بچہ اور شوہر گھر نہیں پہنچے تھے۔ ان دنوں موبائل کا دور بھی نہ تھا رابطہ کرتی بھی تو کیسے کرتی۔ بھائی اور بچے گھر آ چکے تھے میں گھبراہٹ میں کبھی باہر جاتی کبھی اندر آتی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے مدد کو پکاروں خدا خدا کر کے رات ہونے سے قبل ہی وہ گھر واپس آ گئے۔ اس دن بیٹے کے اسکول میں اسپورٹس تھا اس میں اس نے بھی حصہ لیا تھا اسی لیے بچے کو گھر آنے میں تاخیر ہوئی۔ میری یونیورسٹی کا وہ آخری دن تھا اس کے بعد میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔

جب الیکشن کا سلسلہ 1970ء میں زوروں پر تھا بنگال میں مسلم لیگ کے خلاف نعرہ لگا کر عوامی

لیگ کے ٹکٹ پر جو شخص کھڑا ہو جاتا اسے ووٹ ملنا یقینی تھا۔ انہی دنوں مشرقی بنگال میں سیلاب آ گیا۔ وہ سیلاب ایسا تھا کہ پورے ملک کو اس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور بنگال کو آفت زدہ علاقہ قرار دے دیا گیا۔ مرکزی حکومت کی طرف سے بھاری رقم اور امدادی اشیاء بھیجی گئیں' لیکن مجیب الرحمٰن نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا۔ وہ جگہ جگہ گئے اور ہر جگہ جلوس اکٹھا کیا شعلہ بار تقریریں کیں اور بنگالیوں کی بے بسی کا اظہار ایسے جذباتی انداز میں کیا کہ مجیب الرحمٰن کا جادو چل گیا۔ اس کے سحر میں مشرقی پاکستان کے لوگ ایسے مسحور ہوئے کہ وہاں کے ہر گوشے سے بونگو بندھو نجات دہندہ بن کر ابھر آئے۔ اس کے بعد کے سیاسی حالات کسی وضاحت کے محتاج نہیں۔

غیروں نے کیا کیا جال بچھائے اور انہوں نے نہ جانے کس حد تک غلطیاں کیں یہ تو کوئی سیاسی شخصیت ہی بہتر طور پر بتا سکتی ہے۔ پھر یہ ہوا کہ مارچ کی پہلی تاریخ کو جمعہ کے دن بیت المکرم مسجد کے احاطے میں جمعہ کی نماز کے بعد مجیب الرحمٰن نے دھواں دار تقریر کی۔ لوگ بتاتے ہیں کہ اس اجتماع میں اتنے زیادہ لوگ تھے کہ صرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ اور جذبات کا یہ عالم تھا کہ قائداعظم کے پاکستان بننے کے بعد پہلی بار ایسا ہوا کہ اس احاطے میں قدم رکھنے کو تل بھر جگہ نہ بچی۔ اس جلسے میں مجیب الرحمٰن نے اپنے منشور کا اعلان کیا جس میں واضح طور پر مغربی پاکستان سے علیحدگی کا ذکر تھا' جگہ جگہ پاکستان کے جھنڈے کی بے حرمتی کی گئی۔ وہی لوگ جو پاکستان میں بنانے میں پیش پیش تھے اس کی تخریب کاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔

بنگالیوں کو اس حد تک احساس کمتری میں مبتلا کر دیا گیا تھا جیسے وہ کوئی بوجھ ہوں۔

ان کی ذہانت اور اعلیٰ تعلیمی صلاحیت کو مثبت پہلو سے دیکھنے کے بجائے انہیں تخریب کار کہا گیا۔ کہا جاتا تھا کہ چھوٹے چھوٹے دبلے پتلے بنگالی فتنہ ہیں۔ ذہانت اور اعلیٰ تعلیمی معیار کو جب فتنہ کہا جائے تو معاشرہ فساد سے بچ نہیں سکتا۔ بنگالی اپنی زبان اور کلچر سے بے حد پیار کرتے تھے مگر مغربی پاکستان بھائی جو اہم عہدوں پر فائز تھے انہوں نے بنگال کی کلچرل سادگی کو ہمیشہ اجڈ اور گنوار پن سے تشبیہ دی۔ اس طرح نفرت اور حقارت سے پیدا کی گئی خلیج نے دونوں حصوں کو ایک دوسرے کے قریب نہ آنے دیا۔ پاکستان کے دشمن جو بظاہر دب گئے تھے اندر ہی اندر پاکستان کی جڑیں کاٹ رہے تھے۔ وہ عوام کے غیر مطمئن جذبات کو بھڑکاتے رہے مگر اس کی صحیح اطلاع اور صحیح پوزیشن حکومت کو کبھی نہ مل سکی۔ 1965ء میں پاک بھارت جنگ کے دوران مشرقی پاکستان کی حفاظت کی شاید کوئی تدبیر نہیں کی گئی۔ اکثر بنگالیوں کو یہ کہتے سنا گیا کہ جنگ کے دوران ان کو حفاظت نہیں مل سکی تو اس سے انہیں کیا فائدہ؟ اس بات نے بنگالی اور مغربی پاکستانی فوجیوں میں تفریق پیدا کر دی۔ ملک میں دشمن عناصر نہایت عیاری سے پاکستان کو تباہ اور علیحدہ کرنے کے منصوبہ بنا رہے تھے۔ انہوں نے مشرقی پاکستانیوں کے دلوں میں نفرت تو بھڑکا ہی دی تھی مگر جانتے تھے کہ مسلح فوج کی موجودگی میں عوام کی بغاوت ممکن نہ ہوگی لہٰذا انہوں نے مسلح بنگالی فوج کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ اس طرح مشرقی فوج میں بغاوت شروع ہوئی۔ مشرقی فوج کی تربیت اس طرح ہوئی تھی کہ انہیں مثالی کہا جاتا تھا

تعجب کی بات یہ ہے کہ بغاوت کرنے والے کوئی غیر نہ تھے بلکہ اپنی ہی فوج کے بہادر اور باوردی سپاہی تھے۔

زخم اپنوں ہی نے لگائے تھے' بغاوت ایسٹ بنگال رجمنٹ اور پاکستان رائفلز ہی سے شروع ہوئی' پھر جو قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا تو زمانہ قدیم کے ظالمانہ قصے ماند پڑ گئے۔ اب ہر طرف آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی صدر پاکستان ایک مختصر دورے پر مشرقی پاکستان آئے۔ مجیب الرحمٰن سے بات چیت ہوئی مگر کوئی بات نہ بنی اور 25 مارچ کو ایکشن لے لیا گیا۔ ہم لوگ گھروں میں بیٹھ کر تبصرہ کر رہے تھے کہ ایکشن صحیح ہے یا غلط جس کے منہ میں جو آتا بولتا۔ مگر ہم نے آخر یہ کیوں نہیں سوچا کہ مار دھاڑ سے دشمن ملک کو تو فتح کیا جا سکتا ہے مگر اپنے قومی مسائل کبھی حل نہیں ہو سکتے۔ ان دنوں بنگالیوں کی بربریت کے قصے عام تھے۔ ڈھاکہ کو چھوڑ کر ہر جگہ اردو بولنے والوں کا قتل عام ہو رہا تھا۔ یہ سفاکانہ کارروائیاں زیادہ تر ایسٹ پاکستان رائفلز (E P R) اور ایسٹ بنگال رجمنٹ کے مسلح بھیڑیوں نے کی تھیں۔ دیہی علاقوں میں رہنے والے جو وہاں سے کسی وجہ سے نہیں نکل سکے ان کے ساتھ بڑا ہی بے رحمانہ سلوک کیا گیا اور انہیں بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔

چنانچہ جب ایسٹ بنگال کے فوجی ایک علاقے کے ایس ڈی او کو مارنے لگے تو مقامی لوگ اُن کی مدد کو آ گئے اور کہا کہ ہم انہیں مارنے نہیں دیں گے کیونکہ یہ بہت اچھے انسان ہیں تو پھر بلوائی انہیں محفوظ مقام پر پہنچانے کے بہانے ساتھ لے گئے لیکن کچھ ہی دور جانے کے بعد انہوں نے شوہر اور حاملہ بیوی کو قتل کر دیا۔

ہمارے ایک اور جاننے والے جو راج شاہی میں چیف انجینئر تھے ان کی تین چھوٹی چھوٹی بچیاں تھیں اور دو جوان سالے سالی ہندوستان سے ان سے ملنے آئے تھے سب کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ چھوٹی بچیاں تو وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ ایسا بھی سنا گیا کہ بند کمرے میں جوان اور معصوم جسموں سے سرنج کے ذریعے سارا خون نکال کر بڑی بے دردی سے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بعض علاقوں میں تو باقاعدہ مذبح بنائے گئے تھے جہاں بے گناہ مظلوم بوڑھے' جوان' بچے بچیاں' مرد اور عورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح قتل کیے جا رہے تھے۔

میمن سنگھ میں تو بلوائیوں نے ایک مرد کو بھی نہیں چھوڑا' چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی انہوں نے نہیں بخشا' ماں کی گود سے چھین کر ماں کی نظروں کے سامنے انہیں قتل کر دیا گیا۔ بس اب کچھ عورتیں ہی زندہ بچی تھیں اپنے چہیتوں کا ماتم کرنے کے لیے' کھلنا میں میری ایک سہیلی کے میاں بڑے تاجر تھے دولت ان کے گھر کی باندی تھی' کئی ہزار گز میں بنی اُن کی عالیشان کوٹھی ہی ان کی اپنی دنیا تھی۔ کوٹھی کیا تھی ایک بڑا فارم ہاؤس کہہ لیجیے۔ کمپاؤنڈ کے اندر طرح طرح کے پھلوں کا باغ تھا۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی بے شمار خادم ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔ جب فسادات شروع ہوئے تو ان لوگوں نے سوچا کہ بال بچوں کے ساتھ کہیں اور جا کر پناہ لے لیتے ہیں۔ حالات درست ہوتے ہی واپس آ جائیں گے۔ انہیں کیا پتا تھا کہ کبھی لوٹ کر آنا نصیب نہ ہوگا۔ اس دن کھلنا' دیناپور' پاربتی پور اور سنتھار کے علاقوں میں بھی بے گناہ مظلوموں کا اتنا خون بہایا گیا کہ خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ تاجر اور

ان کا کنبہ بھی انہی شہیدوں میں شامل تھا۔ مارکاٹ اور لوٹ مچی ہوئی تھی۔ جیسے ہی یہ خبر عام ہوئی کہ مکتی باہنی کا حملہ ہونے والا ہے' میری سہیلی اور اس کے گھر والے رات کے اندھیرے میں نکلنے کو تیار ہوگئے۔ وقت بہت کم تھا جئے بنگلہ اور آمار سونار بنگلہ کے نعروں سے آسمان گونج اٹھا' جیسے ہی کہیں پناہ لینے کے لیے رات کے اندھیرے میں وہ لوگ گھر سے باہر نکلے ان کے گھر کے پرانے ملازم نے کچھ بنگالیوں کے ساتھ مل کر یہ گھناؤنی سازش رچائی کہ انہیں گھر سے نکلنے سے پہلے ہی پکڑلیا گیا۔ سازشیوں نے تمام کنبے کو بال بچوں سمیت بڑی بے دردی سے قتل کردیا۔

اس سرزمین پر جس کا نام مشرقی پاکستان تھا خون کے وہ دریا بہے کہ چشم فلک بھی حیران تھی۔ دوسری اجناس نایاب تھیں مگر انسانی گوشت و پوست ہر جگہ بکھرا پڑا تھا' ہر چوک ایک مقتل تھا' چنگیز ہلاکو اور نادر شاہ درانی بھی ان خونی مناظر کو دیکھتے تو حیران و ششدر رہ جاتے۔ سنتھار میں میرے جیٹھ اپنی فیملی کے ساتھ حال ہی میں منتقل ہوئے تھے۔ اس سے قبل وہ اپنے بچوں کے ساتھ ڈھاکہ میں مقیم تھے' جاتے وقت انہوں نے اپنے نواسے نواسی اور ایک پوتی کو بھی ساتھ لے لیا تھا' سارے بچے تقریباً دس بارہ سال کے تھے۔ ان کا ایک بھانجا جو چودہ پندرہ سال کا تھا وہ بھی ساتھ چلا گیا تھا۔ یہ سب اس لیے ہوا تھا کہ انہیں ایک ہائی اسکول میں پرنسپل کی آفر ملی تھی اور وہیں وہ جوائن کرنے جارہے تھے۔ عید بھی آنے ہی والی تھی۔ ان کا ایک بیٹا بھی جو کھلنا میں پڑھ رہا تھا' جب وہاں کے حالات خراب ہونے لگے تو وہ بھی اپنے والدین کے پاس سنتھار آ گیا۔ جس ٹرین سے وہ آیا وہ آخری ٹرین تھی پھر نہ کوئی ٹرین آئی نہ گئی' راستہ ہر طرف سے بند کردیا گیا۔ سب لوگ اس علاقے میں قیدیوں کی طرح رہنے لگے۔ وہاں کی آبادی پچیس ہزار سے کچھ زیادہ ہی تھی ان میں زیادہ تر ریلوے کے ملازمین تھے۔ پہلے تو مکتی باہنی کے لوگ آتے اور ہزاروں کو قتل کرکے چلے جاتے۔ قتل ہونے والوں میں زیادہ تر نوجوان ہوتے۔ انہوں نے ہفتہ کا دن مقرر کررکھا تھا آخری ہفتہ جو غالباً 17 اپریل تھا وہ لوگ آئے تو وہاں کے لوگ اپنی جان بچانے کے لیے اسٹیشن پر جمع تھے کچھ لوگ کسی قریبی کوارٹر میں' کچھ ریل کے ڈبے میں اور کچھ گٹر وغیرہ میں جان بچانے کی خاطر چھپے تھے' کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں تھا۔ ہفتہ کا دن شروع ہوتے ہی مکتی باہنی کا جلوس پھر آیا اور بلاامتیاز لوگوں کو قتل کرنا شروع کیا' بوڑھے مرد عورتوں اور بچوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ ہمارے جیٹھ کا بیٹا جو کھلنا سے آیا تھا اس کے سر پر ایسا مارا کہ وہ بے ہوش ہوکر گر پڑا مگر وہ اس کو مردہ سمجھ کر آگے بڑھ گئے اس کے بعد انہوں نے پوری آبادی کو ختم کردیا۔ اور جب انہیں یقین ہوگیا کہ اب کوئی زندہ نہیں بچا تو وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ میرے جیٹھ کے بچے کو جب ہوش آیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے آس پاس اردگرد اوپر نیچے جہاں بھی نظریں دوڑائیں لاشیں ہی لاشیں بچھی تھیں۔ اس کے والدین اور رشتہ دار بچوں کی لاشیں بھی آس پاس پڑی تھیں۔ ان بچوں میں ایک بچہ جو اس کا ہم عمر ہی تھا قسمت سے بچ گیا تھا دونوں کسی نہ کسی بھاگتے بھاگتے ایک گاؤں میں پہنچے وہاں کے لوگوں نے ان کی مدد کی' ان کا علاج کرایا انہیں مسجد میں ٹھہرایا اور اس وقت تک ان کی خدمت کرتے رہے جب تک کہ دونوں بچے

پوری طرح صحت یاب نہ ہوگئے۔

ہمارا ایک اور جاننے والے محمد ضیاء الدین اپنی بیٹی داماد اور نواسی اور اپنی بیگم کے ساتھ جوگی نگر لائن میں رہتے تھے۔ ضیاء الدین صاحب انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بینک آف پاکستان میں بحیثیت اسٹینوگرافر کام کررہے تھے۔ ان کی ڈیکوریشن کی دو دکانیں' ایک A B C روڈ پر اور دوسری قائداعظم روڈ پر تھیں۔ یہ کاروبار وہ اپنے داماد کے ساتھ مل کر کرتے تھے جو قائداعظم کالج میں ایوننگ شفٹ کے طالب علم تھے۔ ضیاء الدین صاحب مسلم لیگ کے خواجہ خیر الدین صاحب کے سیکریٹری تھے' ووٹر لسٹ بنانا انہی کے ذمہ تھا۔ عوامی لیگ سے ان کی دشمنی چل رہی تھی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ یہ صاحب اپنے گھر سے سامان لینے کو نکلے' کسی دشمن کی ان پر نظر پڑ گئی بس پھر چھرے کے وار سے اس نے انہیں زخمی کردیا۔ کسی ہمدرد نے انہیں ان کے گھر کے دروازے پر لاکر چھوڑ دیا۔ صبح کے وقت جب گھر والوں نے دروازہ کھولا تو انہیں بہت بری حالت میں دیکھا' مگر انہوں نے اپنے گھر والوں سے کہا۔

''گھبراؤ مت میں انشاء اللہ مروں گا نہیں۔''

اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے ان کی دعا سن لی اور ان کا انتقال بنگلہ دیش بننے کے 26 سال کے بعد ہوا۔ 1973ء میں جب شیخ مجیب الرحمٰن بنگلہ دیش پہنچے تو ان دنوں یہ لوگ دلال کے ذریعے وہاں سے ست کھیرا ندی کے راستے رات بھر پیدل سفر کرکے بان پور پہنچے اور وہاں سے ٹرین پکڑ کر ہندوستان پہنچے۔ ایسے نہ جانے کتنے واقعات ہیں جن کا احاطہ کرنا آسان نہیں۔

مئی میں جگہ جگہ پوسٹر لگا دیے گئے کہ ڈھاکہ خالی کردیا جائے اور کوئی بنگالی سرکاری ملازم دفتر نہ جائے کیونکہ ہم لوگ ڈھاکہ پر حملہ کرنے والے ہیں اور موجودہ سرکار کے ساتھ تعاون کرنے والے کو سزائے موت دی جائے گی۔ یہ حربہ خاصا کارگر رہا اور بہت سے بنگالی اپنی فیملی کے ساتھ دیہی علاقوں میں چلے گئے۔ مئی سے جولائی تک ڈھاکہ کی زندگی خاصی نارمل رہی تھی مگر جولائی کے آخری ہفتہ میں پھر وہی پوسٹر لگنے لگے۔ عوام قتل و غارت سے ہراساں ہوجاتے تھے۔ ایسے حالات نے ان کے حوصلے پست کردیے تھے۔ اس بار دھمکی یہی تھی کہ ڈھاکہ خالی کرکے چلے جاؤ یہاں قتل عام کرنے والے ہیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ حالات فوج کے قابو میں ہیں' وہ بیوی بچوں سمیت ڈھاکہ میں رہ رہے تھے مگر کشمکش کے عالم میں تھے کیونکہ اس طرح کے خطوط مقامی لوگوں کے پاس ہی بھیجے جارہے تھے۔

گو حکومت نے امن کمیٹی بنائی ہوئی تھی مگر عوام ان امن کمیٹیوں کے سربراہوں سے نالاں تھے کیونکہ یہ لوگ ان کے گھروں میں گھس کر انہیں تنگ کرتے تھے اور جو چیز انہیں پسند آتی اٹھا کر لے جاتے۔ اگر وہ اس کے خلاف منہ کھولتے تو انہیں تخریب کاروں کی فہرست میں شامل کرکے فوج کو دے دیتے ورنہ درحقیقت یہ کسی تخریب کار کا کھوج نہ لگا سکے تھے' بس معصوم شہریوں اور بے قصور لوگوں کو ذاتی دشمنی میں مروا رہے تھے۔ ان امن کمیٹیوں سے چاروں طرف خوف و ہراس پھیل رہا تھا۔

خانہ جنگی کے دوران ہزاروں افراد فوج کے ہاتھوں مارے گئے' فوج کی معاون طاقت کے طور پر سرگرم مذہبی جنونی تنظیموں کی زیادتیاں فوج سے کہیں زیادہ تھیں اور یہ سب کچھ فوجی نظم وضبط کے ماتحتی میں ہورہا تھا۔ اقبال ہال انڈین ایجنٹس

اور مکتی باہنی کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ وہاں کا بدنام زمانہ عقوبت خانہ کیا تھا سب کو معلوم تھا۔ بچے بچے کو پتا تھا کہ وہاں لے جائے جانے والے ایسے لاپتہ ہوتے ہیں کہ کبھی کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ ان کا کیا حشر ہوا۔

ابھی مشرقی پاکستان میں سول حکومت ٹکا خان کے ہاتھ میں تھی۔ بنگالی انہیں ہلاکو خان اور زمانے کا بدترین شخص سمجھتے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ایسا قلعہ تھے جس میں سویلین ملازم خود کو محفوظ سمجھتے تھے۔ سات مارچ کو جب ٹکا خان ڈھاکہ پہنچے تو پاکستانی فوج چھاؤنیوں میں چاروں طرف سے محصور تھی اور تازہ راشن کی سپلائی بند تھی۔ انہوں نے یہ روح فرسا واقعہ بھی تحریر کیا کہ انہیں سی ایم ایچ چٹا گانگ میں ایک زیر علاج بنگالی فوجی افسر نے روتے ہوئے کہا کہ میں نے اور میرے جوانوں نے پاکستانی افسروں اور جوانوں کی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کے کپڑے اتارے ان کی آبروریزی کی اور اسی حالت میں ان سے رقص کرایا۔

14 اگست جوں جوں قریب آرہا تھا افواہوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا تھا۔ سننے میں آیا کہ چودہ اگست کو تخریب کار ڈھاکہ پر زبردست حملہ کریں گے۔ اسی دن ڈھاکہ پر بنگلہ دیش کا جھنڈا بھی لہرایا جانے والا تھا۔ لیکن چودہ اگست بخیر وخوبی گزر گیا' بظاہر یہی لگتا تھا کہ حالات قابو میں ہیں مگر حقیقت یہ تھی کہ جو دن بھی گزر رہا تھا حالات کو بد سے بدتر بنا رہا تھا' مگر حکومت کو خوش فہمی تھی کہ ڈنڈے کے زور پر سب کچھ ٹھیک کرلیں گے۔ مگر مکتی باہنی کا خوف ان کے اعصاب پر بری طرح سوار ہوچکا تھا۔ عام شہریوں کے دلوں میں اعتماد ختم ہوچکا تھا اور لوگ خود کو مکمل طور پر غیر محفوظ سمجھتے تھے۔ جیسا کہ سننے میں آتا تھا کہ کوئی تخریب کار چھپ کر مسلح فوجی دستے پر گولی چلا دیتا اور بھاگ کھڑا ہوتا۔ تخریب کار تو بھاگ جاتے لیکن پورا گاؤں اس کی لپیٹ میں آجاتا۔ خوف وہراس کا ماحول تھا' لمحہ لمحہ مشکل سے گزر رہا تھا' لوگ ڈرے سہمے تھے' یہاں تک کہ رمضان کا مہینہ آگیا لیکن رحمت ہم سے خفا ہی رہی۔ مشرقی پاکستان کے لوگ کتنے تڑپے اور خواہش ظاہر کی کہ ایک مرتبہ صدر صاحب یہاں کا دورہ کریں اور یہاں کے حالات کا جائزہ لیں مگر ان کے کانوں میں جوں نہ رینگی بلکہ ان کا دعویٰ برقرار رہا کہ سب کچھ نارمل ہے۔

چند روز بعد اطلاع ملی کہ چٹا گانگ میں بنگالیوں اور بہاریوں میں فسادات ہورہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ بنگالیوں نے بہاریوں کو قتل کرکے سڑک پر چھوڑ دیا تھا۔ اسی بات پر بہاری مشتعل ہوگئے۔ انہوں نے آبادی سے دور گڑھے کھودے اور جہاں سے بھی کوئی بنگالی پکڑا جاتا اسے گڑھے کے پاس لاکر ذبح کردیا جاتا اور اسی گڑھے میں ڈال دیا جاتا۔ اس میں بچے' بوڑھے مرد وعورت کی کوئی تخصیص باقی نہ تھی اور یہ خونی ڈرامہ کئی روز تک مسلسل چلتا رہا۔ آخر ایک بنگالی کسی طرح سے جان بچا کر وہاں سے نکل بھاگا اور اس نے یہ حقیقت انتظامیہ کو بتائی۔ بنگالیوں کو موقع ملتا تو وہ غیر بنگالیوں پر اس سے بھی زیادہ ظلم وستم ڈھاتے۔ انسان گویا بھیڑیے کا کردار ادا کررہے تھے۔ اس میں وہ محافظ بھی شامل تھے جو علاقے کی حفاظت کے لیے تعینات تھے۔ یہاں کی ادنیٰ ترین چیز صرف انسانی جان تھی' لوٹ مار کا بازار گرم تھا' دن دیہاڑے لوٹ مار کے حادثات ہوتے رہتے کوئی پوچھنے والا نہ تھا کوئی کسی کو جوابدہ

نہ تھا۔

جس دن ایکشن لیا گیا اور ڈھاکہ میں فوج آگئی ہمارے علاقے پلابی سے بنگالی جان بچا کر بھاگے۔ ان کے گھروں کو بڑی بے دردی سے لوٹا گیا۔ ایک بنگالی محترمہ جو BBC میں ملازم تھیں کچھ دنوں کے لیے بنگلہ دیش میں اپنے رشتہ داروں کے یہاں آئی ہوئی تھیں اور پلابی میں مقیم تھیں۔ ان سے میری بہت اچھی جان پہچان ہوگئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے گھر بھی نہیں گئے تھے۔ ہمارے گھر کے سامنے ایک بڑا پارک تھا جہاں جھولے وغیرہ بھی لگے تھے' وہ محترمہ روزانہ اپنی بیٹی کے ساتھ آیا کرتیں ان کی بیٹی ہماری بیٹی کی ہم عمر تھی وہ دونوں ساتھ کھیلتیں اور ہم دونوں بیٹھ کر باتیں کرتے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ملے بغیر چین نہیں آتا۔ وہ کچھ دنوں بعد لندن واپس جانے والی تھیں کہ یہ افتاد آپڑی۔

بلوائیوں نے جب حملہ شروع کیا تو وہ گھبرا گئیں اور اپنی بیٹی کے ساتھ پریشان حال بھاگتی ہوئی میرے پاس آئیں اور گزارش کی کہ ہم کچھ دنوں کے لیے اسے اپنی پناہ میں رکھیں۔ ہفتہ تک ہم نے انہیں اپنے گھر میں چھپا کر رکھا اور کسی کو خبر نہیں ہونے دی یہاں تک کہ پڑوسیوں کو بھی نہیں ۔ جب حالات بہتر ہوئے تو انہیں بند گاڑی میں حفاظت سے شہر بھجوادیا۔ اب وہ کہاں ہیں معلوم نہیں...... میرے پاس ان کا کوئی رابطہ نمبر بھی نہیں ہے۔

1970ء میں جب بنگلہ دیش کی تحریک شدید زور پکڑنے لگی تو میرے ایک ملاقاتی نے اپنے دو بیٹوں اور بیٹیوں کو کسی نہ کسی طرح کراچی بھجوادیا اور خود ڈھاکہ میں رہ گئے اور وہیں شہید بھی ہوگئے 1971ء شروع ہوتے ہی طوفان آگیا' سیلاب امنڈ پڑا' مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ سارے راستے مسدود ہوگئے' شہر میں کرفیو لگ گیا۔ بچے اور بڑوں کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ یونیورسٹی سیاست کا اڈہ بن گئی۔ آئے دن کے ہنگاموں نے شدت اختیار کرلی' ہر طرف ایک شور ہنگامہ بپا تھا۔ مکتی باہنی کے نام پر وحشت اور بربریت کا بازار گرم ہوگیا۔ سارے جنونی قاتل سڑکوں پر دندنانے لگے۔ ہر طرف وحشت اور بربریت کا مظاہرہ ہونے لگا' جیل کے دروازے کھل گئے حالات قابو میں رکھنے کے لیے مغربی پاکستان سے فوجیں بھیجی جانے لگیں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ حالات روز بروز بگڑتے ہی گئے۔

جب 25 مارچ کو ملٹری ایکشن ہوا اور مغربی پاکستان سے فوج آنا شروع ہوئی تو مشرقی پاکستانی فوج کے باغی ایک دم بدحواس ہوگئے اور بدمست ہاتھی کی طرح جدھر سے گزرے معصوم زندگیوں کو پامال کرتے چلے گئے۔ ان کے نزدیک انسانی زندگی بھیڑ بکریوں سے زیادہ نہ تھی۔ ہنستی کھیلتی بستیوں کو قبرستان میں بدل دیا۔ ایسے قبرستان جہاں لاشیں دفن ہونے کے بجائے سڑ رہی تھیں۔ جب پاکستانی آرمی پہنچی تو لاشوں کا انبار تھا اور تعفن پھیلا ہوا تھا' پاکستان آرمی نے انہیں اجتماعی قبروں میں دفن کیا۔ اب ایئرپورٹ پر غیر بنگالیوں کا تانتا لگ گیا اور پی آئی اے کی پروازیں تیزی سے ڈھاکہ سے کراچی آنے جانے لگی۔ کراچی ایئرپورٹ پر رفیوجی کیمپ لگ گیا۔ ڈھاکہ سے کراچی جانے والوں کی بھیڑ ایئرپورٹ پر بڑھنے لگی۔ عجیب نفسانفسی کا عالم تھا ایسا لگتا تھا کہ حشر کے میدان میں حساب کتاب

کے لیے کھڑے ہیں۔ دن کے سات بجے سے چار بجے تک لوگ ڈھاکہ ایئرپورٹ پر گرتے پڑتے پہنچتے' شام ہوتے ہی کرفیو لگ جاتا اور حکم صادر ہوتا کہ جو جہاں ہے وہیں پڑا رہ جائے ورنہ گولیوں کا نشانہ بن جائے گا۔ خوف و ہراس کا ماحول بڑھتا جارہا تھا۔ ایک عجیب سا سناٹا چھا جاتا جب کرفیو لگتا۔ مشرقی پاکستان میں مارشل لاء نافذ تھا۔ وقفہ وقفہ سے فائرنگ کی خوفناک آواز آتی رہتی تھی۔ کسی طرح حالات ٹھیک ہوتے نظر نہ آتے تھے کیونکہ ظلم وستم کرنے والے دیارِ غیر میں جاچھپے تھے۔ مگر پُرامن شہری نفرت کی آگ کی تپش سے بچ نہ سکے اور یہی وہ نکتہ ہے جہاں قومی المیہ نے نیا رخ اختیار کیا۔

جولائی میں ڈھاکہ کے حالات خاصے نارمل لگ رہے تھے اگرچہ کالج اسکول بند تھے مگر دفاتر کھلے تھے۔ سڑکیں اور گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ بازار وغیرہ میں کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ اور کسی چیز کے خریدار تک نہ تھے۔ کچھ بنگالی ملازمین روپوش ہوچکے تھے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد کم تھی۔ باقی جو لوگ تھے وہ باقاعدگی سے دفتر جارہے تھے' کالج' اسکول یا یونیورسٹی کھلنے کا اعلان کیا گیا لیکن مقامی لوگوں کے پاس ایسے خطوط آنے لگے کہ اگر بچوں کو اسکول بھیجا گیا تو انہیں ختم کردیا جائے گا۔ والدین ہراساں ہوگئے اور بچے بچیوں کو اسکول بھیجتے ہوئے ڈرنے لگے۔ ایک بات یہ بھی محسوس ہوئی کہ بیشتر بنگالی جو ملازمت پر جارہے تھے ان کی وفاداری پاکستان کے ساتھ نہیں تھی۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ حکومت میں کسی قسم کا بھی کوئی منصوبہ اگر بنایا جاتا اور اسے کتنی ہی راز داری سے رکھا جاتا تب بھی اس کی غیر حکومت کو خبر ہوجاتی تھی۔ یہ بنگالی صرف مصلحت اور ہوا کا رخ دیکھ رہے تھے جیسے ہی مکتی باہنی کا پلہ بھاری ہوتا یہ اُدھر چلے جاتے تھے۔ لیکن سب بنگالی ہرگز ایسے نہیں تھے کچھ ایسے بھی تھے جو دل سے پاکستان کے ساتھ تھے۔ کئی ایسے ثبوت بھی ملے ہیں جہاں بنگالیوں نے غیر بنگالیوں کی مدد کی اور ان کی جانیں بچائی ہیں۔

میرے شوہر کا دفتر شہر کے عین مرکز میں تھا یہ ایک بڑی عمارت تھی اور وہ E P I D G میں پلاننگ کے عہدے پر فائز تھے۔ میرے شوہر کے علاوہ چند اور اردو بولنے والے بھی وہاں کام کررہے تھے۔ باقی نیچے سے اوپر تک سارا عملہ مقامی لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ میرے شوہر اکثر کہتے کہ میری زندگی بس چند ہی دنوں کی ہے کب زندگی دغا دے دے گی پتہ نہیں۔ میں یہ سن کر کانپ سی جاتی۔ موت حیات تو اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر پھر بھی جب تک وہ گھر نہیں آتے جسم و جان میں ایک پریشانی سی رہتی اور ہر دوسرا دن پھر اسی بے اطمینانی اور بے سکونی میں گزرتا۔

فوجی آپریشن 25 مارچ 1971ء کی نصف شب شروع ہوا جبکہ اس سے پہلے اور اس کے بعد مکتی باہنی اور عوامی لیگ کے جیالے قیامت ڈھاتے رہے۔ اس کی تفصیلات ایک بنگالی افسر کرنل شریف نے اپنی کتاب 'پاکستان سے بنگلہ دیش' میں فراہم کی ہیں۔ انہیں جلدی یہ احساس ہوگیا تھا کہ عوامی لیگ بھارت کے ساتھ رابطے میں ہے اور اسی کی ایماء پر مشرقی پاکستان میں پاکستان کے فوجیوں اور غیر بنگالی سویلین پر حملے کیے جارہے ہیں۔

پاکستانی فوج کی کل تعداد پچاس ہزار کے لگ بھگ تھی جبکہ فوج سے بغاوت کرنے والے افسروں' جوانوں اور تربیت یافتہ مکتی باہنی کے رضا

کاروں اور بھارتی حملہ آور فوج کی تعداد کسی طور پر 2 لاکھ سے کم نہ تھی۔ انڈیا نے پوری دنیا میں پروپیگنڈا کیا کہ جنرل ٹکا خان نے تیس لاکھ بنگالی قتل کرڈالے ہیں بنگالی دانش وروں کو بے رحمی سے ذبح کرکے اجتماعی قبروں میں دفن کردیا گیا۔ لاکھوں عورتوں کی عصمت دری ہوئی ہے۔ اس زہریلے پروپیگنڈے کا مقصد پاکستان کو ایک وحشی ملک ثابت کرنا تھا۔ جناب معین باری جو اس وقت آئی ایس آئی میں تعینات تھے وہ لکھتے ہیں کہ میری میز پر لارج سائز کے فوٹوز کا ایک بنڈل پڑا تھا جسے دیکھ کر پسینے چھوٹ گئے۔ یہ تصویریں مشرقی پاکستان میں ان ذبح خانوں کی تھیں جہاں مغربی پاکستان کے مرد ذبح کیے جاتے تھے۔ بچوں کے ذبح خانے علیحدہ تھے۔ ان مذبح میں دور دور تک جمع ہوئے خون کی تہیں دکھائی دیتیں۔ انسانی ڈھانچے بکھرے پڑے تھے۔ یہاں کتوں اور گدھوں کی بہتات تھی۔

مشرقی پاکستان میں بعض فوجی افسروں نے جو مظالم ڈھائے ان کا تذکرہ کم و بیش حمود الرحمن کمیشن کی رپورٹ میں مل جاتا ہے مگر جو خوفناک جرائم باغی بنگالیوں اور مکتی باہنی کے گوریلوں سے سرزد ہوئے ان کا انکشاف بعد میں غیر جانب دار بنگالی مصنفین اور مورخین کی کتابوں میں ہوا ہے۔ امریکہ میں قیام پذیر سبھاش چندر بوس کی پوتی شرمیلا بوس مشرقی پاکستان میں انسانی المیہ پر سالہا سال کی تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ تیس لاکھ بنگالی کا قتل' اجتماعی قبریں اور لاکھوں خواتین کی آبروریزی کے قصے محض افسانے ہیں جن میں مبالغہ آرائی کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں۔

پروفیسر سجاد کو مکتی باہنی اپنی طرف سے موت کے گھاٹ اتار ہی چکی تھی مگر معجزانہ طور پر وہ بچ گئے۔ انہوں نے تین اور پچیس مارچ کے دوران وقوع پذیر ہونے والے واقعات جس تاریخی حقیقت کے ساتھ قلم بند کیے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف شہروں میں غیر بنگالیوں کی لاشوں کے انبار لگے تھے۔ اسی طرح پروفیسر جی ڈبلیو کی تصنیف نے بنگالی گوریلوں کے مظالم کے ہوشربا واقعات قلم بند کیے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ فوجی آپریشن بڑی حد تک ناگزیر ہوگیا تھا۔

ڈاکٹر حمود الرحمن لکھتے ہیں کہ سنہری بنگال کی رنگینی و رعنائی اپنی مثال آپ ہے کہ یہ زرخیز خطہ جو ہمیشہ سے سمندری طوفانوں کی آماجگاہ بنا رہا وہیں اس دھرتی نے ہزاروں سیاسی طوفانوں کو بھی جنم دیا اور تیز طرار بنگالیوں کی زندگی میں ہلچل مچا کر رکھ دی۔ ایسے ہی ایک طوفان بنگلہ دیش کے قیام کی صورت میں برپا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں انسانوں کی بھینٹ اپنی آغوش میں لے کر چلتا بنا۔ اسپین کے زوال کے بعد یہ اسلام کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ تھا اور ابھی ایک نسل بوڑھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس امانت پر زبردست ڈاکہ پڑا اور ہم اس کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے۔

اس کتاب میں بنگلہ دیش میں بحران کے دوران قربان ہونے والے سرفروشوں کی خونچکاں داستان رقم کی گئی ہے اور اس بے رحم سیاست کی حقیقی تصویر کھینچی گئی ہے جس نے پاکستان کو دو ٹکڑے کرڈالا۔

☆......☆......☆

جنرل ایوب نے جون 1962ء میں جو دستور قوم پر مسلط کیا اس میں تمام اختیارات خود تک مرتکز کرلیے اور مشرقی پاکستان کے عوام کو شدت سے محسوس ہوا کہ ان کے اقتدار میں کوئی حصہ

نہیں اور انہیں حکمرانی سے یکسر محروم کردیا گیا۔ وہاں کی اسمبلی اور وزراء بالکل بے اختیار ہوگئے۔ مزید برآں 1965ء کی جنگ نے شدید عدم تحفظ' تنہائی اور بے بسی کا احساس دلایا کہ مغربی پاکستان کی عسکری اور سیاسی قیادت نے مشرقی پاکستان میں ابھرتی ہوئی صورت حال کی سنگینی کا صحیح ادراک نہیں کیا اور سیاسی جماعتوں نے دونوں بازوؤں کے درمیان پل کا کام کرنے کی بجائے اپنے اپنے خول میں سکڑنا شروع کردیا۔ اس کے بعد مجیب الرحمٰن نے عوامی لیگ کی طرف سے مشرقی پاکستان کے مسائل کا حل چھ نکات کی صورت میں پیش کیا۔

یکم جنوری 1970ء سے طویل ترین مہم کا آغاز ہوا۔ انتخاب کے ایک ماہ پہلے مشرقی پاکستان میں بارہ نومبر کو ایک ہولناک سمندری طوفان آیا جس میں پانچ لاکھ شہری لقمہ اجل بن گئے۔ جنرل یحییٰ اور ان کے کارکنان کی مدہوشیوں کے باعث مغربی پاکستان سے امداد کافی دیر سے یعنی 24 نومبر کو پہنچی جبکہ بین الاقوامی امداد بہت پہلے ہی آنا شروع ہوگئی تھی۔ 1965ء کی جنگ کے بعد دوسری بار ثابت ہوا کہ ہنگامی حالات میں پاکستان نے اپنے مشرقی بازو کو فوری تحفظ اور امداد فراہم کرنے کی بجائے انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ اس قدرتی آفت کے بعد پاکستان کے خلاف نفرت اپنی حدوں کو چھونے لگی۔

مجیب الرحمٰن نے عوامی حقوق کی جدوجہد کے آغاز کے لیے چھ نکات کو اپنی مہم کی بنیاد بنایا۔ شروع شروع میں چھ نکات 1966ء میں منظر عام پر آئے لیکن اس قدر شہرت حاصل نہ کرسکے مگر 1970ء کے الیکشن میں ان نکات نے برصغیر کی سیاست کی کایا پلٹ دی۔ چھ نکات کیا ہیں ان کی تفصیلی شرح کیا ہے اس سے کسی کو کوئی غرض نہ تھی۔ بنگالی عوام چاہے پڑھے لکھے ہوں یا اَن پڑھ صرف اتنا جانتے تھے کہ یہ ہمارے حقوق کی آواز ہے' انہیں اس مطالبے سے جذباتی لگاؤ تھا۔ بظاہر چھ نکات اپنے اندر بلا کی سختی لیے ہوئے تھے مگر حقیقت میں یہ ایک سیاسی مطالبہ تھا اور سیاست میں ایسا ہی چلتا ہے پھر انہیں مناسب عمل کے ساتھ تسلیم کرلیا جاتا ہے۔

صدر یحییٰ ایک جنرل تو ضرور تھے مگر وہ سیاست کی پیچیدگیوں سے قطعی نابلد تھے۔ ان کا دورِ حکومت حماقتوں کا ایسا مرقع تھا جس میں مارشل لاء ایسی بے دردی کے ساتھ نافذ کیا گیا کہ یہ بجائے خود مسلح افواج کے وقار کا مسئلہ بن گیا۔ آخر کار الیکشن کا دن آ پہنچا۔ عوامی لیگ نے قومی اسمبلی کی طاقت کے بل پر ایک سو باسٹھ نشستوں میں سے ایک سو ساٹھ سیٹیں حاصل کرلیں۔ جنرل یحییٰ خان نے مجیب کی کامیابی کا خیر مقدم کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ملک کے آئندہ وزیراعظم مجیب الرحمٰن ہوں گے۔ یہیں سے ملک کے اقتدار کی جنگ شروع ہوگئی۔ پیپلز پارٹی گویا ہر صورت میں اقتدار چاہتی تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے اِدھر ہم اُدھر تم کا پیغام دے کر بذاتِ خود صوبائی علیحدگی کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔

1971ء کا سال شروع ہو چکا تھا سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مشرقی پاکستان کے حالات کیا رُخ اختیار کریں گے۔ پاکستان کے دونوں بازوؤں کے درمیان تعلقات روز بروز سنگین تر ہوتے جارہے تھے۔ گتھیاں سلجھنے کے بجائے اُلجھتی جارہی تھیں کیونکہ ڈور کا سرا مغربی پاکستان

ہاتھوں میں تھا اور اکثریت کے مفاد میں یہ تھا کہ اور سلجھنے کے بجائے بیشک ٹوٹ جائے' سیاسی افق طوفان خیز رہا۔ پاکستانیوں کے لیے قیامت آئی اور آتی ہی چلی گئی۔ ایک تو مشرقی پاکستان کا ظلم و تشدد کے خلاف قدم اٹھانا ہی قیامت کی دلیل تھی۔ پاکستان کے دونوں بازو اپنے درمیان اتنی وسیع دوری کے باوجود ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے مگر آہستہ آہستہ ان کی گرفت ڈھیلی ہورہی تھی۔ سوائے فوجی سطح کے دونوں حصوں میں کوئی رابطہ نہ تھا۔ اسلام آباد میں جو پالیسیاں بنتیں' مشرقی پاکستان والوں کے لیے وہ قابل قبول نہ تھیں۔

جو کچھ ہوا وہ ناگزیر تھا۔ کیا مشرقی اور مغربی پاکستان کا ایک ساتھ رہنا ناممکن تھا؟ کیا دو مختلف کلچر دو مختلف نسلیں ایک ساتھ نہیں رہ سکتی تھیں۔ پاکستان کا وہ تصور جو قرارداد لاہور میں پیش کیا گیا تھا' کارگر ثابت ہوتا' جس علاقے میں جس کی اکثریت تھی اقتدار اُن کے ہاتھوں میں دے دیا جاتا۔ اس طرح شاید وہ مل کر مشترکہ حکومت بنالیتے۔ مشرقی پاکستان کی آبادی 56 فیصد تھی لیکن اتنی بڑی آبادی اور اکثریت کے باوجود انہیں فوج اور سینٹرل سروس میں متناسب حصہ نہیں ملتا تھا اور امتیازی سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ فوج میں بھرتی ہونے کے لیے تعلیم کے علاوہ ایک خاص قد و قامت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکثر بنگالی دبلے پتلے اور چھوٹے قد کے ہوتے ہیں اور دیکھنے میں بھی کمزور لگتے ہیں لہٰذا انہیں فوج میں کوئی اہم عہدہ یا اہم ذمہ داری نہیں سونپی گئی۔ سول ملازمتوں میں بھی پنجابی مہاجر اور پٹھان افسروں کا قبضہ تھا۔ کچھ سندھی' بلوچی بھی ترقی پاکر اعلیٰ عہدوں پر پہنچ گئے تھے کیونکہ حکومت کے فیصلہ کرنے والے حلقوں میں یہ مفروضہ یقین کی صورت اختیار کرگیا تھا کہ بنگالیوں کو اعلیٰ فوجی عہدوں کے قابل بنانے کے لیے کافی محنت درکار ہوگی۔ یہ مفروضہ اس وقت دھوئیں کی شکل اختیار کرگیا جب بنگلہ دیش کے لوگ اپنے وسائل کے مالک خود بن گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سیکریٹری' سفیر اور تمام اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوگئے۔ آج بنگالی سفارت کاروں اور افسروں کی وہی عزت و تکریم ہے جو دوسرے ممالک کے اعلیٰ عہدیداروں کی ہے۔ کچھ فوجی اور مغربی پاکستان کی بعض سیاسی جماعتوں نے مل کر یہ سازش رچائی کہ اکثریت کو اقتدار سے محروم رکھا جائے جس کا نتیجہ آج ہم پاکستانیوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اگر ہم انہیں ان کا حق دے دیتے انہیں عزت اور تکریم دیتے تو ملک کا اہم بازو ہم سے ہرگز جدا نہ ہوتا۔

قومی اسمبلی کا اجلاس 3 مارچ 1971ء کو اکثریتی آبادی کے صوبائی دار الحکومت ڈھاکہ میں ہونا قرار پایا۔ پیپلز پارٹی کو خطرہ لاحق ہوا کہ عوامی لیگ اپنی اکثریت کی بنا پر اپنے تجویز کردہ دستور کی منظوری حاصل کرلے گی۔ بھٹو کو گوہرِ مقصود حاصل ہوتا نظر نہیں آرہا تھا اس لیے انہوں نے اسمبلی کے اجلاس کو ناکام بنانے کا پروگرام بنالیا۔ بھٹو نے اعلان کیا کہ کوئی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے گیا تو اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ یحییٰ خان نے اسمبلی کا اجلاس ملتوی کردیا۔ ایک دفعہ بلانے کے بعد اجلاس کا ملتوی کرنا یحییٰ خان کی بڑی سیاسی غلطی ثابت ہوئی۔ اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہوتے ہی مشرقی پاکستان میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ مجیب نے 2 مارچ کو عام ہڑتال کا اعلان کردیا۔ 2 مارچ کی ہڑتال کی

کامیابی کے بعد مجیب نے 4 مارچ سے پورے صوبے میں نافرمانی کی تحریک شروع کردی۔ عوامی لیگ کے دو لاکھ تربیت یافتہ مسلح رضا کار' نیز بھارتی حمایتی اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے حرکت میں آگئے۔

15 اپریل کو یحییٰ خان اپنے مشیروں کے ہمراہ شیخ مجیب سے بات چیت کے لیے ڈھاکہ پہنچے۔ مذاکرات کی ناکامی کے بعد یحییٰ خان واپس چلے گئے۔ 23 مارچ کو شیخ مجیب کی ہدایت پر یومِ مزاحمت منایا گیا۔ عوام نے 25 مارچ کی رات کو بنگلہ دیش کے قیام کے اعلان کا فیصلہ کیا۔ اس رات یحییٰ خان نے عوامی لیگ کو خلافِ قانون قرار دیا اور شیخ مجیب کو گرفتار کرکے خصوصی طیارے کے ذریعے مغربی پاکستان پہنچا دیا گیا۔

اپریل کے آغاز تک نواب گنج میں قدرے سکون تھا۔ جب فوج کے بکھرے ہوئے دستوں نے کہیں کہیں آپریشن شروع کیا تو ملک دشمن عناصر فرار ہوکر بھارت پہنچنے لگے۔ ان سے مدد مانگی اور پاکستان کے خلاف وہاں بیٹھ کر منصوبہ بندی میں مصروف ہوگئے۔

اپریل کے مہینے میں کسی دن دوپہر کے وقت پاک آرمی کی کئی بسیں' ٹرک نواب گنج شہر میں داخل ہوئے۔ ان میں تقریباً چھ سو فوجی ایسٹ بنگالی رجمنٹ کے تھے۔ چالیس پچاس افراد مغربی پاکستانی تھے۔ انہی میں کیپٹن اسحٰق بھی موجود تھے جن کے ہاتھوں میں دستے کی کمان تھی۔ مائیک پر اعلان ہوا کہ اپنے اپنے ہتھیار جمع کرادیں۔ شہر میں چھ بجے شام سے صبح کے پانچ بجے تک کرفیو رہے گا۔ تمام رات نواب گنج کی طرف سے اِکا دُکا گولی چلنے کی آواز آئی۔ آثار بتا رہے تھے کہ شہر میں گڑبڑ ہے۔ صبح معلوم ہوا کہ رات کے وقت بنگال رجمنٹ نے غداری کرکے پنجاب سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کو قتل کردیا ہے۔ شہر پر عوامی لیگ کا قبضہ ہے اور وہ عوامی لیگ کے آدمیوں کو ہتھیار تقسیم کررہی ہے۔

مکتی باہنی اور عوامی لیگ نے غیر بنگالیوں کا قتل عام شروع کردیا تھا۔ اپریل کے آغاز میں فوج اس علاقے میں آگئی اور جب اسے اس جرم کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے بھی 80 افراد کو بغیر کسی عذر کے گولی ماردی۔ پاکستان کے بعض حامی مارے گئے۔ پورے علاقے میں دہشت پھیل گئی۔ یہ خبر عام ہوئی کہ پاک آرمی بہت ظلم کررہی ہے۔ لوگوں نے سرحد پار کرکے بھارت کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔ کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ مشرقی پاکستان سے بھاگ کر بھارت پہنچے۔ حکومت ہند نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ حکومتِ ہند نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مغربی بنگالی کی سرحد کے ساتھ ہزاروں جھونپڑیاں تیار کروا رکھی تھیں' ان جھونپڑیوں میں بنگالیوں کو تخریب کاری کی ٹریننگ دے کر مشرقی بنگال میں اپنے مقصد کے لیے استعمال کررہی تھی۔ یہی نوجوان مکتی باہنی کہلائے۔ حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے بلکہ آہستہ آہستہ قابو سے باہر ہوچلے تھے۔ شام ہوتے ہی دھماکے شروع ہوجاتے جب وارداتیں زیادہ ہوجاتیں تو کرفیو نافذ کرکے مخصوص علاقے کی تلاشی لی جاتی مگر جب پوری آبادی میں نفرت پھیل چکی تھی تو پھر ان پر قابو پانا آسان نہیں تھا۔

بھارت' پاکستان اور بنگلہ دیش ایک ہی بھارت سے تین ٹکڑے بنے۔

(اِس چشم کشا تحریر کا دوسرا حصہ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیے)

اس ماہ کی خاص کہانی

لاہور سے ایک نامور لکھاری کی ناقابلِ فراموش تحریر



شہریار کا فکرِ خیال

زندگی سے ابھی رشتہ نہیں ٹوٹا میرا
کل کا احوال کچھ' آج کی حالت کچھ ہے

روشانے سبعین مہاروی

''بہو.....آج پھر آلو مٹر.....؟'' بے جی نے منمناتے ہوئے بے بسی سے کہا۔ وہ ہمیشہ سے تازہ کھانا کھانے کی عادی تھیں۔ مسلسل تین دن سے ایک ہی سبزی کھانے سے اُن کی طبیعت



خاصی مکدر ہوگئی تھی۔

''اوہو...... بھئی آپ کے ساتھ پرابلم کیا ہے بے جی؟'' بہو بیگم ماتھے پر تیوریاں چڑھاتے تڑخ کر بولیں۔

''کولہو کے بیل کی طرح سارا دن کام میں جُتی رہتی ہوں' پھر بھی آپ کے نخرے ...... حد ہے۔ تین چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے' ہزار کام رہتے ہیں مجھے ...... ہر روز تازہ کھانا پیش نہیں کرسکتی میں آپ کو...... اللہ کا شکر ادا کیا کریں ہر حال میں......'' حسب عادت انہوں نے بے جی کو بےنقط سنا دیں۔

''نہیں بیٹی...... ایسی بات نہیں...... وہ' بس تین دن سے مسلسل......'' اُن کی آواز گھٹ کے رہ گئی۔

''مالک! معاف فرما' میں ہی ناشکری ہوں بےشک۔'' اشکوں نے جیسے گلہ گھونٹ دیا ہو۔ وہ ایک ایک آنسو اپنے اندر اتارتے ہوئے لقمہ لقمہ زہر مار کرنے لگیں۔

''ہونہہ...... آپ کے اللے تللے خوب سمجھتی ہوں بے جی...... فریزڈ کھانا کوئی باسی نہیں ہوجاتا۔ ہم بھی تو آپ کے ساتھ ہی کھاتے ہیں روزانہ۔'' وہ بےوجہ بات کو طول دے رہی تھیں۔

بے جی سر جھکائے خاموش تھیں۔ کھانا تو روز ہی تازہ بنتا تھا' آج بھی باورچی خانے میں گوشت بھونا جارہا تھا' لیکن وہ اُن کے لیے نہیں تھا۔

''اے منی! ذرا فریزر سے گوشت کا پیکٹ نکال دے' تیرے ابا کے لیے بھون دوں گی' بے چارے اتنی محنت کرتے ہیں' ہمارا کیا ہے' جو دال ساگ ہے' وہی کھالیں گے۔'' بے جی خوب سمجھتی تھیں کہ وہ بے چارگی کا ڈرامہ رچائے انہیں ہی سنا رہی تھیں۔ لیکن بے جی تو جیسے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھیں۔

موسم بدل رہا تھا۔ رات میں بیٹا اپنے بچوں کے لیے جلیبیاں اور پکوڑے لایا۔ کئی دن سے میٹھا کھانے کی خواہش دل میں دبائے وہ اُس وقت خود کو روک نہ سکیں' اور جلیبی کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''اُف خدایا...... بے جی کچھ تو خیال کریں آپ کو شوگر ہے۔'' بہو نے اُن کے ہاتھ سے جلیبی لیتے ہوئے لگاوٹ سے کہا۔ سارا دن زہر ٹپکانے والی زبان شوہر کی موجودگی میں اِس قدر شیرینی اور حلاوت لیے ہوتی کہ بے جی بھی دنگ رہ جاتیں۔ بے جی نے خفت زدہ ہوکر اپنا ہاتھ فی الفور واپس کھینچ لیا۔

''اوہو...... بے جی! آپ یہ گرما گرم پکوڑے لیں۔'' بیٹے نے پلیٹ اُن کی جانب سرکائی۔

''ہائے میرے ربا' تسی توی تاں...... بڑے لاپرواہ ہو...... بے جی ہارٹ پیشنٹ ہیں' اُن کا کولیسٹرول لیول پھر سے ہائی ہوجائے گا۔'' زرینہ بہو نے دلنشین مسکراہٹ شوہر کی طرف اچھالتے ہوئے پلیٹ درمیان سے اچک لی۔

''زرینہ! تم بے جی کا کتنا خیال رکھتی ہو۔'' شوہر نے تشکر آمیز نظروں سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے محبت سے کہا۔

''بے جی! دیکھا آپ نے...... زرینہ کو کتنی فکر ہے آپ کی...... ایسی بہو آپ کو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی۔'' اِک احساس تفاخر سے کہتے ہوئے وہ بے جی سے مخاطب ہوئے۔

بے جی کو اِس وقت اپنی سب سے چھوٹی اولاد دنیا کی احمق ترین مخلوق لگی۔ اِک پھیکی سی ...لراہٹ نے اُن کے سفید پڑتے لبوں کا احاطہ ...لیا۔ دل میں پنہاں کرب آنکھوں سے چھلکنے کو ...بے تاب ہوا' لیکن انہیں کمال ضبط تھا کہ لبوں پر ...اموشی کا قفل سجائے' وہ جیسے خود اپنے درد کی ...ماشائی بن گئیں اور زرینہ بیگم شوہر کی تعریف پر ...انہیں میٹھی میٹھی نظروں سے تکتی چہرے پر بھولپن ...اور لبوں پر شرمگیں مسکراہٹ سجائے یوں بھر بہوئی ...ی جارہی تھیں' گویا شب زفاف کی دلہن ہوں۔

بے جی کہنے کو چار بیٹوں کی ماں تھیں۔ دو تو ...ئی سال قبل ولایت سدھار گئے تھے۔ تیسرے ...ی بیگم نے بیاہ کے آتے ہی میاں کو لے کر الگ ...نسار بسا لیا' وہ بے جی کو دیکھ کر یوں ناک منہ ...چڑھاتی گویا وہ چھوت کی مریض ہوں' لے دے کہ لیاقت ہی رہ گیا تھا۔ سب سے چھوٹا اور لاڈلا بے جی کی امیدوں کا مرکز' وہ چاند کی چودھویں تاریخ کو' اپنے بیٹے لیاقت کے لیے زرینہ کو بڑے چاؤ اور ارمانوں سے بیاہ کر لائی تھیں' لیکن ...سکھ تو شاید نصیبوں سے ہی ملتے ہیں۔

شوگر کی مریض بے جی دو بار جان لیوا ہارٹ اٹیک کے بعد بالکل ڈھے سی گئی تھیں۔ قوتِ مدافعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ وقت' حالات اور اپنوں کی نارسائی نے انہیں مکمل طور پر توڑ دیا تھا۔ اور پھر پت جھڑ کی رُت میں اک شام وہ ایسی سوئیں کہ پھر اٹھ نہ سکیں۔ اُن کی پتھرائی ہوئی نظریں زندگی کی حرارت سے محروم تھیں۔ ماں ...داغ مفارقت کیا دے گئی' لیاقت صاحب کو چپ ...کسی آسیب کی طرح چمٹ گئی' لیکن وقت کسی کے ...بچھڑنے سے ٹھہرتا ہے؟

☆......☆......☆

وقت اپنی مخصوص چال چلتا رہا' زرینہ بیگم بھی بڑھاپے کی طرف پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ جوانی کب کی ڈھل چکی تھی' لیکن کروفر اور طنطنہ اب بھی کم نہ ہوا تھا' سارے گھر پر بلاشرکت غیرے اُن کا راج تھا' وہی ہرے بھرے دن تھے' اور وہی سرمئی شامیں تھیں اُس گھر کے مکین بھی وہی تھے لیکن سمے کے کھیل نرالے...... وقت کے سانچے میں ڈھل کر کردار بدل گئے تھے۔ دونوں بیٹیاں بیاہ کر اپنے اپنے گھر سدھار گئی تھیں۔ اکلوتا بیٹا احتشام ماں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور بابا کے دل کا سرور تھا اور پھر زرینہ بیگم کے دل میں بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کی خواہش اتنی شدت سے جاگ اٹھی کہ چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق وہ دنوں میں امیر کبیر خاندان کی بیٹی بیاہ کر گھر لے آئیں۔

لیاقت صاحب کہتے ہی رہ گئے کہ ''بیگم ذرا دھیرج رکھیے' یہ معاملات عمر بھر کے ہوتے ہیں' یوں ہتھیلی پر سرسوں جمانا مناسب نہیں۔'' لیکن زرینہ بیگم کو اب چین پڑنا مشکل تھا' جب تک آنگن میں بہو کی پازیب کی چھنک اور چوڑی کی کھنک نہ سنائی دے۔

''ارے میاں صاحب! جب ایک سال کے اندر پوتے کو لوری سنائیں گے اور گود دوں کھلائیں گے ناں' تب اِسی زرینہ بیگم کا فیصلہ آپ کو درست معلوم پڑے گا۔' پھر ہم سے عجلت کی شکایت نہ رہے گی آپ کو۔'' وہ پُرجوش لہجہ میں بولیں۔ اُن کی آنکھوں میں اتنے رنگ اتنے سپنے تھے کہ لیاقت صاحب بس مسکرا کر رہ گئے۔

''جیسے آپ کی مرضی بھئی...... سرتسلیم خم۔'' انہوں نے ہمیشہ کی طرح سرنگوں ہوکر اُن کا مان بڑھایا۔

موسم قدرے کھل گیا تھا۔ گلابی جاڑوں کی آمد آمد تھی۔ گھر میں شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ دونوں بیٹیاں مائیکے کی شان بنی ہر کام میں

پیش پیش تھیں۔

''وقت کتنی تیزی سے بیت جاتا ہے۔'' ڈھلتی شام میں آسمان پر پھیلی شفق کی لالی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے سوچا۔

سبک خرامی سے چلتی ہوا برآمدے کے ستون سے لپٹی عشق پیچاں کی بیل سے چھیڑ خانی کر رہی تھی۔

''ماں ایک کیپچینو کافی......؟'' لاڈلا کندھے پر سر رکھے فرمائش کر رہا تھا' ابھی کل کی بات ہے وہ جھولے میں لیٹا انگوٹھا چوسا کرتا تھا۔ اور آج ماشاءاللہ 26 برس کا ہو گیا تھا۔ زرینہ بیگم نے اُس کے گال سہلاتے ہوئے اِک ممتا سے بھرپور نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا۔

''ابھی لائی بیٹا......'' انہوں نے کچن میں جانے کا قصد کیا کہ بیٹی نے ٹوک دیا۔

''ماں! آپ بیٹھیں...... بھیا کے لیے کافی میں بنا کے لاتی ہوں' شادی کے بعد تو بھابی کے ہاتھ کی کافی ہی اچھی لگے گی' ہمیں کوئی لفٹ نہیں دینے والے یہ۔'' چھوٹی بہن نے بھائی کے گلے میں بانہوں کا ہار ڈالتے ہوئے اُسے چھیڑا۔

''بھئی بات تو درست ہے تمہاری...... تمہیں لفٹ دینے والے تمہارے دولہا میاں جو ہیں۔'' بھیا نے شرارت سے کہتے ہوئے اُس کی موٹی سی لمبی چوٹی کھینچ لی۔ نہلے پر دہلا تھا۔ چھوٹی کے گال شرم سے لال ٹماٹر ہو گئے۔

''بھیا...... آپ بہت برے ہیں۔'' اُس نے بھائی کو ایک دھموکہ رسید کیا۔

''اور تم بہت اچھی...... میری گڑیا بہن۔'' اُس نے بہن کو گلے سے لگایا ماں کے دل کو یہ دلنشین منظر بہت بھایا۔ بہن بھائی کی محبت...... چونچلے...... یہ چھوٹی چھوٹی شرارتیں...... اُن کے آنگن کی خوشیاں اسی میں پنہاں تھیں۔

''خدایا...... میرے بچوں کی خوشیاں یونہی سلامت رکھنا...... میرے مولا......!'' دعا دل سے نکلی اور آسمان کی طرف جانے والے رستوں کی بھول بھلیوں میں کھو گئی۔

وہ بھول گئی تھیں کہ کئی برس پہلے اِک بے کس ماں کے دل پر پاؤں رکھ کر کیسے انہوں نے اُس کی خوشی' سکھ چین خاک میں ملایا تھا۔ وہ جوان تھیں حسین تھیں۔ شوہر کے دل کی رانی تھیں۔ اِسی غرور نے انہیں ایک لمحہ نچلا بیٹھنے نہ دیا۔ وہ پورے طمطراق سے اپنے وقت کی خدا بنی بیٹھی تھیں۔ وہ بھول گئی تھیں کہ خدا تو صرف وہی ہے جو ہفت آسمانوں کا مالک ہے اور اپنے کرموں کا کیا تو بھگتنا ہی پڑتا ہے۔

دھیرے دھیرے قدرے سبھاؤ کے ساتھ چرخہ کاتنے والی چاند کی بڑھیا بھی اب اتنی برق رفتاری سے چرخہ کاتنے میں جُتی ہوئی تھی گویا زمین کی طرح وہاں بھی وقت سے برکت اٹھالی گئی ہو۔

بالآخر وہ سنہری دن آن پہنچا' جب اُن کا لاڈلا گھوڑی چڑھنے والا تھا' بہنوں نے سہرے کے گیت گائے ماں نے دل کھول کر ارمان پورے کیے اور نازک اندام بسمہ اُن کے گھر کی رونق بن کر آنگن میں اتری۔ عروسی لباس' طلائی زیورات اور مہارت سے کیے گئے میک اپ میں وہ آسمان سے اتری کوئی اپسرا ہی لگ رہی تھی۔ دلہن کے لیے بیٹے کی دیوانگی اور بے خودی نے اِک لمحہ کے لیے انہیں سراسیمہ کر دیا۔ اپنی حکمرانی انہیں خطرے میں محسوس ہوئی۔

''نہیں...... نہیں یہ عشق کا بھوت چار دن میں اتر جائے گا۔ میرا بیٹا میرے بنا سانس بھی نہیں

لے پاتا' ممتا کی محبت کی جڑیں بہت گہری اور مضبوط ہیں۔'' انہوں نے بدگمانیوں کو سر جھٹک کر دور بھگایا۔

فرمانبردار بیٹا اُن کا غرور تھا آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سرور تھا۔ اُن کی راج دھانی پر قابض ہونا آسان نہیں تھا۔ اپنی صلاحیتوں پر انہیں ناز تھا۔ جوڑ توڑ اور گھریلو سیاست میں اُن کو مات دینا سہل نہ تھا۔

وہ اپنی ذات کے زعم میں مبتلا تھیں۔ لیکن اب کی بار بازی پلٹ گئی تھی' بسمہ تصدق چالاکی میں اُن سے چار قدم آگے تھی۔ اب اُس کا وقت تھا' وہ سیر کو سوا سیر تھی۔ اُس کی تیکھی ناک اور مغرور آنکھیں مدمقابل کو خواہ مخواہ چیلنج دیتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ زرینہ بیگم کی ساری چالیں اب اُلٹی پڑنے والی تھیں۔ سب خوش اور مطمئن تھے لیکن بہو بیگم کے رنگ ڈھنگ دیکھ کے اُن کے سینے میں جیسے ایک پھانس سی اٹک گئی تھی۔

ایک مہینے میں ہی بسمہ نے خوب پر پرزے نکال لیے تھے' بظاہر لہجہ شہد آگیں ہوتا لیکن اداؤں میں خودسری پنہاں تھی۔ وہ پورے گھر میں تتلی کی طرح آنچل لہراتی اڑتی پھرتی۔

''پاپا' میں آپ کے لیے چائے لاؤں؟'' وہ لاڈ سے سسر کے گلے میں باہیں ڈال کر کہتی تو وہ نہال ہو جاتے۔

''ارے بھئی ہم تو کب سے انتظار کر رہے ہیں اپنی بیٹی کے ہاتھ کی چائے پینے کا۔'' وہ اکلوتی بہو کے دلار اٹھانے کو جیسے تیار رہتے۔

''اوہ...... پاپا...... آپ دنیا کے سب سے اچھے پاپا ہیں۔'' اپنی زبان کی شیرینی اور حلاوت سے اُس نے شوہر کے علاوہ سسر کو بھی مکمل طور پر قابو میں کر لیا تھا۔

''ماں! آپ کتنی خوش نصیب ہیں' آپ کو بسمہ جیسی کیئرنگ بہو ملی ہے۔'' قریب بیٹھے بیٹے نے اک احساس تفاخر سے کہتا تو کچن کی طرف قدم بڑھاتی نئی نویلی دلہن کی گردن میں مزید کلف لگ جاتا۔

''ہاں بیٹے۔'' انہوں نے کمزور سے لہجہ میں تائید کی۔

وہ اِس وقت مکمل طور پر ایک ٹرانس میں تھیں۔ انہیں لگا جیسے کسی غیبی طاقت نے انہیں کئی سال پیچھے ماضی میں دھکیل دیا ہے۔

''بے جی' آپ کتنی خوش نصیب ہیں...... خوش نصیب...... خوش نصیب......'' دفعتاً اُن کے کان سائیں سائیں بجنے لگے۔

''خدایا' یہ کیسی آوازیں ہیں؟'' انہوں نے جیسے خودکلامی کی۔

''زرینہ بی بی...... کردار بدل گئے ہیں......'' سمے نے اُن پر پھبتی کسی۔ وہ خوفزدہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

''کیا ہوا اماں؟ آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی؟'' بہو چائے کا مگ ہاتھ میں لیے ناقدانہ نگاہوں سے انہیں تکتی ہوئی مستفسر تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' انہوں نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے سرد لہجہ میں کہا۔ ساس کی حاکمانہ طبیعت اور بے لچک رویے سے بہو بیگم مختصر سے عرصہ میں ہی خوب آگاہ ہو چکی تھیں' سو اگر زرینہ بیگم اُس سے فاصلہ بنائے ہوئے تھیں' تو اُس کی طرف سے بھی گرم جوشی مفقود تھی' اُس کی یہی سرد مہری زرینہ بیگم کو کھٹک رہی تھی۔ وہ اُس پر اپنا رعب اور دبدبہ رکھنے کے لیے زیادہ منہ لگانے کی روادار نہ تھیں' تاکہ اُسے انگوٹھے تلے دبا کے رکھا جا سکے' لیکن جواباً اُس کی بے نیازی پر وہ کھول

کے رہ جاتیں۔

''ارے بیگم' کہاں کھوجاتیں ہیں آپ بار بار؟'' شوہر نے اُن کی غائب دماغی محسوس کی تو ٹوک دیا۔

''نہیں...... وہ...... بس سر ذرا بھاری ہو رہا ہے۔'' انہوں نے کنپٹیوں کو ہولے سے دبایا۔

''اوہو...... تو پھر بسمہ بیٹی کے ہاتھ کی خوش ذائقہ اور خوشبودار چائے پئیں۔ سر درد پل بھر میں بھاگ جائے گا۔'' انہوں نے چائے کا کپ انہیں تھماتے ہوئے ایک طمانیت سے کہا' جسے انہوں نے بے دلی سے تھام لیا۔

شوہر اور بیٹا جنہیں اُن کے علاوہ کسی کے ہاتھ کی بنی چائے پسند نہ تھی' آج صرف بسمہ کی تعریفوں میں رطب اللسان تھے۔ اُن کا دل مزید بوجھل ہوگیا۔ وہ اُس کل کی لڑکی سے مقابلہ کر رہی تھیں اُسے اپنا حریف بنانے پر تلی ہوئی تھیں' انہیں خود پر حیرت ہوئی۔

''میں تھک گئی ہوں' مجھے اب ریسٹ کرنا چاہیے۔'' وہ جیسے وہاں سے بھاگنا چاہ رہی تھیں۔

''نہیں ماں! بیٹھیں ناں...... کتنا اچھا لگ رہا ہے سب مل کر باتیں کر رہے ہیں' میں آپ کے لیے ابھی پین کلر لے کر آتی ہوں۔'' بہو نے گویا اُن کے فرار کی راہیں مسدود کر دیں۔ تفکر زدہ لہجہ میں جیسے جہانوں کی فکر پنہاں تھی۔ شوہر کی موجودگی میں اُس کا اندازِ گفتگو مکمل طور پر بدل جاتا تھا۔

''بھئی بیگم آپ واقعی بہت خوش نصیب ہیں جو آپ کو بسمہ بیٹی جیسی بہو ملی ہے۔'' شوہر صاحب بھی معترف ہوئے۔

''خوش نصیب...... خوش نصیب......'' پھر انہی آوازوں کی تکرار۔

''خدایا...... نہیں......'' انہوں نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

اِن آوازوں کی بازگشت اُن کے پردہ سماعت پر پتھر برسانے لگی۔

اور...... لمحوں میں وہ ہوش وخرد سے بیگانہ ہوکر کرسی پر جھول گئیں اور پھر وہ کئی گھنٹوں بعد ہوش میں آئیں تو اُن کے لبوں سے ادا ہونے والا پہلا لفظ بے جی تھا۔

''زرینہ بے جی سے بہت لگاؤ رکھتی تھی' یاد آرہی ہوں گی' تبھی اتنا اسٹریس لے لیا پگلی نے...... تمہاری ساس بہت ہی محبت کرنے والی بہو تھی۔'' وہ بہو سے بیوی کے گنوں کا تذکرہ بہت محبت سے کر رہے تھے۔

''جی پاپا...... یقیناً ماں دادو کو بہت مس کر رہی ہیں۔'' بیٹے نے ماں کے ماتھے کا بوسہ لیا۔

شوہر کے لہجے کا مان بھروسہ اور یقین اُن کے اندر ڈھیروں ملال بھر گیا۔ زرینہ بیگم نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ چپ اُن کے لبوں پر سانپ کی طرح کنڈلی مار کے بیٹھ گئی۔

بن موسم کی برسات تھی۔ ٹپ ٹپ برستی بارش گویا اُن کے دل میں چھید کر رہی تھی۔ آسمان سے برستے پانی کی اپنی الگ ہی زبان تھی جیسے آسمان کی گود سے گرنے والی ہر بوند انہیں اپنی کہانی سنانے کو بے تاب ہو۔

''میری بھی تو ایک کہانی ہے...... میں کیسے سناؤں؟'' وہ جیسے برستی بوندوں سے مخاطب ہوئیں...... اُن پر پھر وہی عجب سی کیفیت وارد ہو رہی تھی۔ وجود جیسے ڈھیروں بوجھ تلے دب گیا ہو۔

لیاقت صاحب انہیں ڈھونڈتے ہوئے برآمدے میں آئے تو وہ آرام کرسی پر گم صم سی بیٹھی تھیں۔

''ارے بیگم کہاں گم ہیں آپ؟'' انہوں نے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کو مصنوعی خفگی سے کہا۔

''آپ؟'' وہ غائب دماغی سے انہیں دیکھنے لگیں۔

''کیا ہوگیا ہے آپ کو؟ ان دنوں اتنی کھوئی کھوئی سی کیوں رہتی ہیں؟ بہو کے قدم گھر میں پڑتے ہی اتنی بڑی خوش خبری ملی ہے...... پوتے کو گود میں کھیلانے کی خواہش بھی پوری ہونے کو ہے' پھر کس اُلجھن میں ہیں آپ؟'' وہ بغور اُن کے چہرے کے اتار چڑھاؤ جانچتے ہوئے متفکر ہو رہے تھے۔ اب وہ شوہر سے کیسے کہتیں کہ اُن کا راج پاٹ خطرے میں ہے بس خاموشی میں عافیت تھی۔

''آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں' ایسا کچھ نہیں ہے...... بس میری طبیعت کچھ ناساز ہے۔'' وہ صاف ٹال رہی تھیں۔

لیاقت صاحب نے بھی فی الوقت زیادہ کریدنا مناسب خیال نہیں کیا' شاید وہ انہیں کچھ وقت دینا چاہتے تھے۔

''شام ڈھل رہی ہے' میں رات کے کھانے کی تیاری کرلوں۔'' وہ غالباً منظر سے ہٹنا چاہ رہی تھیں۔ نظریں چرا کر بولیں۔

ہم م م......'' انہوں نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ زرینہ بیگم کی ذات کا یہ بدلاؤ انہیں گہری سوچ میں مستغرق کر گیا۔

کھانے میں آج کچھ اپنے بیٹے کی پسند کا بناؤں گی...... باورچی خانے میں قدم رکھتے ہی انہوں نے سوچا۔

''ماں! کتنے دن ہوگئے ایگ فرائیڈ رائس اور چکن منچورین کھائے ہوئے۔'' کل ہی تو وہ لاڈ سے شکوہ کناں تھا۔

''آج تو چکن منچورین اور ایگ فرائیڈ رائس ہی بنیں گے۔'' فریزر سے چکن نکالتے ہوئے انہوں نے جیسے خود سے کہا۔ مامتا نے چہرے پر اک سجل سی مسکراہٹ بکھیر دی۔

''ارے ماں! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' پھر آپ کچن میں کیا کر رہی ہیں؟'' کتنا خوش کن احساس تھا کہ وہ لمحہ پہلے جیسے سوچ رہی تھیں' وہ اب اُن کے گلے میں بانہیں ڈالے کھڑا تھا۔

''میری طبیعت کو کیا ہوا' بالکل ٹھیک ہوں...... اور تو آفس سے کب آیا؟'' انہوں نے اک بھرپور نظر اُس کے صحت مند وجود پر ڈالی۔

''میں تو دوپہر میں ہی آگیا تھا۔'' وہ لاپرواہی سے بولا۔

ماں کے دل کو دھکا سا لگا...... آفس سے آنے کے بعد وہ سب سے پہلے انہی کے کمرے میں آتا تھا۔ اُن سے ملنے کے بعد ہی وہ اپنے روم میں جاتا تھا۔

''مجھے بتایا ہی نہیں کہ آفس سے آگئے ہو' ملنے بھی نہیں آئے ماں سے۔'' انہوں نے کمزور سی آواز میں شکوہ کیا۔

''اوہو ماں! کیا کہوں اب......! دوپہر میں میری طبیعت کچھ اپ سیٹ ہوگئی' انہیں کال کیا کر دی' سب چھوڑ چھاڑ بھاگم بھاگ گھر آگئے' شاید اِسی لیے بھول گئے ہوں گے۔''

بہو بیگم جانے کب سے دروازہ کے فریم میں ایستادہ تھیں' ترنت شوہر کی کوتاہی چھپانے میدان میں کود دیں۔ زرینہ بیگم کے حلق تک کڑواہٹ اتر

گئی۔ وہ شعوری کوششوں کے تحت ماں بیٹے کے درمیان آ رہی تھی۔

''اِس حالت میں طبیعت اکثر خراب ہو جاتی ہے تمہیں مجھ سے کہنا چاہیے تھا نہ کہ شوہر کو اٹھا کر فون کر ڈالا۔'' اُن کا لہجہ بے حد سرد تھا۔ وہ بے جی نہیں تھیں، تحمل برداشت انہیں چھو کر نہیں گزرا تھا۔ بسمہ امید سے تھی۔ اُس کے چونچال دن بہ دن بڑھتے جا رہے تھے۔ جو ساس کو تاؤ دلانے کے لیے کافی تھا۔

بسمہ نے شکوہ کناں نظروں سے شوہر کو دیکھا، جو ماں کے فطری غصے سے بھی واقف تھا اور بیوی کی نازک مزاجی سے بھی......

بسمہ کے ماتھے پر گہری ہوتی سلوٹیں اُس کی نظرں سے پوشیدہ نہیں رہ سکیں، وہ صورتِ حال سنبھالنے کو آگے بڑھا حسین بیوی کی ناراضگی اِک پل کو گوارہ نہ تھی۔

''ماں آپ جانتی ہیں بسمہ بہت حساس ہے، گھبرا کر مجھے فون کر دیا تو کون سی قیامت آ گئی؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی احتشام کا لہجہ تلخ ہو گیا، شاید وہ اِس لاحاصل بحث سے اُکتا گیا تھا۔

بسمہ نے ایک جتاتی ہوئی تفاخر بھری نظر ساس پر ڈالی، گویا یہ جنگ کا بگل تھا کہ تمہارا وقت گیا، اب میرا وقت ہے۔ زرینہ بیگم ٹھٹک گئیں۔

شاید وقت بدل رہا تھا...... سب کچھ بدل رہا تھا...... اُن کا کوکھ جنا بدل رہا تھا۔

انہوں نے ایک گہری ملامت بھری نگاہ بیٹے پر ڈالی، جو اُن کا پرتو تھا...... انہی کی طرح ہٹ دھرم، خود پسند اور ہٹیلا...... اُس ایک نگاہ میں کیا کچھ تھا...... ڈھیروں شکوے، درد...... احتشام کو اپنے لہجہ کی سختی کا احساس ہوا۔

''آئی ایم سوری ماں...... میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔'' انہیں گم صم دیکھ کر وہ آگے بڑھا۔ ماں کی اپنے لیے بے حساب چاہت سے وہ بخوبی واقف تھا۔ انہیں یوں دکھ دینا اُسے گوارہ نہ تھا۔

زرینہ بیگم نے بھی لمحوں میں خود کو کمپوز کیا، وہ بیٹے کا موڈ مزید خراب نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

''اچھا چھوڑو اِن فضول باتوں کو...... ترے لیے چائینیز بنا رہی ہوں۔'' انہوں نے شوق سے بتایا۔ ماحول پر چھائی کثافت دور ہونے لگی۔ ماں بیٹے کے اِس ایموشنل ڈرامے پر بسمہ کی کوفت حد سے سوا ہونے لگی۔

''واؤ چائینیز......'' اُسے چائینیز فوڈ بے حد مرغوب تھا۔

''آپ کے ہاتھ کا بنا کھانا تو یہ روز کھاتے ہیں، آج اِن کے لیے کھانا میں بناؤں گی......'' چوپنگ بورڈ پر پیاز کاٹتی زرینہ بیگم کے ہاتھ سے چھری لیتے ہوئے بہو نے اتنی محبت سے کہا کہ کچھ کہنے کی خواہش اُن کے لبوں میں دبی رہ گئی۔

بسمہ تصدق عیاری میں زرینہ بیگم سے چار ہاتھ آگے تھی۔ اُس نے شوہر کی موجودگی میں ایک پل کو بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ کچھ لمحے پہلے ماحول میں کس قدر تناؤ تھا۔

''صرف آج...... نہیں محترمہ...... اب ہر روز میرے لیے کھانا آپ ہی بنائیں گی۔'' اُس نے بیوی کی تیکھی ناک مروڑی، تو وہ ساس کے سامنے اس بے باکی پر جز بز ہو گئی۔ زرینہ بیگم اپنی جگہ پر ساکت رہ گئیں۔

اُن کا بیٹا اُن کے علاوہ شاید ہی کسی کا بنا ہوا کھانا پسند کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ایسا ہی نخریلا تھا۔ پھر اِس بدلاؤ کی وجہ...... کوئی یوں بھی بدل جاتا ہے۔ وہ انہی کے سامنے اپنی بیوی سے پکوان کی فرمائشیں کر رہا تھا۔ کیا اُن کی ذات کو اُن کی اپنی جنمی اولاد رد کر رہی تھی۔ ذات کی نفی اور کسے کہتے ہیں؟

سوچوں کی یلغار نے اُن کے دماغ کو جیسے ماؤف کر دیا۔ کل کی اکل کھری عورت آج کی بے بس ماں تھی۔

''اوہو ماں آپ کن کٹھن گھیریوں میں کھو جاتی ہیں؟'' وہ جانے کیا الا بلا بول رہا تھا۔ وہ سن ہی کب رہی تھیں؟ وہ بے جی کی طرح گونگی اور بہری بنی شکستہ قدموں سے چلتی ہوئی کچن کی چوکھٹ پار کر گئیں۔

☆......☆......☆

بسمہ نے بالکل غیر محسوس انداز میں آہستہ آہستہ گھر کے تمام اختیارات اُن کے ہاتھ سے لے لیے تھے۔ کچن سے لے کر گھر کی چابیاں اور بجٹ سب کی وہ کلی مختار بنا دی گئی تھی۔ اپنی شاطر چالوں سے اُس نے انہیں یوں چت کیا تھا کہ اُن کی حالت اب کسی ہارے ہوئے جواری کی سی ہو گئی تھی۔ اُن کے اقتدار کا سورج ڈوب گیا تھا۔ اور...... زوال کی کہانی شروع ہونے کو تھی۔

شوہر اور بیٹا جو کل تک اُن کی تعریفوں میں رطب اللسان تھے اب اُن کے لبوں پر ہمہ وقت ایک ہی نام رہتا...... 'بسمہ بسمہ' وہ گھر کی چابیاں اور بجٹ کسی صورت اُسے دینے کو تیار نہ تھیں لیکن اُس بھولی صورت والی نے جانے کیا جادو چلایا تھا کہ شوہر اور بیٹے کے سامنے اُن کی ایک نہ چلی۔ وہ سخت رنجیدہ خاطر تھیں۔ جب بیٹے نے ماں کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔

''ماں! بس اب آپ اپنی ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیجیے۔''

''تیرا بس چلے تو ماں کی موت کا اعلان بھی کروا دے تا کہ اپنی بیوی کے ساتھ میرے گھر میں خوب من مانی کر سکے۔'' اُن کا سخت لہجہ چٹانوں سی سختی لیے ہوئے تھا۔

وہ حتی المقدور کوشش کر رہی تھیں کہ برسوں کی محنت رائیگاں نہ جائے اور شوہر اور بچوں کی نظر میں بنا اُن کا عظیم بت ہمیشہ قائم رہے، لیکن اُن کا یہ لب و لہجہ سب کے لیے قطعی اجنبی تھا، سو وہ ہکا بکا رہ گئے۔

''ماں! آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے؟'' وہ شاکی نظروں سے انہیں تکنے لگا۔

''بیگم، آپ شانت رہیے، ویسے بھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، غصہ آپ کی صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔'' بیٹے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں دلاسہ دیتے ہوئے انہوں نے بیوی کو بہلایا۔

''اِسی لیے میں یہ ذمے داری اٹھانے سے پہلو تہی کر رہی تھی، تا کہ گھر میں کوئی ایشوز کھڑے نہ ہوں۔'' بہو بیگم معصومیت بھرے اخلاص کی انتہا پر تھیں۔

''میری طبیعت آپ کی بہو کے آنے کے بعد ہی خراب رہنے لگی ہے۔'' شوہر کی طرف شکوہ کناں نظروں سے تکتے ہوئے وہ کاٹ دار لہجے میں بولیں، تو بہو اور بیٹا اپنی جگہ پر پہلو بدل کر رہ گئے۔

''اور ویسے بھی میری طبیعت اب اتنی بھی خراب نہیں رہتی کہ میں اپنے گھر کی خود سے دیکھ بھال نہ کر سکوں۔'' انہوں نے بہو کی طرف جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''بس کریں بیگم، بہت ہو گئی آپ کی من مانی، بسمہ بیٹی کوئی غیر نہیں ہے، اِس گھر کی اکلوتی بہو ہے، اور پھر سب کچھ ہمارے بچوں کا ہی تو ہے۔''

بیگم کی ہٹ دھرمی انہیں شدید کوفت میں مبتلا کررہی تھی' سوچ کر بولے۔
''پاپا ہم نے تو صرف ماں کی محبت میں یہ فیصلہ لیا تھا کہ اس گھر کی ساری ذمے داریاں اور بوجھ اٹھانا اب بسمہ کا فرض ہے کہ ماں ساری زندگی اِس گھر کے بکھیڑوں میں اُلجھی رہیں لیکن یہاں تو اُلٹا فضیحتہ کھڑا ہوگیا۔'' اکلوتا بیٹا سخت برآفروختہ ہورہا تھا۔ بہو کا منہ الگ سوج کر کپا ہوگیا تھا۔ دونوں تن فن کرتے واک آؤٹ کرگئے۔
شوہر نے ایک ملال بھری نگاہ اُن پر ڈالی' تو وہ چورسی بن گئیں۔
''سوچا تھا کہ اولاد کی ذمہ داریوں سے فارغ ہوگئے ہیں اب اللہ اللہ کریں گے حج پر جائیں گے' پوتے پوتیوں کو گودوں کھلائیں گے لیکن......'' زرینہ بیگم کو مکمل نظرانداز کرتے ہوئے بڑبڑاتے وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔
کمرے میں تنہائیاں چیخنے لگیں اور دکھ شور مچانے لگے۔ وہ مسمرائز سی اپنی جگہ پر بیٹھی رہ گئیں۔ سسکیاں اُن کے لبوں سے گویا چپک کررہ گئیں۔
''بے جی......!'' ایک مانوس آواز نے کمرے کا سکوت توڑا۔
''کیا یہ آواز اُن کے حلق سے نکلی تھی؟'' وہ خوفزدہ ہوئیں۔ ساکن فضاؤں میں جیسے بددعائیں رقص کرنے لگیں۔ ہوائیں جیسے ماں کے ٹوٹے دل پر نوحہ کناں تھیں۔ خاموشی بین زرینہ بیگم کی سماعتوں میں جیسے سیسہ انڈیلنے لگے۔
''بے جی...... میری بے جی......'' اُن کے لبوں سے سسکاری نکلی۔
''بے جی' خدایا' اِس وقت بے جی کیوں یاد آنے لگیں؟'' وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھیں۔
عجب ناسمجھی کا عالم تھا۔ وہ شعور سے لاشعور تک کے سفر میں اُلجھی ہوئی تھیں۔
انہیں بے جی کی خاموش آنکھیں یاد آنے لگیں۔ بارہا نم ہوتی آنکھیں...... قطرہ قطرہ اشک پیتی' سسکتی آنکھیں...... زرینہ بیگم کے دل پر بوجھ بڑھنے لگا' سانس جیسے سینے میں گھٹ کے رہ گئی' وہ بوجھل قدموں سے دریچے میں آن کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے بے جی پر کیسے کیسے ظلم نہیں ڈھائے تھے...... لیکن اُن کی زبان پر کبھی کوئی شکوہ تک نہیں آیا تھا۔
''کیا وہ فطرتاً ہی اتنی صابر تھیں؟......'' انہیں بے جی کا صبر یاد آیا۔
''یہ کوئی شکوہ شکایت کیوں نہیں کرتیں؟'' تب وہ سوچا کرتیں شاید بڑھیا بہت ہی چالاک اور میسنی ہے' وہ کلس کررہ جاتیں۔
''شاید مجھ پر بے جی کا صبر پڑا ہے۔'' انہوں نے سوچا۔
''شاید...... یقیناً تجھ پر ایک بے بس مجبور ماں کا صبر پڑا ہے۔'' اُن کے ضمیر نے حددرجہ پھٹکارا۔
اشکوں کا ایک سیل رواں تھا۔ جو اُن کی آنکھوں سے بہہ نکلا تھا۔
''ہاں...... ہاں...... مجھے ایک ماں کی بددعا لگی ہے' اسی لیے میرا آشیانہ یوں بکھر رہا ہے۔''
''اللہ! مجھے معاف کردے۔'' وہ ڈھے سی گئیں۔
گھر کا ماحول سخت کشیدہ اور تناؤ لیے ہوئے تھا۔ بہو بیٹے نے تو مکمل طور پر کنارہ کشی کرلی تھی' شوہر بھی کترائے کترائے رہتے۔ بیٹا انہیں دیکھ

کر سلام کیے بنا ہی دھم دھم کیے گزر جاتا۔ بیٹے کے رویے نے انہیں توڑ کر رکھ دیا۔ وہ مکمل طور پر بیوی کے کنٹرول میں تھا۔ اس ذہنی دباؤ اور ٹینشن نے انہیں سچ میں بیمار کردیا۔ وہ شدید ڈپریشن میں چلی گئیں۔
زندگی کا عجیب فیز چل رہا تھا جوں جوں شام ڈھلتی انہیں ہول پڑنے لگتے اور رات اُن پر بہت بھاری گزرتی۔
''میں قاتل ہوں...... میں نے قتل کیا ہے...... میں قاتل ہوں...... دور رہو سب مجھ سے؟'' وہ دفعتاً نیند سے اٹھ کر چیخنے لگتیں۔ پورا بدن پسینے سے شرابور ہوتا اور سانس دھونکنی کی مانند چل رہی ہوتی' وہ جیسے حواس سے بیگانہ ہوتی جارہی تھیں۔
''زرینہ' یہ کیا اول فول بک رہی ہو؟'' لیاقت صاحب نے انہیں جھنجوڑ ڈالا تو وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہوکر اُن کی بانہوں میں جھول گئیں۔ وہ حددرجہ پریشان ہوگئے تھے۔
زرینہ بیگم کی مخدوش حالت کے پیش نظر انہیں شہر کے مشہور سائیکاٹرسٹ کے زیرعلاج رکھا گیا۔ اب وہ اپنے کمرے تک محدود ہوکر رہ گئیں۔
موقع پرست بہو نے اِن حالات میں خوب فائدہ اٹھایا۔ اب سارے اختیارات اور گھریلو اخراجات اُس کے کنٹرول میں تھے' زرینہ بیگم نے بھی چپ سادھ لی تھی۔
ماں کی بیماری نے احتشام کو پھر سے اُن کے قریب کردیا تھا' لیکن بہو اور بیٹے کے ساتھ اُن کا رویہ بدستور سرد تھا' جس کی بسمہ کو مطلق پرواہ نہ تھی' جبکہ احتشام بولایا بولایا پھرتا' بیٹیوں کے مائیکے کے چکر بڑھ گئے۔ لیکن اُن کی خاموشی ہنوز رہی۔
گھر میں جز وقتی ملازمہ تھی' جسے فارغ کرکے کل وقتی ملازمہ کا بندوبست کردیا گیا تھا۔ بسمہ کی حالت کے پیش نظر احتشام نے اُسے ہر سہولت دے رکھی تھی' اس کے باوجود نندوں کی آمدورفت اُس کا موڈ خراب کیے رکھتی۔ بھابی کے ماتھے کے بل اُن سے چھپ نہ رہ سکے۔ دل برداشتہ ہوکر ماں سے شکایت کی لیکن جواب ندارد......!
بسمہ بی بی اب خوب پرپرزے نکال رہی تھی' دھیرے دھیرے اُس کا اصلی روپ کھل رہا تھا۔ ساس کی دیکھ بھال تو دور اُن کے کھانے پینے تک کا خیال نہیں رکھتی تھی' لیکن بیٹے کی آنکھوں پر مسلسل پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بیٹے اور شوہر کے آفس جانے کے بعد وہ گھنٹوں بھوکی رہتیں۔
ایک روز لیاقت صاحب دوپہر میں اچانک گھر آئے تو دیکھا کہ بہو بیگم ڈائننگ ٹیبل پر اکیلی کھانا تناول فرمارہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر وہ اچانک گڑبڑا گئی۔ بیگم کو وہاں نہ پاکر اُن کا موڈ سخت خراب ہوگیا۔ وہ اپنے کمرے میں گئے تو وہ تنہا سوچوں میں ڈوبی خلاؤں میں تک رہی تھیں۔ انہیں سخت طیش آیا۔
''تم نے اپنی ماں کو ابھی تک کھانا نہیں دیا' دوپہر کے تین بج رہے ہیں۔'' انہوں نے سختی سے بازپرس کی تو وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگی۔
شام میں احتشام نے بھی اُسے باتیں سنائیں۔
''وہ بچی تو نہیں ہیں کہ کچن سے کھانا تک خود نہیں نکال سکتیں؟'' اُسے بھی سخت تاؤ آیا تو شوہر کے دوبدو کھڑی ہوگئی۔
''بے وقوف عورت' وہ بیمار ہیں۔'' احتشام نے متاسفانہ نظروں سے گھورا تو وہ پھٹ پڑی۔
''اوہ...... میں جو سارا دن اِس حالت میں صبح سے شام تک اِس گھر کے کام کرتی ہوں' پھر بھی

آپ کی نظر میں غیر ذمہ دار ہوں' ذرا کوتاہی کیا ہوگئی' مجھے کٹہرے میں لاکھڑا کیا اِن لوگوں نے......'' زور زور سے چلاتے ہوئے وہ ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی۔ اور اُس کے آنسو احتشام کو زیر کرنے لگے۔

اب بسمہ بی بی کے نخرے تھے اور اُس کی معافیاں......

گھر کا ماحول یاسیت لیے ہوئے تھا۔ بسمہ نے زرینہ بیگم کے گرد اپنا گھیرا مزید تنگ کرنا شروع کردیا تھا وہ اُن کی ہر بات کی نفی کرتی' اور انہیں ستانے کا ہر ہتھکنڈہ استعمال کرتی۔ زرینہ بیگم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جارہا تھا۔

''میسنی بڑھیا' بیماری کا ڈرامہ خواہ مخواہ رچائے ہوئے ہے صرف شوہر اور بیٹے کی توجہ اپنی ذات تک محدود رکھنے کے لیے ہونہہ......'' وہ لاؤنج میں بیٹھی تسبیح کررہی تھیں' جب کچن میں جاتی بسمہ نے تنفر بھری نظر اُن پر ڈالتے ہوئے سوچا۔

''بہو......'' آج کتنے ہی دنوں بعد انہوں نے اُسے مخاطب کیا تھا۔ بادل نخواستہ اُسے رکنا پڑا لیکن جواب دینے کی بجائے ایک کٹیلی استفہامیہ نگاہ ڈالنے پر ہی اکتفا کیا۔ زرینہ بیگم اب اُس کے تیوروں کی عادی ہوگئی تھیں' سو نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

''آج چھوٹی (بیٹی) اپنے بچوں اور میاں کے ساتھ کافی دنوں بعد آرہی ہے' کھانے میں بریانی اور قورمہ بنالو' وجاہت (داماد) نے بہت دنوں بعد خود سے بریانی کی فرمائش کی ہے۔'' لہجے کو نسبتاً نرم رکھتے ہوئے وہ مصالحانہ انداز میں بولیں۔

نند کی آمد کا سن کر بسمہ کا حلق تک کڑوا ہوگیا۔

''سوری ماں! میں آلو گوشت چڑھا کر آئی ہوں' اِس حالت میں یہ نت نئی فرمائشیں پوری نہیں کرسکتی۔'' اس کا سرد اور بے لچک لہجہ حد درجہ سختی لیے ہوئے تھا۔ وہ بدلحاظی کی انتہاؤں پر تھی۔

اُس کے صاف جواب نے زرینہ بیگم کے چودہ طبق روشن کردیے' انہیں اِس قدر بدتمیزی کی توقع نہ تھی۔

''نت نئی فرمائشیں......'' یہ جملہ میں نے کہاں سنا تھا' اُن کے کان سائیں سائیں بجنے لگے۔

''نت نئی فرمائشیں...... کتنا سنا سنا سا تھا یہ جملہ......!'' وقت نے کردار بدل دیئے تھے۔ کئی سال پہلے یہ لفظ اُن کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔

''جو پکا ہے کھالیں' میں روز روز آپ کی نت نئی فرمائشیں پوری کرنے سے قاصر ہوں بے جی......'' انہیں یاد آیا تو وہ ساکت سی بسمہ کو تکنے لگیں۔

اُن کے ایک ٹک دیکھنے پر بسمہ کی کوفت حد سے سوا ہوگئی۔

''کیا چاہتی ہیں آپ؟ احتشام پھر سے جھگڑا کرے مجھ سے......؟ پاپا اور احتشام دونوں کی نظروں میں گرانا چاہتی ہیں ناں مجھے......؟'' وہ تیز لہجہ میں اُن پر چلانے لگی۔

''نہیں...... وہ چھوٹی (بیٹی) کافی دنوں بعد......'' وہ غائب دماغی سے گھگھیا کر بولیں۔

''کافی دنوں بعد......؟'' بسمہ استہزائیہ ہنسی۔

''آپ کی بیٹیوں کا دل سسرال سے زیادہ مائیکے میں اٹکا رہتا ہے' روز روز کی آمدورفت سے میں سخت تنگ ہوں' اس پر مستزاد نئی نئی فرمائشوں کا

سلسلہ...... حد ہے بھئی بے شرمی کی......'' وہ ساس کو بے نقط سنا رہی تھی۔

آج بہو نے بدتمیزی اور بدلحاظی کی ہر حد پھلانگ لی تھی' لیکن زرینہ بیگم کو تو صرف ایک ہی لفظ کی تکرار سنائی دی۔

''فرمائشیں...... فرمائشیں......'' اُن کا رنگ خطرناک حد تک زرد ہورہا تھا۔

اُن کی خاموشی پر بسمہ کھٹک گئی اور اُن کے چہرے کے تاثرات بغور جانچنے لگی۔

دفعتاً مٹی کے اُس بت میں حرکت ہوئی۔

''میں بے جی کے پاس جارہی ہوں۔'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتیں گیٹ کی طرف گئیں۔ اُن کی بڑبڑاہٹ بسمہ کے کانوں تک پہنچی تو وہ اِس غیر متوقع ری ایکشن پر گڑبڑا گئی۔

''ارے...... ارے کہاں جارہی ہیں آپ؟'' وہ گھبراہٹ میں اُن کے پیچھے بھاگی لیکن وہ تیزی سے گیٹ پار کرگئی تھی۔

''یہ تو سچ میں کھسک گئی ہیں۔'' وہ بھونچکی رہ گئی۔

''اب احتشام اور پاپا کے سامنے تو مجھے ہی جوابدہ ہونا ہوگا۔'' وہ دانت کچکچاتی ہوئی ٹیلی فون کی طرف بڑھی۔

کپکپاتے ہاتھوں سے زرینہ بیگم رکشہ سے اتریں۔ اور قبرستان کی طرف بڑھیں۔

''باجی جی...... کرایہ۔'' حواس باختہ سی یہ عورت رکشہ ڈرائیور کو عجیب سی لگی۔

''کرایہ......؟'' وہ خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگیں' دفعتاً نگاہ کلائیوں پر پڑی تو سونے کی ایک چوڑی اُتار کر اُسے تھمادی۔ رکشہ ڈرائیور تحیر زدہ رہ گیا۔

''بی بی! کرایہ نہیں تھا تو آپ میرے رکشے میں بیٹھی ہی کیوں......؟'' چوڑی واپس تھماتے ہوئے وہ چڑ کر بولا۔

''کیسے کیسے پاگل لوگ متھے لگ جاتے ہیں۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا واپس ہولیا۔

''بے جی! مجھ ناعاقبت اندیش کو معاف کردیں' میں آپ کی گناہ گار ہوں' آپ کی مجرم ہوں' خدا کے لیے بے جی۔'' اُن کی قبر پر سر پٹختے ہوئے وہ دھواں دار رو رہی تھیں۔

کئی سال بعد اُن کا غافل ضمیر جاگا تھا' تو وہ جرم انہیں رُلا رہا تھا' تڑپا رہا تھا' جو کئی سال پہلے اُن کے ہاتھوں سرزد ہوا تھا۔ لالچ کے آسیب نے انہیں جکڑلیا تھا۔

''برسوں پہلے ایک رات...... وہ منحوس رات...... کسی کی آخری ہچکی...... زندگی اور موت کی کشمکش میں جھولتا وہ بے بس نحیف وجود...... تحیر زدہ آنکھیں...... اُن آنکھوں میں بے بسی' اُس بے بسی کا خاموش دکھ...... اور...... اور...... وہ ٹوٹی سانسوں کی ڈوری......''

انہیں ایک ایک کرکے وہ سارے دکھ یاد آنے لگے۔ وہ سارے ظلم یاد آنے لگے' جو انہوں نے ایک بدنصیب' بے گناہ بوڑھے وجود پر ڈھائے تھے۔ جس کی کسی کو خبر تک نہیں تھی۔ لیکن وہ نیلی چھتری والا اُن کے ہر جرم کا گواہ تھا۔

وہ اتنی سنگدل تھیں کہ دنیاوی لالچ میں کسی کی جان سے کھیل گئیں۔

''کیا کوئی اتنا بھی ظالم ہوسکتا ہے......'' اُن کا ضمیر انہیں پھٹکار رہا تھا۔

''میں عام سی گھریلو عورت قاتل کیسے بن گئی؟'' برسوں پہلے کیا جرم انہیں لرزا گیا۔ اتنے برس وہ مطمئن رہیں...... لیکن مجرم کی پکڑ ایک دن تو ہونا ہی تھی۔ آج یوم احتساب تھا۔

☆......☆......☆

بے جی درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک سلیقہ شعار خاتون تھیں، جنہوں نے اپنے شوہر کی کمائی سے پائی پائی جوڑ کر ایک پندرہ مرلے کا گھر اور تین دکانیں خرید رکھی تھیں۔ دکانیں کرائے پر دے رکھی تھیں اور گھر میں وہ رہائش پذیر تھے ایک ایک کر کے سب بیٹے الگ ہو گئے، صرف لیاقت صاحب اُن کے ساتھ رہتے تھے۔ شوہر نے اپنی زندگی میں ہی گھر اور دکانیں اُن کے نام کو دی تھیں۔ اُن کی وفات کے بعد دکانوں کے کرائے کا حساب کتاب بڑے بیٹے کے پاس تھا۔ لیکن اُن کے پردیس میں جا بسنے کے بعد اب لیاقت صاحب ہی کرتا دھرتا تھے۔

جن دنوں بے جی بہت بیمار رہنے لگیں، تو انہوں نے لیاقت صاحب سے کہہ کر جائیداد کی منتقلی کے کاغذات تیار کروائے جس پر زرینہ بیگم کو کھد بد لگ گئی، بے جی کی خواہش تھی کہ اُن کی زندگی میں ہی تمام بچوں کو اُن کا حق دے دیا جائے۔ لیاقت صاحب کو اِس پر کوئی اعتراض نہ تھا، لیکن زرینہ بیگم کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔ وہ بے جی کے مدمقابل آ گئیں۔

''بے جی، دن رات آپ کی خدمت ہم کریں، اور جائیداد آپ اُن میں بانٹنے کا سوچیں جو آپ کو دیکھنا تک گوارہ نہیں کرتے...... یہ کہاں کا انصاف ہے......'' انہوں نے ساس کی کلاس لے ڈالی۔

''خدمت؟'' بے جی نے خاموش استہزائیہ نظروں سے انہیں دیکھا، لیکن ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی میں زرینہ بیگم کا ثانی نہیں تھا۔

بے جی اُن کی لالچی فطرت سے آگاہ تھیں پھر بھی تحمل مزاجی سے سمجھانے لگیں۔

''بیٹی! اُن کی نیت اور اعمال اُن کے ساتھ...... ماں ہونے کے ناطے میرا فرض ہے کہ سب کے ساتھ انصاف کروں۔''

بے جی صبر کی مٹی سے گندھی ہوئی تھیں، لیکن کم بخت شیطان نے زرینہ بیگم کے فسادی دل میں لالچ کا مضبوط بیج بو دیا تھا۔ وہ جان گئی تھیں کہ یہ بحث لاحاصل ہے، بے جی لاکھ تحمل مزاج سہی، لیکن اصولوں پر ڈٹی رہنے والی عورت ہیں۔ وہ تن فن کرتی چلی گئیں۔ لیکن اب وہ موقع کی تلاش میں تھیں اور معصوم بے جی اُن کے مذموم ارادوں سے بے خبر...... وہ گھات لگائے موقع کی منتظر تھیں۔

بے جی شدید بیمار ہو گئیں، اُن کا دل ہارٹ اٹیک کے بعد بے حد کمزور ہو گیا تھا۔ کئی دن ہاسپٹلائز رہنے کے بعد وہ گھر آئی تھیں۔ وہ مکمل طور پر بیڈ پر تھیں۔ انہیں سانس لینے میں شدید دشواری ہوتی تھی، جس کے باعث لیاقت صاحب نے اُن کے بیڈ کے قریب ہی آکسیجن سلینڈر اور ماسک کا انتظام کر دیا تھا۔ اور پھر اُس رات سب کے سونے کے بعد زرینہ بیگم کاغذات لیے اُن کے کمرے میں آئیں اور سادہ لوح اَن پڑھ بے جی کو انگوٹھا لگانے پر مجبور کرنے لگیں۔ بے جی کے مسلسل انکار پر تکرار بڑھ گئی اور اُن کا سانس اکھڑ گیا۔ تو نحیف و نزار سا ہاتھ بے اختیار آکسیجن ماسک کی طرف بڑھا جسے کمال ہوشیاری سے زرینہ بیگم نے دور کر دیا، بے جی بے یقین نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

''پہلے انگوٹھا لگائیں بے جی، پھر ہی آپ کو زندگی نصیب ہوگی۔'' زرینہ بیگم نے پتھریلے لہجہ میں کہا۔ شیطان بھی اُن کی سنگدلی پر شرمار ہا تھا۔

''زرینہ......'' بوڑھا لاچار اور بے بس وجود

کرلایا...... لیکن انہیں مطلق پروا نہ تھی۔ بے جی کا سانس اکھڑ رہا تھا، نگاہ میں التجا تھی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ زندگی سے دور ہو رہی تھیں۔

زرینہ بیگم تیزی سے آگے بڑھیں اور زبردستی اُن کا انگوٹھا کاغذات پر لگا دیا۔ بے جی مزید مزاحمت نہ کر سکیں اور بے دم سی ہو کر بستر پر ڈھے گئیں۔ اُن کی بے نور ہوتی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کو تھیں۔ ماسک زرینہ کے ہاتھ میں ہی رہ گیا، وقت نے مہلت ہی نہ دی۔ بس اک آخری ہچکی اور بے جی زندگی سے ناطہ توڑ گئیں۔

ایک لمحہ کو زرینہ بیگم کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اُن کا مقصد بے جی کو مارنا نہیں تھا بس ڈرا دھمکا کر جائیداد اپنے شوہر کے نام کروانا تھا۔ لیکن بے جی کا بیمار دل اِس صدمے کا متحمل نہ ہو سکا۔ اِس سے پہلے کہ وہ بے جی کو آکسیجن ماسک لگاتیں وہ ریت کے ذروں کی طرح اُن کے ہاتھوں سے پھسل گئی تھیں۔ جاتے لمحوں میں وقت رخصت انہوں نے اُس بدبخت سے زندگی کی بھیک لینا بھی گوارا نہیں کی۔

زرینہ بیگم سخت خوفزدہ ہو گئی تھیں، اُن کے ہاتھوں سے ایک قتل ہو گیا تھا۔

''نہیں...... نہیں...... میں نے اِن کو نہیں مارا...... میں تو آکسیجن ماسک لگانے ہی والی تھی۔'' شاطر دماغ زرینہ بیگم نے لمحوں میں خود کو کمپوز کیا اور واویلا کرنے لگیں۔

''لیاقت صاحب! جلدی آئیے...... دیکھیں بے جی کو کیا ہو گیا۔ ہائے میرے اللہ...... یہ کیا ہو گیا ہے......'' اُن کے زور زور سے چلانے اور رونے کی آواز پر لیاقت صاحب گھبرا کر بھاگ آئے۔

''کیا ہوا بے جی کو......؟''

''شاید سانس نہیں آ رہا، میں تو کمبل اوڑھانے آئی تھی، کہنے لگیں زرینہ لیاقت کی الماری سے جائیداد کی منتقلی کے کاغذات لے آؤ، میں پیپر زلائی تب بھی اچھی بھلی تھیں۔ انگوٹھا لگا کر کہنے لگیں۔ میں نے سب اپنے فرمانبردار بیٹے کے نام کر دیا ہے یہ کاغذات اُسے دے دینا مجھے کچھ بولنے اور سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا اور پھر اچانک اُن کا سانس اکھڑنے لگا۔ ہائے میرے اللہ...... میری بے جی......!'' کمال مکاری سے واویلا کرتے ہوئے انہوں نے خوب کہانی گھڑی تھی۔

بلاشبہ وہ کمال کی ایکٹریس تھیں...... اُن کے بین اور آہ وزاری نے لیاقت صاحب کے ماؤف دماغ کو جھنجھوڑا تو وہ تیزی سے بے جی کے ساکت وجود کی طرف بڑھے۔

''بے جی...... میری بے جی...... میری ماں......'' انتہائی مضطرب ہو کر وارفتگی سے انہوں نے بے جی کے ہاتھ تھامے، جو زندگی کی حرارت سے محروم ہو چکے تھے۔

وہ وہیں ڈھے گئے۔ زندگی کا یہ باب یونہی ختم ہوا، لیکن اب اُسی باب کے گمشدہ پلندے کھل کر اُن کے سامنے آ رہے تھے، جنہیں انہوں نے برسوں پہلے ماضی کی دھول میں دفنا دیا تھا۔

انہیں خبر ہی نہیں ہوئی، جس لمحہ وہ بے جی کی قبر کے سامنے اپنے جرائم کا اعتراف کر رہی تھیں۔ لیاقت صاحب اُن کے پیچھے عقب میں کھڑے تھے۔

''بے جی، میں آپ کی قاتل ہوں، آپ کی مجرم...... مجھے معاف کر دیں۔'' وہ مسلسل نالہ و فریاد کر رہی تھیں۔

لیاقت صاحب کو لگا اُن کے قدم زمین میں

گڑ گئے ہیں...... چاروں اور جیسے دھماکے ہونے لگے۔ غصہ اور نفرت اُن کے لہو میں شرارے بن کر دوڑنے لگا۔ ایک لمحہ کو انہیں لگا کہ اُن کا دل دھڑکنا بند کردے گا۔

''گھٹیا عورت اتنا بڑا دھوکہ...... ساری زندگی تجھے دیوی سمجھ کر پوجتا رہا' اور تو میری ماں کی قاتل نکلی۔'' غصے سے وہ کف اڑانے لگے' آنکھیں سرخ انگارہ ہورہی تھیں۔

''آپ؟'' وہ خوف سے زرد پڑ گئیں۔ برسوں پرانا راز کھل گیا تھا۔ اب کوئی جائے امان نہ تھی۔ لیاقت صاحب کسی عقاب کی طرح اُن پر جھپٹے اور انہیں پے در پے تھپڑوں کی زد میں لے لیا۔

''خدارا...... مجھے معاف کردیں۔'' وہ اُن کے قدموں سے لپٹ کر دہائیاں دینے لگیں...... لیاقت صاحب نے تنفر سے اُن پر تھوک دیا...... صدمے سے اُن کے ہونٹ نیلے پڑ رہے تھے۔

''بے جی......!'' وہ قبر پر گر کر رو دیے۔

''یا اللہ...... مجھ بدنصیب کو موت دے دے۔'' وہ بلک بلک کر رو دیے۔ زرینہ بیگم بے حس وحرکت وہیں گٹھڑی بنی پڑی تھیں۔

''بے جی! میں آپ کا غافل' نالائق بیٹا' یہ سننے سے پہلے مر کیوں نہیں گیا؟'' وہ مسلسل گریہ زاری کررہے تھے' یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے حواس کھودیں گے اور پھر وہیں وہ اپنے پہلو پر ہاتھ رکھے دوہرے ہوگئے' درد سے چہرے کے عضلات تن گئے۔

زرینہ بیگم کو لگا وہ پاتال کی آخری تہہ میں گر گئی ہیں۔ وہ تیزی سے اُن کی طرف بڑھیں لیکن وہ اِس سے پہلے ہی ایک طرف کو لڑھک گئے۔ غم سے زرینہ بیگم پر غشی سی طاری ہونے لگی۔

''خدایا...... میرے مقدر میں معافی نہیں صرف سزا ہے۔'' نیم جان ہوکر انہوں نے سوچا اور بدقت تمام لیاقت صاحب کی سائیڈ پاکٹ سے موبائل نکال کر احتشام کا نمبر ملایا۔ وہ افتاں و خیزاں وہاں بھاگا آیا اور ماں باپ کی دگرگوں حالت دیکھ کر بری طرح سٹپٹا گیا۔

پاپا کو دل کا شدید دورہ پڑا تھا ماں کے بھچے ہوئے ہونٹ' بکھرے بال اور ادھیڑے کپڑے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ اُن کے درمیان کوئی انہونی ہوئی تھی۔ لیکن فی الوقت دونوں ہی کچھ کہنے سننے کی حالت میں نہیں تھے۔

گاڑی ہواؤں سے باتیں کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ ہاسپٹل پہنچ گئے۔ لیاقت صاحب کو فوری آئی سی یو میں ایڈمٹ کیا گیا۔ ماں کے چہرے کے تاثرات اتنے پتھریلے تھے کہ وہ اُن سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کرسکا۔ وہ دانت پر دانت جمائے ساکت بیٹھی تھیں۔ نرس اُن کے ہونٹوں پر جما خون صاف کرکے دوا لگا رہی تھی' جب نڈھال سا احتشام اُن کے پاس آیا۔ تاحال لیاقت صاحب ہوش میں نہیں آئے تھے پریشانی احتشام کے چہرے سے ہویدا تھی۔

''ماں! پاپا کی حالت بہت سیریس ہے' وہ اب تک بے ہوش پڑے ہیں' پلیز مجھے بتائیں ماں' آپ قبرستان کیوں گئیں؟ اور وہاں ایسا کیا ہوا کہ پاپا یوں؟'' وہ روہنسا ہوا تو آواز گلے میں ہی رُندھ گئی۔

زرینہ بیگم ہنوز ساکت وصامت تھیں۔

''پلیز ماں...... کچھ تو بولیں۔'' وہ سخت لاچاری محسوس کررہا تھا۔ لیکن وہ تو گویا اپنے حواسوں میں ہی نہیں تھیں۔ کوئی قیامت تھی جو اُن

پر گزر گئی تھی۔ لیکن وہ انجان تھیں کہ ابھی تو قسمت کے ترکش میں کئی تیر تھے' جو اُن کا جگر چھلنی کرنے کو بے تاب تھے۔

چُپ اُن کے لبوں سے کسی سانپ کی طرح لپٹ گئی تھی۔ اُن کی مخدوش حالت پر احتشام سخت دلگرفتہ تھا۔ کہاں اتنا کروفر اور طنطنہ...... اور کہاں یہ عالم بے چارگی......

''چلیں...... آپ کو گھر چھوڑ دوں' آپ کی حالت یہاں رُکنے کی متحمل نہیں...... پاپا کی دیکھ بھال میں خود کروں گا......'' انہیں کندھوں سے تھام کر اٹھاتے ہوئے وہ بے بسی سے بولا۔

پتھر کے بت میں حرکت ہوئی تھی' وہ بنا چوں چراں کیے لٹے پٹے قدموں سے اُس کے پیچھے ہولیں۔

انہیں دیکھ کر بسمہ نے ذومعنی انداز میں شوہر کو دیکھا۔ لیکن اُس نے چپ رہنے کا اشارہ کیا تو اُس نے بھی کوئی استفسار نہیں کیا۔

''ماں کو اُن کے کمرے میں لے جاؤ' انہیں ریسٹ کی ضرورت ہے۔'' بیوی کو ہدایات دیتے ہوئے وہ وہیں سے پلٹ گیا۔

لیاقت صاحب کئی گھنٹوں بعد ہوش میں آئے تھے پورا ہفتہ وہ انڈر آبزرویشن رہنے کے بعد گھر آئے تو زرینہ بیگم کو دیکھ کر اُن کے چہرے پر اتنی نفرت اور آنکھوں میں اتنی سرد مہری تھی کہ وہ زندہ زمین میں گڑ گئیں' احتشام کی الجھن جوں کی توں تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد لیاقت صاحب نے اس بارے میں بات کرنے سے سختی سے انکار کردیا تھا تو وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ اُن کی حالت کے پیشِ نظر خاموشی میں ہی عافیت تھی۔

''اپنا سامان اٹھاؤ اور میرے کمرے سے دفع ہوجاؤ دوبارہ کبھی مجھے اپنی منحوس شکل مت دکھانا۔'' جونہی زرینہ بیگم نے کمرے میں قدم رکھا دوٹوک پتھریلا لہجہ انہیں ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں گرا گیا۔

وہ اُن سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں کرسکیں' اُن کے دل میں شدت سے خواہش ابھری' کاش انہیں موت آجائے اور پھر کبھی انہیں لیاقت صاحب کا سامنا نہ کرنا پڑے' لیکن ابھی قدرت کو مزید آزمائشیں مقصود تھیں۔

اب اُن کا ٹھکانہ اوپری منزل پر چھوٹا کمرہ تھا' وہ جس جرم کی مرتکب ہوئی تھیں وہ اِس سے بھی زیادہ سزا کی مستحق تھیں۔ بہو بیٹے سے اُن کے حالات مخفی نہیں تھے بہو کے سامنے ایک ٹکے کی عزت نہیں رہی تھی وہ جان گئی تھی کہ وہ شوہر کی طرف سے دھتکاری گئی ہیں۔ احتشام اِس معاملے میں خود کو بہت بے بس محسوس کررہا تھا۔

اب زرینہ بیگم کی حیثیت گھر میں کسی بے کار سامان سے زیادہ نہ تھی۔ بسمہ سیاہ وسفید کی مالک تھی لیکن اب زرینہ بیگم ہر بات سے بے نیاز ہوگئی تھیں۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتیں۔

☆......☆......☆

تین ماہ ہوگئے تھے۔ وہ کسی بیوہ کی سی زندگی گزار رہی تھیں۔ لیاقت صاحب سے سامنا نہ ہونے کے برابر تھا۔ لیاقت صاحب کا زیادہ وقت مسجد میں گزرتا۔ یوں لگتا جیسے اُن میں بے جی کی روح حلول کرگئی ہے۔ اُن کے چہرے پر ایک خاموش سا سکون رہتا۔ جبکہ زرینہ بیگم دن بہ دن ڈپریشن اور فرسٹریشن کا شکار ہورہی تھیں۔ اُن پر کبھی کبھی دورے کی سی کیفیت ہوجاتی' تو زور زور سے رونے لگتیں۔ اُن کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ بہو کی ڈلیوری کے دن قریب تھے وہ احتشام کو خود میں اُلجھائے رکھتی' اور کبھی جو دو گھڑی ماں

کے پاس آتا بھی تو اُن کی خاموشی سے تنگ آ کر واپس چلا جاتا۔

ایک دن زرینہ بیگم کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو وہ لیاقت صاحب کے مدمقابل ہوگئیں۔

''مجھے طلاق کیوں نہیں دے دیتے آپ...... مجرم ہوں آپ کی تو ساری دنیا کو میری سچائی بتا کیوں نہیں دیتے...... قاتل ہوں آپ کی بے جی کی' کیوں پھانسی نہیں چڑھا دیا مجھے...... پل پل مرنے کے لیے کیوں چھوڑ دیا مجھے؟ اپنے ہاتھوں سے میرا گلا دبا دیں...... مجھے موت چاہیے۔'' وہ تڑپ تڑپ کے رو دیں لیکن لیاقت صاحب پر مطلق اثر نہ تھا۔

''خدا کرے تمہیں کبھی موت نہ آئے تم یونہی تڑپتی رہو۔'' اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہوں نے سرد بے لچک لہجہ میں کہا اور تیز قدموں سے چلتے کمرے سے نکل گئے۔

''نہیں...... نہیں...... مجھے موت چاہیے...... صرف موت۔'' اُن پر شدید دورے کی کیفیت ہوگئی تو وہ ہذیان بکنے لگیں اور کمرے کی ہر شے کو تہس نہس کر دیا۔

اُن پر اِس وقت عجیب جنون اور پاگل پن کی کیفیت ہو رہی تھی۔ وہ غائب دماغی سے چلتی اوپری منزل کی طرف جانے لگیں جب لاؤنج میں کسی سے فون پر باتیں کرتی بسمہ کی آواز اُن کی سماعتوں میں زہر گھول گئی۔

''لگتا ہے ساسو اماں کا کوئی معاشقہ پکڑا گیا ہے تبھی پاپا جی نے جوتے مار کر اپنے کمرے اور زندگی سے دھتکار دیا ہے۔'' وہ قہقہہ لگا کر ہنسی اس بات سے بے خبر کہ زرینہ بیگم سب سن چکی ہیں۔

اشتعال کی ایک شدید لہر زرینہ بیگم کے تن بدن کو جلا کر راکھ کر گئی۔ اِس عمر میں بدکرداری کا الزام...... کیا موت اِس سے بڑھ کر بھی ہوگی؟

''بے غیرت......'' وہ وحشیانہ انداز میں بسمہ کی طرف بڑھیں اور اُسے زور کا دھکا دیا' بسمہ اِس افتاد ناگہانی کے لیے تیار نہ تھی' اُس کا توازن بگڑا' تو وہ سینٹرل ٹیبل پر اوندھے منہ جا گری' کانسی کے ڈیکوریشن پیسز اُس کے پیٹ میں اِس زور سے لگے کہ اُس کی دلدوز چیخیں گھر کے در و دیوار ہلا گئیں۔

وہ پورے دنوں سے تھی۔ اُس کی چیخیں سن کر احتشام بھاگم بھاگ آیا تو لاؤنج کا منظر دیکھ کر وہ اپنے حواس کھو بیٹھا' بسمہ درد سے لوٹ پوٹ منہ کے بل گری ہوئی تھی۔

''پاپا...... پاپا...... میرا بچہ......'' وہ چلایا۔

ایک اور انہونی ہوگئی تھی۔ ایک اور قیامت اُن کی منتظر تھی۔ زرینہ بیگم حواس باختہ سراسیمگی سے کھڑی کانپ رہی تھیں۔ تقدیر نے ایک وار اور کیا تھا۔ وقت نے ایک بار پھر اُن کے منہ پر کالک مل دی تھی۔

ایک اور جرم اُن کے کھاتے میں لکھا گیا تھا۔

''اِسے اٹھاؤ...... جلدی...... گاڑی میں ڈالو۔'' لیاقت صاحب نے احتشام کو جھنجھوڑ دیا تو وہ انتہائی سرعت سے بجلی کی تیزی سے اٹھا اور بسمہ کو گود میں اٹھائے گاڑی کی طرف بھاگا۔

ہسپتال زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ انتہائی ریش ڈرائیو کر رہا تھا کہ پیچھے سے ایک ٹرالر موڑ کاٹتے ہوئے تیزی سے اُس کی گاڑی میں لگا اور ایک زوردار دھماکہ ہوا۔

اِس خطرناک ایکسیڈنٹ میں لیاقت صاحب کو کافی چوٹیں آئیں اور احتشام نے اپنی ٹانگیں ہمیشہ کے لیے کھو دیں۔ بسمہ ایک مہینے سے اسپتال میں تھی۔ اس حادثے میں اُس کے بچے

کی جان نہیں بچ سکی۔

پے در پے حادثات نے لیاقت صاحب کو توڑ کر رکھ دیا۔ جوان بیٹا معذور ہوگیا تھا۔ اپنے بچے کو کھونے کے غم نے بسمہ کو اَدھ موا کر دیا' وہ ہسٹریائی انداز میں روتے ہوئے چلا رہی تھی۔

''تمہاری پاگل ماں نے میرے بچے کو مار دیا احتشام......'' اور احتشام اپنے ہونٹ سختی سے بھینچے ضبط کے آخری مراحل سے گزرتا رہا۔ اُس نے صرف اپنا بچہ ہی نہیں کھویا تھا عمر بھر کی معذوری بھی اُس کے حصے میں آئی تھی۔

''میں اُن سے شدید نفرت کرتا ہوں پاپا...... وہ ماں نہیں ہیں ڈائن ہیں۔ میرے بچے کو کھا گئیں۔ اور مجھے عمر بھر کا روگ لگا کر خود ہر غم سے آزاد ہوگئیں۔'' وہ باپ کے گلے لگا پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔

لیاقت صاحب کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا اٹک گیا۔ اب کسی سے کیا شکوہ تھا۔

وہ جو سب کی مجرم تھی ہوش و خرد سے بیگانی ہوگئی تھی۔

بسمہ کے اسپتال جانے کے بعد بھی گھنٹوں وہ لاؤنج میں اُسی جگہ بیٹھی رہیں' اُن کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مکمل طور پر سلب ہو چکی تھی۔

''چندا ماما دور کے......'' وہ ہولے ہولے کوئی لوری گنگنانے لگیں۔ پوتے کو گودوں کھلانے کی خواہش تو عرصہ سے دل میں مچل رہی تھی۔

''پوتا......؟'' انہوں نے جیسے خود سے سوال کیا۔

''ہاں...... میرا پوتا......'' تنہائیاں گھر کے در و دیوار سے لپٹ کر رونے لگیں۔ درد کے آسیب گھر میں سرِ شام پھیل گئے۔

''اللہ...... منے سوجا...... بیٹے پیارے سوجا......'' پھر سے لوری گنگنانے لگیں۔ درد بھی اس حرماں نصیب کے سیاہ بختوں پر رو دیا۔ اور پھر جب ایکسیڈنٹ کی خبر اُن تک پہنچی تو اُن کے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے۔

''ارے میرا منا سچ مچ سو گیا...... میرے احتشام کا منا......؟'' وہ زور زور سے ہنسنے لگیں۔

''اور یہ احتشام کیوں نہیں آیا اب تک؟''

اُن کے چہرے پر اتنی ویرانیاں رقصاں تھی کہ چھوٹی بیٹی کے ساتھ ساتھ اُس کا شوہر بھی بری طرح سے رو دیا۔

''زرینہ بیگم کی حالت بہت خراب ہے۔ انہیں ہر صورت مینٹل ہاسپٹل بھیجنا ہوگا۔'' ڈاکٹر بتا رہا تھا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھیں۔

دو آنسو لیاقت صاحب کی آنکھوں سے نکلے اور جانے کہاں کھو گئے۔

جاتے سمے ایک لمحے کو انہوں نے جھکا سر اٹھایا لیاقت صاحب انہیں ہی دیکھ رہے تھے نگاہوں کا تصادم ہوا...... وہ ایک آخری نظر صدیوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھی۔ لیاقت صاحب کے اندر کچھ ٹوٹا تھا کبھی اِس بدقسمت کو انہوں نے بے حساب چاہا تھا۔

☆☆......☆

پاگل خانے میں کھچڑی بالوں والی جس کے چہرے پر وحشتوں نے خیمے گاڑ رکھے تھے اِس بات سے انجان تھی کہ چاند کی چودھویں تاریخ کو کوئی چپکے چپکے اُس سے ملنے آتا ہے جو بات کیے بنا ہی بس اُسے دیکھ کر واپس لوٹ جاتا ہے۔

ہواؤں میں سوگواریت بڑھ گئی تھی موسمِ حزن ہی اب مقدر تھا۔

☆☆......☆☆

اُن جیتے جاگتے کرداروں کی کہانیاں جو ہمارے اردگرد آج بھی سانس لے رہے ہیں

محبت یا عزت

ڈاکٹر نزہت عباسی کا خیال

اک زمانے کی آزمائش ہے
ایک لمحے کے امتحان میں کیا

سنبل

میرا نام شنگرف علی خان ہے ہماری فیملی تین افراد پر مشتمل تھی میں میرے بابا اور میرا بھائی شمائل علی خان، بابا نے میری پرورش بڑے مختلف انداز میں کی تھی بابا چاہتے تھے کہ شمائل لالہ پڑھ



لکھ کر کسی اچھی پوسٹ پر لگ جائے۔ اس لیے میں نے لالہ کو ہمیشہ کتابوں میں غرق ہی دیکھا۔ بابا اور لالہ مجھ سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ مجھے بھی ان دونوں سے بے انتہا محبت تھی۔ میں نے ماں کے نہ ہونے کی وجہ سے بہت کم عمری سے ہی گھر کا تمام کام سنبھال لیا تھا میں ہر قسم کا کھانا پکانے میں ماہر تھی بابا اور لالہ کو میرے ہاتھ کا کھانا بہت پسند تھا۔ وہ دونوں کھلے دل سے میری سلیقہ مندی کی تعریف کرتے تھے۔

ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ بابا نے لالہ کو ہمیشہ پڑھنے کے لیے فورس کیا مگر مجھے قطعی مختلف انداز میں پالا۔ وہ ہر ہفتے مجھے پہاڑوں پر لے جاتے اور وہاں وہ مجھے اسلحہ چلانا سکھاتے تھے۔ پسٹل' ماؤزر' ٹی ٹی' کلاشنکوف' ریپٹر کر سب چلانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا مگر اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ بابا نے مجھے پڑھایا نہیں تھا میں بھی پڑھ رہی تھی۔ مگر میری پرورش قطعی مختلف انداز میں ہو رہی تھی۔ اس پر مجھے حیرت بھی ہوتی تھی کہ جو کام لوگ اپنے لڑکوں کو سکھاتے ہیں وہ کام بابا مجھے کیوں سکھا رہا تھا اور اکثر میں بابا سے پوچھ بھی لیتی تھی۔ تب بابا اکثر کہیں کھو سا جاتا تھا اور بے خوابناک لہجے میں کہتا تھا۔

''شنک! تجھے اپنی مورے کا بدلہ لینا ہے۔''

اور میں چپ ہو جاتی۔ سوال گو اب بھی وہی تھا مورے کا بدلہ لینے کے لیے میں کیوں لالہ کیوں نہیں' مگر بابا مورے کا ذکر کر کے اتنا دکھی ہو جاتا تھا کہ آگے کوئی سوال کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ ہماری مورے اور بابا کی گل خاناں مورے کی ایک بڑی سی تصویر بابا کے کمرے میں لگی ہوئی تھی۔ بابا کو اپنی گل خاناں سے محبت نہیں تھی عشق تھا۔ دن میں کوئی ایک وقت ضرور ایسا ہوتا تھا جب بابا مورے کی تصویر کے آگے خاموش ہو کر کھڑا ہو جاتا تھا اور جب واپس پلٹتا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے تھے۔

مورے کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ لالہ اور مجھے ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا بابا سے میں نے لاکھ پوچھا مگر بابا نے کبھی بتایا ہی نہیں' ہمیشہ یہی کہا کہ 'وقت آنے پر بتاؤں گا' اور وقت کب آنا تھا کچھ پتہ نہیں تھا۔

وقت کا کام گزرنا ہے وہ گزر رہا تھا میں میٹرک کر کے کالج میں آ گئی اور لالہ یونیورسٹی میں' میری ٹریننگ اب بھی ہوتی تھی۔ بابا نے مجھے جوڈو کراٹے بھی سکھائے تھے۔ کالج میں تعلیم مخلوط تھی۔ وہاں مجھے کسی کی نظریں خود پر محسوس ہونے لگیں' میری تربیت کوئی عام لڑکیوں کے سے انداز میں تو ہوئی نہیں تھی کہ میں شرما لجا جاتی۔ ایک دن میں کسی کی نظروں کے حصار میں تھی کہ میں نے اچانک اپنی نظروں کا رخ اسی طرف موڑ لیا جس طرف سے مجھے نظروں کا احساس ہو رہا تھا۔ اور تب ہی میں نے گھبرا کر ایک لڑکے کو نظریں چراتے ہوئے دیکھا وہ گلریز خان تھا اور میں اس کے سر پر پہنچ گئی۔

''مسئلہ کیا ہے تمہارا...... آئندہ اگر مجھے دیکھا تو......'' میری بات اُس نے درمیان میں ہی اُچک لی۔

''تو...... تو کیا کر لوگی؟'' وہ چیلنج کرنے والے انداز میں بولا۔

''تمہاری آنکھیں نکال کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں گی۔'' میں کہتے ہوئے مڑی تھی کہ پیچھے سے اس کی آواز آئی۔

''عورت......عورت کے ہی انداز میں اچھی لگتی ہے یہ دوسروں کی آنکھیں نکال کر ہاتھ پر

رکھتی یا گوٹیاں کھیلتی' یا ان کی ماں بہن ایک کرتی ہوئی اچھی نہیں لگتیں۔'' اور میں نے مڑ کر اسے دیکھا اور خاموشی سے وہاں سے چلی آئی۔

واقعی پتا نہیں کب اسلحہ چلاتے اور جوڈو کے داؤ سیکھتے میرے اندر کی نرم و نازک خیالات و احساسات رکھنے والی لڑکی سو چکی تھی ہاں صرف سوئی تھی مری نہیں تھی' ورنہ گلریز کے الفاظ اسے جگا نہیں پاتے' مگر گلریز نے اسے میٹھی نیند سے بیدار کر دیا تھا' میں کالج میں ڈان کے نام سے مشہور تھی اور یقیناً وہ میری اس شہرت سے واقف تھا۔ اور پھر میں نے شعوری طور پر خود میں بدلاؤ لانا شروع کیا تب ہی ایک دن وہ پھر میرے سر پر موجود تھا۔

''ہوں! اب لگتی ہو ناں' لڑکی لڑکی سی اپنی اپنی سی۔'' اُس نے شوخی سے کہا۔

''شٹ اپ۔'' میں پھنکاری۔

''ٹون بدلو ابھی بھی بہتری کی گنجائش ہے۔'' وہ میری کیفیت کا مزہ لیتے ہوئے بولا۔

''میں تمہارے باپ کی نوکر نہیں ہوں کہ جو تم کہتے چلے جاؤ میں کرتی چلی جاؤں۔'' میں نے کتابیں پٹخیں۔

'' الفاظ بھی بہتر کرو شریف گھرانوں کی لڑکیاں اس طرح بات نہیں کرتی ہیں۔'' میرے مقابلے میں اس کے الفاظ اور لہجہ دونوں نرم تھے۔

''تم سے کس نے کہا کہ میں شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔'' میں چڑی۔

''شرافت ٹیگ کی طرح ماتھے پر سجی ہوتی ہے اور جو ہمارے دل میں بسے وہ عام ہو قطعی نہیں۔''

اور میں لاجواب ہو گئی اور بیگ اور کتابیں اُٹھا کر پیر پٹختی وہاں سے چلی آئی۔

☆......☆......☆

قطرہ قطرہ کسی پتھر پر بھی پڑے تو اس میں سوراخ کر دیتا ہے میں تو ایک نرم و نازک جذبوں میں گندھی لڑکی تھی کیا ہوا جو میری پرورش لڑکوں کے سے انداز میں ہوئی تھی۔ تھی تو میں لڑکی ہی نہ......گلریز کے جذبوں کی شدتوں کے آگے پگھل گئی۔ اب میں کبھی کبھی اس سے بات کرنے لگی اب میرے انداز خاصے بدل گئے تھے۔ میرا لیڈی ڈان والا تصور بھی کسی حد تک ختم ہو چکا تھا اور میرے بدلے ہوئے انداز کو بابا محسوس نہ کرتے یہ ممکن تھا بھلا...... وہ تو میرے ہر ہر انداز ہر ہر حرکت کو نظر میں رکھے ہوئے تھے۔ بالآخر ایک دن انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور کہا۔

''شنک! میں نے تمہاری پرورش اس لیے الگ انداز میں کی تھی کہ تم بھی عام لڑکیوں والی ڈگر پر چل نکلو۔'' انہوں نے دو ٹوک کہا۔

''مگر بابا ہوا کیا ہے؟'' میں قطعی نہیں سمجھی تھی کیونکہ جس بات کو بابا سمجھ چکے تھے اسے ابھی میں نہیں سمجھی تھی میرے لیے گلریز صرف دوست تھا جبکہ بابا میری نظروں اور انداز میں کھلے محبتوں کے رنگ پہچان چکا تھا۔

''میں نے تمہاری الگ انداز میں پرورش کی ایک خاص وجہ سے...... وجہ بھی تم سے نہیں چھپائی' مگر تم اپنا مقصد بھول کر محبت کی ڈگر پر چل نکلیں عام لڑکیوں کی طرح۔'' بابا غصے سے بولا۔

''نہیں بابا' یہ غلط ہے سراسر الزام ہے مجھ پر۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔

''اچھا تو پھر یہ گلریز کون ہے؟'' بابا نے مجھے سرد نظروں سے دیکھا۔

''دوست ہے۔'' میرے انداز میں لاپروائی تھی بابا نے میرا چہرہ بغور دیکھا۔

''صرف دوست۔'' بابا کا انداز تیکھا اور

سوالیہ تھا۔
''ہاں بابا' صرف دوست۔'' میں نے دو ٹوک کہا۔
''نہیں وہ تمہارا صرف دوست نہیں ہے شنگ! تم اپنے آپ سے جھوٹ بول سکتی ہو مگر مجھ سے نہیں' آج اپنا چہرہ آئینے میں دیکھ کر سوال کرنا کہ گلریز کیا صرف تمہارا دوست ہے اور پھر مجھے بتانا۔'' اور میں بابا کی بات سن کر خاموش ہو گئی تھی۔

اُس دن میں نے واقعی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو دیکھا تو اپنا وجود کسی آفاقی نور سے دمکتا نظر آیا اور گلریز کے متعلق سوال نے مجھے باور کرا دیا کہ گلریز صرف دوست والے مقام سے کافی آگے جا چکا ہے' اور جب میں نے خود سے سچ بولا تو بابا سے بھی سچ ہی بولا' مگر میں نے ساتھ ہی بابا سے یہ بھی کہا۔
''بابا! میں گلریز سے ملنا قطعی چھوڑ دوں گی مگر اس کے لیے آپ کو بتانا ہوگا کہ مورے کے ساتھ کیا ہوا تھا۔''
''گلریز کو چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے تجھے وہ اچھا لگتا ہے میں اس سے تیری شادی کرواؤں گا۔'' اُس بات پر میں نے حیرت سے بابا کو دیکھا بابا بھی ایک غیور پٹھان تھا اور ہمارے نزدیک یہ مرنے اور مار دینے والا معاملہ تھا۔ پھر بابا کی غیرت کو کیا ہوا تھا۔ اور اس دن مجھے اپنے اور بابا کے تعلق پر شک ہوا بیٹا ہوتے ہوئے بھی مجھے بیٹوں کے انداز میں پالنا' اور اب اس غیرت والے مسئلے کو بھی ہلکا لینا میں بابا کو حیرت سے دیکھ رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔
''پہلے تیری مورے کا بدلہ پورا ہو جائے پھر میں کراؤں گا تیری گلریز سے شادی۔'' اور میں گنگ اسے دیکھ رہی تھی۔
''بابا! مورے کے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا جس کا بدلہ لینا ضروری ہے۔'' آخر کار میں نے خود کو بولتے ہوئے پایا۔
''آہ گل خاناں!'' بابا نے کہہ کر دل پر ہاتھ رکھا اور اب اٹھارہ سال بعد بھی اس کے چہرے پر وہی حزن و ملال اتر آیا کہ جیسے مورے ابھی گئی ہو' اور مجھے دکھ ہوا۔
''تمہارا مورے ہمارا اٹھیکرے کی مانگ تھا۔ ہم دونوں کو بچپن سے ہی پتا تھا کہ ہماری شادی ہونی ہے ہم میں شروع سے ہی بہت محبت تھی۔ تیری مورے بڑی خوبصورت تھی چاند کی کرنوں میں نہائی ہوئی گلاب کی پتیوں سے وضو کی ہوئی۔ اس کا ہر نقش آفریں اور ہر انگ صندلیں تھا۔ وہ سراپا چاندنی تھی اسے دیکھ کر ٹھنڈک کا الوہی احساس ہوتا تھا۔ نازک نرم و دھیمے مزاج کی' شرم وحیا والی اتنی کہ اک نگاہ سے اتنی سرخ ہو جاتی لگتا ابھی لہو ٹپکنے لگے گا۔ وہ میری زندگی میں کیا آئی گویا بہار آئی اُس نے میری زندگی کو باغ عدن بنا دیا شادی کے دو سال بعد شائل پیدا ہوا۔ اور شائل کے آنے سے وہ اور نکھر گئی۔ اِس پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ پھر شائل چار سال کا تھا جب تمہارے آنے کا سلسلہ بنا' مگر اس بار اسے Renal Colic کی تکلیف ہوگئی۔ ہر تھوڑے دن میں تکلیف ہونے لگتی ڈاکٹرز کہتے کہ ابھی پین کلر کے علاوہ کوئی دوا نہیں دی جا سکتی۔ وہ ویسے بھی صابر تھی۔ صبر سے برداشت کرنے لگی اور پھر تمہاری پیدائش کا دن آ گیا۔ میں گھر میں ہی تھا اسے صبح Renal Colic (گردے کا درد) ہو رہا تھا اور شام تک ساتھ میں اسے لیبر پین بھی ہونے لگے میں کسی سواری کے لیے باہر نکلا وہاں پولیس کچھ مجرموں کی تلاش میں تھی۔ جو کہ بدقسمتی سے میرے پاس سے بھاگتے ہوئے پکڑے گئے اور ساتھ ہی میں بھی دھر لیا گیا۔ میں نے لاکھ اپنی صفائی دی مگر کسی نے نہ سنا اور معاملہ ایس ایچ او کے آنے تک ٹال دیا گیا۔ اس دن ایس ایچ او کے گھر بیٹی کی ولادت ہوئی تھی اور وہ اپنے ڈیوٹی آورز سے چار گھنٹے لیٹ آیا تمام بات سننے اور ملزمان سے تصدیق میں مزید دو گھنٹے لگے اور بالآخر مجھے چھوڑ دیا گیا۔ میں گھر پہنچا تو گل خاناں تمہیں جنم دے کر اس دنیا سے بہت دور جا چکی تھی۔'' بابا کہہ کر خاموش ہو گیا کہانی میں خاصے جھول تھے۔ مورے Renal Colic کا اور لیبر پین سے ایک ساتھ Suffer کر رہی تھی تو اس نے مجھے ٹھیک ٹھاک زندہ حالت میں بغیر کسی مدد کے جنم دے دیا تھا۔ دوسرا یہ کہ یہاں تو کوئی قصوروار ہی نہیں تھا پھر بدلہ کس سے لینا تھا اور دوسری بات میں نے بابا سے پوچھ بھی لی۔
''کیوں نہیں ہے کوئی قصوروار' قصوروار وہ ایس ایچ او ہے جس کے گھر بیٹی کی ولادت ہوئی تھی اور وہ لیٹ آیا جس کی بنا پر ہماری گل خاناں ہم سے بچھڑ گئی۔'' بابا نے کہا اور میرا دل چاہا اپنا سر زور سے دیوار میں ماروں کیا قصوروار ڈھونڈا تھا بابا نے' خالصتاً پٹھان تھا بابا تعلیم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی پکا اخروٹ تھا۔
''مگر بابا' اسی نے تو آ کر آپ کو چھڑوایا تھا۔'' میں نے دلیل دی۔
''مگر دیر سے آ کر ناں...... اگر وقت سے آ جاتا تو گل خاناں بچ جاتی۔'' بابا نے غصے سے کہا۔
''بابا! مورے کا ایسے ہی جانا طے تھا۔'' میں نے پھر سمجھایا۔
''تمہیں ہماری مدد کرنی ہے تو کرو نہیں تو ہم خود کافی ہے اپنی گل خاناں کا بدلہ لینے کے لیے۔'' بابا غصے سے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔
''نہیں بابا' یہ بات نہیں ہے اپنی مورے کا بدلہ لینے کا میرا عہد ہے آپ کے ساتھ مگر پتہ نہیں کیوں ایس ایچ او مجھے بے قصور لگا ہے۔'' میں نے پھر کہا۔
''آئندہ اس شخص کی طرف داری کبھی مت کرنا' ورنہ ہم سے برا نہ ہوگا۔'' بابا غصے سے کہہ کر واک آؤٹ کر گیا تھا۔

☆......☆......☆

اُس سے اگلے دن میری گلریز سے ملاقات ہوئی تو اُس نے مجھ سے پوچھا۔
''کیا بات ہے اتنی خاموش کیوں ہو؟'' اب میں اسے کیا بتاتی کہ کیوں خاموش ہوں میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ ٹلنے والا کب تھا۔ اس کی ایک نگاہ ایکسرے تھی جو مجھے اندر تک پڑھ ڈالتی تھی۔
''نہیں کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے لاپرواہی دکھائی۔
''نہیں بتانا چاہو تو الگ بات ہے مگر کوئی نہ کوئی بات ہے تو ضرور۔'' اس میں ایک اچھی بات تھی اسے کسی چیز کا اندازہ اگر ہو بھی جاتا تھا تو بھی وہ اس بات کے پیچھے نہیں پڑتا تھا۔
''نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' میں نے پھر کہا۔
''تمہیں کوئی عام بات پریشان نہیں کر سکتی لیڈی ڈان' اتنا تو مجھے اندازہ ہے کچھ نہ کچھ تو چل رہا ہے تمہارے دماغ میں۔'' وہ یقین سے بولا۔
''اپنی اسٹڈی کی وجہ سے پریشان ہوں۔ Maths لے تو لیا ہے مگر مجھ سے کور ہو نہیں پا رہا

ہے۔'' میں بات کو دوسرے سرخ پر لے گئی اور وہ انکار یہ انداز میں سرہلا کر ہنسا۔

''یہ بات نہیں ہے پھر بھی Math میں جو سمجھ نہ آئے مجھ سے پوچھ لیا کرو۔'' اُس نے کہہ کر بات ختم کر دی۔

☆......☆......☆

مگر بات ختم نہیں ہوئی۔ اگلے ہی ہفتے بابا نے مجھے ایک شاندار سا گھر دکھایا اور کہا۔

''یہ ہے اُس شیطان کا گھر۔ اب میں اُس کی نقل و حرکت پر نظر رکھ کر تمہیں بتاؤں گا پھر تمہیں اسے مارنا ہے۔'' اور میں لرز گئی جس شخص کو میں مجرم سمجھتی ہی نہیں تھی۔ اسے مارنا' مورے کا مرنا ایسے ہی طے تھا اور یہ سب تو آسمانوں پر کہیں طے ہوتا ہے اور پھر کوئی اور چھوٹی موٹی سزا دی جاسکتی تھی مگر یہاں تو بابا کا ارادہ ہی اسے مارنا کا تھا۔ بابا بغور میرے تاثرات نوٹ کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے یا ہم خود کرے۔'' بابا نے کھردرے لہجے میں کہا۔

''نہیں بابا میں کرلوں گی۔'' میں نے جلدی سے جواب دیا۔ میں بچپن میں کبھی کیے گئے عہد کی پاسداری میں پھنس گئی تھی۔ سب جانتے ہیں ہم پٹھان قوم اپنے وعدے اپنے عہد اپنی جان دے کر بھی نبھاتے ہیں اور اب تو چاہے جان جاتی بات نہیں جانی تھی۔

اِس بات کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد کی بات ہے ایک دن بابا میرے پاس آیا وہ اس دن بہت خوش تھا اس نے بتایا۔

''آج رات تیار رہنا آج ہمیں چلنا ہے۔''

اُس دن میں پورا دن بے کل رہی اسلحہ چلانا اور بات ہے اور کسی جیتے جاگتے بندے کو موت کے گھاٹ اتار دینا اور بات ہے۔

بہرحال بابا نے مجھے بتایا کہ اس دن اس ایس ایچ او رحیم داد خان کے گھر والے کہیں باہر جا رہے تھے اور وہ گھر میں اکیلا ملے گا۔ رات میں ہم نکلے ایک ٹی ٹی میرے پاس تھی اور ایک بابا کے پاس تھی۔ ہم اس گھر کے سامنے پہنچے تو گھر کی بیشتر لائٹس آف تھیں۔ ہمیں گھر میں داخل ہونے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کوئی مزاحمت نہیں تھی۔ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا صرف دو کمروں کی لائٹس آن تھیں اور لاؤنج کی لائٹ آن تھی۔ ہم نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا تو وہاں کوئی نہیں تھا دوسرے کمرے میں ہمیں رحیم داد خان نظر آ گیا یہ کمرہ غالباً لائبریری تھا۔ دیواروں کے ساتھ ریکس میں کتابیں لگی ہوئی تھیں اور رحیم داد خود بھی میز پر جھکا ہوا کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھا۔ دروازے کی آواز پر وہ چونک کر مڑا تھا۔ میں نے خود کو فل کور کیا ہوا تھا میری صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں ہاتھوں میں بھی دستانے تھے۔ جبکہ بابا کا چہرہ تک کھلا ہوا تھا۔ رحیم داد کے مڑتے ہی بابا نے کہا۔

''پہچانا۔'' اور اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''تجھ جیسے شیطان یاد بھی کہاں رکھتے ہیں اپنے گناہ۔'' بابا پھنکارا۔

''نہیں یہ الزام غلط ہے مجھ پر میرے ہاتھ ہمیشہ صاف رہے ہیں۔'' وہ سکون سے بولا اور مجھے تاسف نے آ گھیرا کہ یہ جرم میرے ہی نصیب میں لکھا تھا۔

''مجھے تیرے ساتھ کوئی بحث نہیں کرنی آج تیرا یوم حساب ہے۔'' بابا نے اسے غصے سے گھورا۔ اور اس کے ساتھ ہی بابا نے مجھے اشارہ کیا۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا اس شخص کو مارنے کا' پتا نہیں کیوں دل کھینچ رہا تھا اس کی طرف' مگر میرا

عہد میرا وعدہ آڑے آ گیا اور میں نے دو فائر کیے۔ ایک اس کے کاندھے پر اور دوسرا ران پر میں نے شعوری کوشش کی کہ وہ شخص مرے نہیں اور پہلے فائر سے وہ لڑکھڑایا تھا اور دوسرے سے گر پڑا۔ تب بابا کے چہرے پر بڑی زہریلی مسکراہٹ آئی تھی۔ اور پھر اس نے بلند آواز میں قہقہہ لگایا۔

''رحیم داد خان' پتہ ہے یہ لڑکی کون ہے؟'' بابا نے آگے بڑھ کر میرے چہرے سے نقاب ہٹاتے ہوئے پوچھا اور رحیم داد خان نے نفی میں سر ہلایا۔

''تمہیں یاد ہے آج سے 18' 19 سال قبل تمہاری ایک شیر خوار بیٹی اغواء ہو گئی تھی۔'' میں نے اور رحیم داد نے بیک وقت چونک کر بابا کو دیکھا۔

''یہ تمہاری وہی بیٹی ہے رحیم داد خان۔'' اس نے نفرت سے زمین پر تھوکا اور میں نے ٹی ٹی ایسے اپنے ہاتھ سے دور پھینکی جیسے کہ کوئی بچھو ہو اور بابا نے ایک اور زوردار قہقہہ لگایا۔

''یہ ہے ہمارا انتقام' اسی بچی کی پیدائش کی وجہ سے تم دیر سے آئے تھے ناں' رحیم داد خان اسی وجہ سے ہماری گل خاناں مر گئی۔ ہم نے اغواء کیا تھا تمہاری بیٹی کو' ہم نے پالا ہے اسے اپنی بیٹی کی طرح...... اور ہم نے اس کے دل میں اپنی بیوی جسے یہ اپنی ماں سمجھتی ہے کا انتقام ڈالا اور اب تمہیں تمہاری ہی بیٹی کے ہاتھوں زخمی کروا دیا۔ اب تم مرو گے اور تمہاری بیٹی جائے گی جیل۔'' بابا نے ایک اور اونچا قہقہہ لگایا اور میں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے بابا کو دیکھا۔ اور تب ہی رحیم داد خان نے اپنا سینہ پکڑ لیا۔

میں اُن کی طرف بھاگی اور انہوں نے اپنا خون میں ڈوبا ہوا ہاتھ میری طرف بڑھایا میں نے زمین پر بیٹھ کر ان کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا' انہوں نے ایک ہاتھ سینے پر رکھا ہوا تھا۔ دوسرا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور ان کا دم نکل گیا' رحیم داد خان میرے حقیقی بابا کی موت گولیاں لگنے کی وجہ سے نہیں دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی تھی۔ تبھی بابا کو احساس ہوا کہ غالباً گھر والے آ گئے ہیں' اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھایا۔ میں مکمل طور پر شاک میں تھی وہ پچھلے دروازے سے لے کر مجھے باہر نکلا اور پچھلا دروازہ کھول کر مجھے لے کر گھر آ گیا گھر آ کر اُس نے مجھے نہانے اور کپڑے بدلنے کو کہا اور بابا جو کہتا گیا میں کرتی گئی کیونکہ میرا اپنا دماغ مکمل طور پر سن تھا۔ بابا نے میرے اور اپنے کپڑے دھو کر ڈال دیے۔ مگر پھر بھی پولیس ہمارے گھر اُس ٹی ٹی کے ذریعے پہنچ گئی۔ جو میں وہاں پھینک آئی تھی اور اس دن مجھے پتا چلا کہ بابا نے صرف مجھے پالا ہی نہیں تھا' وہ مجھ سے شدید محبت بھی کرتا تھا اس نے الزام اپنے سر لے لیا' میں نے بہت ہاتھ پیر مارے مگر بابا نے لالہ سے کہہ کر مجھے سامنے ہی نہیں آنے دیا۔ اور بابا کو عمر قید ہو گئی۔

میرے سامنے کہانی واضح ہو چکی تھی بابا نے اپنی بیوی کے مرنے کے انتقام کے طور پر اپنے دشمن کی بیٹی کو اغواء کر کے اسی کے ہاتھوں اس کے حقیقی باپ پر حملہ کروایا' میری سوچ بالکل درست تھی مورے اور بابا کی بیٹی دونوں مدد نہ ملنے پر جانبر نہ ہو سکے تھے۔ میں بالکل خاموش ہو گئی۔ اپنے حقیقی رشتوں سے ملتی بھی تو کس منہ سے' ویسے بھی میری حقیقی ماں تو میرے ہی غم کو سہہ سہہ کر مر چکی تھیں بابا کو میں نے مار دیا' اب رہ گئے تھے بھائی اور بھاوجیں' پتہ نہیں وہ مجھے قبول کرتے

یانہ کرتے۔ میں نے اس سلسلے میں کوشش بھی نہیں کی۔ ہاں بھائیوں کو دیکھ کر دور دور سے دل کی پیاس ضرور بجھاتی تھی۔

لالہ کو اصل کہانی کی خبر نہیں تھی انہیں یہی پتا تھا کہ رحیم داد خان سے بابا کی کوئی پرانی دشمنی تھی بابا نے مجھے اپنی قسم دے کر لالہ کو اور پولیس والوں کو کچھ بھی بتانے سے منع کیا تھا۔ کچھ بھی ہو مجھے بابا سے محبت تھی بابا نے کبھی مجھے کانٹا چبھنے کی بھی تکلیف نہیں دی تھی۔

لالہ نے بڑی مشکل سے مجھے کالج جانے پر راضی کیا' وہاں گلریز کے بہلانے سے بھی کافی فرق پڑا بہرحال غم کتنا ہی بڑا اور گہرا ہو۔ وقت کے ساتھ ہلکا ہوجاتا ہے' میں نے بامشکل BSC کیا۔ گلریز کا اس دوران ہی یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوگیا میں نے لالہ سے آگے پڑھنے سے انکار کردیا' لالہ کی تعلیم بھی مکمل ہوگئی تھی انہوں نے جاب بھی کرنا شروع کردی اور ساتھ ہی بابا کا کام بھی دیکھ رہے تھے۔ گھر کے حالات تو شروع سے ہی اچھے تھے اب مزید اچھے ہوگئے۔

میرے دل میں کبھی کبھی ہوک سی اٹھتی تھی کہ میرا ایک باپ میرے ہاتھوں مارا گیا اور دوسرا میری وجہ سے عمر قید کاٹ رہا ہے۔ اور پھر بابا نے صرف سوا دو سال قید کاٹی اور آخر کار مرگیا ہم دونوں بھائی بہن اکیلے رہ گئے۔

☆......☆......☆

کشمالہ ہماری کزن اور لالہ کی ٹھیکرے کی مانگ تھی۔ لالہ اس سے بہت شدید محبت کرتے تھے۔ وہ تھی بھی بہت خوبصورت' میں نے لالہ سے شادی کا کہا تو وہ تو دونوں ہاتھ پیروں سے راضی تھے یوں کشمالہ دلہن بن کر ہمارے گھر آگئی' وہ ہمارے گھر کیا آئی چاندنی اتر آئی زندگی اتر آئی۔ ہم دونوں بہن بھائی جو روبوٹس کی مانند زندگی گزار رہے تھے۔ زندگی کو زندگی کی مانند گزارنے لگے اس کے آنے سے گھر گھر لگنے لگا تھا' سرائے نہیں۔ وہ بہت زندہ دل اور ہنس مکھ تھی۔ وہ مسکراتی تو زندگی کھلکھلا کر ہنسنے لگتی تھی۔ بہرحال لالہ اور کشمالہ خوش تھے اور وہ خوش تھے تو میں خوش تھی۔

اسی دوران گلریز کی تعلیم بھی مکمل ہوگئی اور ایک دن وہ میرا ہاتھ مانگنے لالہ کے پاس آگیا۔ لالہ کو اس کے اکیلے آنے پر اعتراض تھا مگر اس نے بتایا کہ اس کے والدین تو ہیں ہی نہیں تایا نے اسے پالا ہے اور وہ پالنے کے تاوان کے طور پر اس کی شادی اپنی بیٹی سے کرنا چاہتے ہیں۔ سو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلا آیا ہے۔

لالہ نے غور کرنے کے لیے وقت مانگا مگر وہ گلریز کی شبیہ میری آنکھوں میں دیکھ چکے تھے۔ اور انہیں اس ایک اعتراض کے علاوہ کوئی اور اعتراض بھی نہیں تھا' وہ اچھا خوش شکل' پڑھا لکھا اور شریف نوجوان تھا کام بھی اپنا کرتا تھا۔ لالہ نے ہاں کردی اور یوں ہماری شادی ہوگئی لالہ نے گلریز کو ساتھ ہی رکھ لیا کیونکہ اس کا رہائش کا مسئلہ تھا۔ بہرحال ہم بہت خوش تھے زندگی گنگنانے' کھلکھلانے' مسکرانے لگی تھی۔ گلریز مجھ سے نا صرف بہت زیادہ محبت کرتا تھا بلکہ میری بڑی عزت بھی کرتا تھا۔ وقت اور گزرا اس دوران میں دو پیارے پیارے بچوں پلوشہ اور ایمل کی ماں بن گئی' ہماری فیملی مکمل ہوگئی مگر پتہ نہیں کیا وجہ تھی کہ کشمالہ کی گود ابھی بھی خالی تھی' وہ میرے بچوں کو دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی۔ میں تو زیادہ تر فارغ ہی رہتی تھی وہ میرے بچوں کو نہلاتی دھلاتی' ان کے کپڑے بدلتی' انہیں خوشبوؤں میں

بساتی۔ انہیں کھلاتی پلاتی غرض اسے اُن کا ہر کام از خود ہی اپنے ذمے لے لیا تھا۔ ہمیں کہیں بھی جانا ہوتا' ہم دونوں بچوں کو چھوڑ کر چلے جاتے اور کشمالہ انہیں لک آفٹر کرلیتی تھی ہمارے دن عید اور راتیں شب برأت تھیں۔ لیکن یہ دن اور راتیں زیادہ عرصے میری زندگی کا حصہ نہیں رہی تھیں۔

گلریز کے اپنے کام کے سلسلے میں کچھ نئے دوست بنے تھے' مجھے یہ لوگ پتہ نہیں کیوں اچھے نہیں لگے تھے۔ ان لوگوں سے دوستی کے بعد سے گلریز دیر سے گھر آنا شروع کردیا۔ اس کی توجہ آہستہ آہستہ مجھ سے' بچوں اور گھر سے کم ہونے لگی تھی میں پوچھتی تو کام کا بہانہ کردیتا۔ لیکن اس دن تو Mentally Shock میں آگئی جب وہ ام الخبائث سے رشتہ جوڑ کر فل نشے میں دُھت گھر آیا اور میں چیخ پڑی۔

''یہ سب کیا ہے گلریز......؟''

''یہ غم غلط کرنے کا بہانہ ہے۔'' وہ نشے سے بوجھل آواز میں بولا۔

''تمہیں ایسا کیا غم ہے گھر ہے' بیوی ہے' پیارے پیارے بچے ہیں' چلتا ہوا کاروبار ہے' نہ کسی کا لینا نہ کسی کو دینا پھر کیا غم ہے تمہیں۔'' میں نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

''میری بیوی مجھ سے جھوٹ بولتی ہے' وہ جھوٹ کی دکان ہے اس کی زندگی اک جھوٹ ہے' اس کا ہر رشتہ جھوٹ ہے' اس کا ہنسنا اس کا رونا سب جھوٹ ہے۔'' وہ بستر پر گرتے ہوئے بولا۔

''کیا جھوٹ بولا ہے میں نے تم سے بتاؤ کیا جھوٹ بولا ہے ہاں۔'' میں نے اسے جھنجھوڑا مگر تب تک وہ غافل ہوچکا تھا۔

دوسرے دن وہ دیر سے اٹھا بچے اسکول جاچکے تھے۔ کشمالہ اپنے پورشن میں تھی۔ میں نے اس دن اس سے بات نہیں کی صرف ناشتہ بنا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی تھی۔ میں ناشتہ رکھ کر پلٹنے لگی تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''گونی' میں بہت شرمندہ ہوں دوستوں نے پلادی تھی۔'' وہ شرمندگی سے بولا صرف وہی تھا جو مجھے گونی بلاتا تھا۔

''تم کیوں شرمندہ ہو' شرمندہ تو مجھے ہونا چاہیے' تم نے تو کل نشے کی حالت میں ہی سہی پہلی بار سچ بولا ہے' اپنے اندر کا غبار نکالا ہے۔'' میں نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ اور اس نے چونکنے کے سے انداز میں مجھے دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر سرد سی سنجیدگی چھاگئی۔

''تو کیا غلط ہے؟'' اس کا لہجہ استہزائیہ ہوگیا۔

''کیا جھوٹ بولا ہے میں نے تم سے اپنے بارے میں۔'' میں پھٹ پڑی۔

''تو کیا سچ بولا ہے تم نے اپنے بارے میں۔'' وہ عجیب سے انداز میں ہنسا۔

''کیا سننا چاہتے ہو تم۔'' میں بے خوف ہوکر اس کی آنکھوں میں جاکر دیکھا۔

''شمائل اور بابا سے تمہارا کیا تعلق ہے۔'' وہ طنزیہ بولا۔

''میں بابا کے دشمن کی بیٹی ہوں' جس کو انہوں نے قتل کردیا تھا مجھے انہوں نے جب میں شیرخوار تھی جب اغواء کرلیا تھا۔'' میں نے بغیر ڈرے کہا۔

''اور یہ بات تم مجھے اب بتا رہی ہو میرے پوچھنے پر۔'' اس کا لہجہ بڑا کٹیلا تھا۔

''ہاں کیونکہ میرے لیے اس بات کی کوئی

اہمیت نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو میں نے اپنے اصل کی طرف پلٹ جاتی۔ میرے لیے میرے لالہ اور میرے بابا میرے سگوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔'' میں نے بے لچک کہا۔

''بات صرف یہی ہے یا کوئی اور بھی ہے۔'' اس کا لہجہ بڑا کٹھور تھا۔

''اور کیا بات ہونی چاہیے۔'' میں نے تیکھے چتون سے اسے دیکھا۔

''کوئی اپنے بدترین دشمن کی بیٹی کو پالے اور......'' ابھی اس کی بات منہ میں ہی تھی کہ میں نے سامنے میز پر رکھی ہوئی تین کانچ کی پلیٹیں ہاتھ مار کر گرا دیں جو کہ زوردار آواز میں زمین پر گر کر چکنا چور ہوگئیں اور میں پوری قوت سے چلائی۔

''بس...... اگر ایک بھی گندی بات یا لفظ میرے بابا یا لالہ کے بارے میں نکالی تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گی میرے بابا اور میرے لالہ غیور پٹھان ہیں جو دشمنی میں بھی اپنا وقار نہیں کھوتے' انہوں نے اپنی بیٹی کے تاوان کے طور پر مجھے اٹھایا تھا تو بیٹی ہی مانا' مجھ پر کبھی آنچ بھی نہیں آنے دی۔ لیکن تمہیں کیا پتہ تم نے تو جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید کیا تھا' تمہیں کیا پتہ خاندانی ہونا کیا ہوتا ہے۔'' میں اتنی بری طرح سے دھاڑی کہ کشمالہ بھاگتی ہوئی آ گئی اور گلریز بھی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''کیا ہوا شنگ...... یہ تم گلریز بھائی سے کس انداز میں بات کر رہی ہو۔'' وہ تنبیہی انداز میں بولی۔

''کشمالہ...... یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے بہتر ہے کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔'' میں روڈلی کہا اور کشمالہ نے بڑی حیرت سے مجھے دیکھا۔ مگر بولی کچھ نہیں اور واپسی کے لیے مڑ گئی اور اس کے جاتے ہی میں گلریز کی طرف پلٹی۔

''مجھے طلاق دو ابھی کے ابھی اسی وقت!'' میں دوبارہ چیخی۔

''یہی تو ناممکن ہے۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا Every thing Is Possible In The World مجھے اب تمہارے ساتھ رہنا ہی نہیں ہے۔'' میں گلریز کے سامنے جتنی بھی مضبو بنی ہوئی تھی مگر یہ حقیقت ہے کہ میرا دل اندر سے رو رہا تھا۔ وہ ان دونوں شخصیات کے حوالے سے مجھ پر الزام لگا رہا تھا جنہوں نے مجھے اتنا مان محبت اور عزت و تکریم دی کہ مجھے زندگی میں کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ میرے کچھ لگتے ہی نہیں ہیں۔

''محبت کرتا ہوں تم سے' بے حد' بے پنا میری سانس رکتی ہے یہ سوچ کر کہ میں تم کو خو سے الگ کر دوں۔'' وہ بے خودی کے سے اندا میں بولا۔

''مت کرتے محبت' اعتبار کرتے عزت کرتے میری' زہر ہے زہریلی ہے وہ محبت جو بغی عزت' اعتبار کے ہو۔'' اور میں اب ا آنسوؤں پر قابو نہ پا سکی اور گلریز تڑپ کر میری جانب بڑھا اُس نے مجھے خود سے لگانا چاہا مگر میں تڑپ کر اس سے دور ہوئی تھی۔

''مجھے چھونے کی کوشش بھی مت کرنا ورنہ جان دے دوں گی میں' تم ہو یا نہیں مگر میں ایک غیور پٹھان خانزادی ہوں۔'' غصے کی شدت سے میری آواز پھٹنے لگی۔

''ہاں نہیں ہوں میں غیور' ورنہ اس وقت میں تم سے سوال و جواب نہ کر رہا ہوتا۔'' وہ بھی غصے میں آ گیا۔

''نہیں ہو تو بن جاؤ دبا دو گلا میرا بلکہ اس کی بھی کیا ضرورت ہے۔'' یہ کہہ کر میں مڑی اور میں نے کچن کاؤنٹر پر رکھے نائف سیٹ کا سب سے بڑا والا چھرا نکال کر ڈائننگ ٹیبل پر پھینکا۔

''یہ لو اور اتار دو میری شہہ رگ میں۔'' میں چیخی اور وہ چڑ گیا۔

''پاگل ہوگئی ہو کیا؟'' وہ چڑ کر بولا۔

''صرف پاگل نہیں ہوگئی گلریز آج میں مر گئی' کاش تم یہ سیسہ میرے کانوں میں نہ اتارتے یہ چھرا میری شہ رگ میں اتار دیتے' تو میں خوشی خوشی جان دیتی ایک لفظ منہ سے نہ نکالتی۔'' کوئی بے بسی سی بے بسی تھی۔

''مجھے معاف کر دو گوفی۔'' اچانک وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

''شاید میں لوگوں کے بھکاوے میں آ گیا تھا' مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے مجھے معاف کر دو۔'' وہ گڑگڑایا تھا۔

''کون ہیں وہ لوگ جنہوں نے تم سے یہ باتیں کی ہیں۔'' میں نے آنسو پونچھ کر مضبوط لہجے میں پوچھا۔

''میرے نئے دوست' انہیں کہیں سے پتہ لگا تھا تو......'' اُس نے بتایا۔

''اور یاد کرو میں نے تم سے شروع میں ہی کہا تھا کہ یہ لوگ اچھے نہیں ہیں مگر تم نے نہیں سنا اور اب بھی میرا انہیں پیغام دے دینا کہ دوسروں کی بیویوں کے بارے میں انکوائریز کرنے کے بجائے اپنی بیویوں کو وہ ان کے جائز حقوق دے دیں جو وہ دوسروں کی جھولیوں میں ڈال دیتے ہیں۔''

اس پر گلریز نے مجھے چونک کر دیکھا اسے سمجھ آ چکا تھا کہ میں اتنی بے خبر نہیں ہوں جتنا وہ مجھے سمجھتا ہے وہ اپنے ان دوستوں کے ساتھ کیا کیا چاند چڑھا چکا تھا میں واقف تھی' مگر بات اس وقت تو ختم ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

لیکن بات ختم نہ ہو سکی اب اکثر گلریز ڈرنک کر کے آنے لگا تھا۔ اور اس دوران اس سے کوئی نہ کوئی ایسا جملہ ضرور منہ سے نکل جاتا تھا جو کہ قابل اعتراض ہوتا تھا مگر میں نے جواب دینا چھوڑ دیا تھا لیکن ہمارے درمیان دوریاں بڑھنے لگی تھیں اور اب تو یہ دوریاں بڑھ کر خلیج بن گئی تھیں۔

جب گلریز ہوش میں ہوتا تھا تو وہ ان دوریوں کو پاٹنے کی کوشش کرتا تھا مگر بہت پرانی مثال ہے۔

''تلوار کا گھاؤ بھر جاتا ہے اور زبان کا تاعمر رہتا ہے۔'' اور ایک دن وہ انہی کوششوں میں مصروف تھا کہ میں نے بہت روڈلی کہا۔

''گلریز! میں اب تک تمہارے ساتھ ہوں میں نے تم سے رشتہ نہیں توڑا اسی کو بہت سمجھو' جو کچھ تم چاہتے ہو وہ اب ناممکن ہے' اور میرا تم سے رشتہ جوڑے رہنے کی وجہ صرف ہمارے بچے ہیں جو نصیب سے ہمارے درمیان موجود کچے دھاگے کی گرہیں مضبوط کرتے ہیں' ورنہ اس کچے دھاگے میں اب جان بچی نہیں ہے۔''

''میرے حقوق ہیں تم پر تم بیوی ہو میری۔'' اس نے استحقاق سے کہا۔

''گلریز حقوق و فرائض کی باتیں رہنے دو' اب تک میرے حقوق جن کی جھولی میں ڈالتے رہے ہو اب بھی ڈالتے رہو' مجھے نہ کوئی اعتراض ہے اور نہ کوئی تکلیف' ہاں تکلیف ہوتی ہے اس وقت جب تم حقوق کے حوالے سے میری بات کرتے ہو۔'' میں کہہ کر مڑ گئی مگر اپنی پشت پر گری

گلریز کی نظروں کو بہت دیر تک محسوس کرتی رہی۔

☆......☆......☆

وہ بھی ایک عام سا دن تھا صبح سے ہی بلکہ رات کے درمیان سے ہی ایمل کو موشن اور الٹیاں آ رہی تھیں۔ وہ پورا ہی دن بہت مصروف گزرا' ایمل کو ڈاکٹر کو دکھایا دوا دلوائی اسے ڈرپ بھی لگی کیونکہ مسلسل الٹیوں اور موشن سے وہ Dehydeatio کی طرف جا رہا تھا' ڈرپ ختم ہونے تک شام ہوگئی۔ اب اس کی حالت کافی بہتر تھی۔ میں اسے گھر لے کر آئی' کشمالہ فوراً آ گئی اور ایمل کو لے گئی۔ اس کے بعد دیر رات گئے تک وہ کشمالہ کے ہی پاس رہا۔ مجھے اس دن پتہ نہیں چل سکا کہ گلریز کب آیا میں پلوشہ کے کمرے میں اسے سلانے لیٹی تو میری آنکھ لگ گئی' میری آنکھ کشمالہ کے ہلانے پر کھلی وہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔

''شنک! ایمل کو لٹانا ہے جگہ چھوڑ دو۔''

''ایسا کرو کشمالہ! ایمل کو میرے کمرے میں لٹا دو کہیں رات میں طبیعت خراب ہوگئی تو میں دیکھ تو لوں گی۔'' میں نے کہا تو وہ سر ہلاتی ہوئی چلی گئی ابھی میں اٹھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ مجھے کسی چیز کے بہت زور سے گرنے کی آواز آئی آواز میرے کمرے سے آئی تھی میں دہل کر باہر کی جانب بھاگی اور جاتے ہی دروازے کو دھکا دیا تو وہ اندر سے بند تھا۔ مگر اندر غیر مانوس سا شور تھا۔ میں نے دروازہ بجایا تو بھی کسی نے نہیں کھولا مگر شور میں اضافہ ہی ہوا ایسا جیسے کسی کا منہ سختی سے بند کیا گیا ہو اور وہ چیخنے کی ناکام کوشش کر رہا ہو' اچانک مجھے کچھ بہت برا ہونے کا احساس ہوا۔ اور میں تیزی سے کھڑکی کی طرف بھاگی' کھڑکی کھلی ہوئی تھی مگر اس میں گرل لگی ہوئی تھی۔ میں نے

غزل

میری روداد ہے کہ آئینہ
یہ کوئی یاد ہے کہ آئینہ
ایک مدت سے کچھ نہیں دیکھا
دل کی فریاد ہے کہ آئینہ
جسم و جاں دیکھ کر لرزتے ہیں
کوئی اُفتاد ہے کہ آئینہ
دلِ درویش کچھ بتا تُو ہی
عشق آباد ہے کہ آئینہ
کوئی بتلاؤ سامنے میرے
میرا ہمزاد ہے کہ آئینہ

شبیر نازش

اندر جھانک کر دیکھا تو اندر کا منظر میرے ہوش اڑانے کو کافی تھا۔

اندر بیڈ پر ایمل ایک کونے پر بیٹھا تھا وہ سہما ہوا تھا۔ اور گلریز کشمالہ کو پیچھے کی طرف سے جکڑے ہوئے تھا اور اس کا ایک ہاتھ سختی سے کشمالہ کے منہ پر جما ہوا تھا' وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے زور لگا رہی تھی ساتھ ہی اس کے منہ سے بھنچی بھنچی آوازیں بلند ہو رہی تھیں میں تو دیکھ کر اپنا آپا ہی کھو بیٹھی اور زور سے چیخی۔

''گلریز...... ہوش میں آؤ چھوڑ دو کشمالہ کو۔'' مگر وہ مکمل نشے میں تھا۔

''نہیں' نہیں چھوڑوں گا' تمہارے سو کالڈ بھائی کو بھی اس درد کا اندازہ ہونا چاہیے جس سے میں گزرتا ہوں۔'' وہ نشے سے بوجھل آواز میں بولا اور مجھے سمجھ آ گیا میں باہر سے کچھ نہیں کر سکوں گی' اور مجھے صرف ایک منٹ لگا تھا۔

صرف ایک منٹ ایک طرف میرا شوہر' میرے بچوں کا باپ اور میری محبت تھی...... اور دوسری جانب میرا ماں جایا نہیں تھا مگر وہ تھا جس نے مجھے ماں جائے سے زیادہ عزت' مان' اعتبار اور محبت دی تھی' اور اس وقت میری محبت کے ہاتھوں اس کی عزت رُلنے جا رہی تھی۔ میں تیزی سے بھاگ کر لالہ کے پورشن میں آ گئی' لالہ ایک ہفتے کے لیے کسی آفیشل کام کے سلسلے میں اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ اور مجھے پتہ تھا کہ ان کی ٹی ٹی اور پسٹل کہاں رکھے ہوئے ہوتے تھے۔ میں نے تیزی سے ٹی ٹی نکال کر اس میں میگزین لگا کر اسے لوڈ کیا اور بھاگی ہوئی واپس اپنے پورشن میں آ گئی کھڑکی میں کھڑے ہو کر میں نے ایک بار پھر گلریز کو وارن کیا تھا جہاں وہ اب کشمالہ کے منہ سے ہاتھ ہٹا چکا تھا اور اپنی طاقت آزمانے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ کشمالہ اپنے بچاؤ کی......

''گلریز...... چھوڑ دو کشمالہ کو ورنہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گی۔'' میں نے چلا کر کہا تھا۔

''نہیں تم ایسا کر ہی نہیں سکتیں۔'' وہ بے ہنگم ہنسی ہنسا تھا۔

''بہت غلط جج کیا ہے تم نے مجھے' محبت اور عزت میں میری ترجیح ہمیشہ عزت رہی ہے۔'' میں نے کہہ کر فائر کر دیا میرا نشانہ تو اس کا شانہ تھا مگر ہاتھا پائی میں اسی وقت اس کا سینہ میرے فائر کی زد میں آ گیا اور میں نے فائر کر دیا میرے ذہن میں اس وقت صرف ایک ہی بات چل رہی تھی مجھے لالہ کی عزت کو بچانا ہے' خواہ گولی گلریز کو لگے یا کشمالہ کو' لیکن گولی گلریز کو ہی لگی اور عین سینے کے درمیان لگی اس نے فوراً سینہ پکڑ لیا اور کشمالہ کو چھوڑ دیا' کشمالہ نے تیزی سے دروازہ کھولا اور مجھ سے لپٹ گئی۔ مگر میرا ذہن بڑی تیزی سے چل رہا تھا میں نے کشمالہ سے کہا۔

''کشمالہ تم فوراً اپنے پورشن میں جاؤ' اور یہ کپڑے اتار کر دھو دو۔''

''شنگ! کیا چل رہا ہے تمہارے دماغ میں۔'' اُس نے مجھے جھنجھوڑا۔

''کشمالہ سوال و جواب کا وقت نہیں ہے جو میں کہہ رہی ہوں وہ غور سے سنو' چاہے کوئی تمہاری کنپٹی پر ریوالور بھی رکھ دے تو تم نے وجہ نہیں بتانی ہے کہ میں نے گلریز پر کیوں فائر کیا ہے۔ تم نے سب سے یہی کہنا ہے کہ تم فائر کی آواز سن کر آئی تھیں۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''مگر کیوں شنگ! درست وجہ بتانے کا تمہیں فائدہ ملے گا۔'' وہ جھنجلا کر بولی۔

''مجھے کوئی فائدہ نہیں چاہیے کشمالہ' تم میرے لالہ کی عزت ہو ہمارے خاندان کی بہو ہماری عزت ہو اور میں اپنے خاندان کی عزت اچھلتے نہیں دیکھ سکتی۔'' میں نے چیخ کر کہا۔

''لیکن......'' اس کی بات ابھی منہ میں ہی تھی کہ میں نے اُچک لی۔

''کوئی لیکن ویکن نہیں تمہیں ایمل اور پلوشہ کی جان کی قسم اگر تم نے کسی سے کچھ کہا تو اُن کا مرا منہ دیکھو۔'' میں نے بے رحمی سے کہا اور اُس

نے بے یقینی سے میرے پتھریلے چہرے کو دیکھا۔

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔'' اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

''اور ہاں کشمالہ! جاتے ہوئے ایمل کو ساتھ لے جانا' اب اِن دونوں بچوں کو سنبھالنا تمہارے ذمے ہے' یہ ڈر یہ خوف ایمل کی زندگی پر محیط ہو جائے گا اب تمہیں دیکھنا ہے کہ تمہیں اسے اس خوف سے کیسا نکالنا ہے۔'' میں نے کہا تو اس نے سر ہلایا پھر وہ ایمل کو لے کر اپنے پورشن میں چلی گئی اور پھر ذرا ہی دیر بعد وہ سوتی ہوئی پلوشہ کو بھی لے گئی تھی۔

میں نے اندر آ کر گلریز کے Vital Signs چیک کیے مگر سب ساکت تھے' اس کے گرد خون کا ایک چھوٹا سا تالاب بن چکا تھا۔ میں نے پولیس کو فون کیا اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا آلہ قتل سمیت' کشمالہ نے لالہ کو فون کر دیا تھا وہ بھی فوراً ہی آ گئے تھے۔

☆☆......☆☆......☆

سب مجھ سے پوچھ پوچھ کر تھک گئے مگر میں نے وجہ نہ بتائی۔ ایسے میں کشمالہ بڑی شاکی نظروں سے مجھے دیکھتی تھی اور میں آنکھیں چرا جاتی تھی۔ لالہ نے ہر ممکن کوشش کی ناراضگی کا اظہار تک کیا مگر میں نے زبان نہ کھولی اور مجھے عمر قید ہو گئی قتل خواہ ایک کرو یا ایک ہزار سزا ایک ہی ہے سزائے موت یا ثبوت ناکافی ہوں تو عمر قید...... پہلے قتل پر بابا نے مجھے بچا لیا تھا دوسری بار لالہ نے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ مگر قدرت ہر بار تو نہیں چھوڑتی ناں اور اس بار تو میں خود بھی سزا سے بچنا نہیں چاہتی تھی۔ میں تو اُسی دن مر چکی تھی جب گلریز نے مجھے میرے ہی بابا اور لالہ کے حوالے سے زبانی پتھروں سے سنگسار کر دیا تھا۔ اب یہ مردہ جسم کہیں بھی رہتا کیا فرق پڑتا تھا۔

سزا ہونے کے بعد کشمالہ لالہ کے ساتھ آئی تھی۔ تو میں نے اس سے کہا تھا۔

''آج سے پلوشہ اور ایمل تمہارے ہوئے' وہ دونوں ابھی بہت چھوٹے ہیں اگر تم ماضی کو ان کے ذہن سے مٹا دو گی تو وہ باآسانی مٹ جائے گا۔''

''نہیں تم باہر آؤ گی تو میں تمہیں اُن کی ماں کی حیثیت سے ہی متعارف کرواؤں گی۔'' وہ ضدی لہجے میں بولی تھی۔

''ماں نہیں پھوپو کی حیثیت سے متعارف کروانا۔ ان کی شخصیت کی تعمیر کرنا انہیں بابا اور لالہ کی طرح بنانا گلریز جیسا مت بنانا۔'' میں نے استہزائیہ کہا تھا۔

''اب یہ لاجک بھی بتا دو کہ تمہیں پھوپو کی حیثیت سے کیوں متعارف کرواؤں۔'' وہ چڑ کر بولی تھی۔

''میں نہیں چاہتی کشمالہ! کہ ان کی شخصیت میں کوئی جھول ہو۔ باپ ان کا مر چکا ہے' ماں ان ہی کے باپ کے قتل کے جرم میں جیل میں ہے اور تمہیں کیا لگتا ہے ایسے بچے کیسی شخصیت لے کر بڑے ہوں گے۔'' اور میری بات اسے سمجھ آ گئی اور اس نے سر ہلایا اور وہ چلی گئی۔

گلریز کے کاروبار پر اس کے تایا زادوں نے قبضہ کر لیا وہی کاروبار اور پیسہ جس کے بل پر وہ فرعون بنا' اُم الخبائث کو منہ لگایا۔ شیطان کا چیلا بنا اپنا دل گھر اور بچے برباد کیے اور موت کی گود میں جا سویا۔

میرے بچے اب کافی بڑے ہو چکے ہیں اور میرے لالہ اور کشمالہ ان کی بہترین پرورش کر رہے ہیں۔

☆☆......☆☆☆

بھکر سے دوسری جیتی جاگتی کہانی



سعید شیخ کا ایقان

اک درد میرے دل میں اُڑاتا رہا غبار
ملبوس خواب ہوتا رہا مجھ میں تار تار

ملازم حسین شیرازی

جمیل صاحب اسٹیل ملز میں اعلیٰ عہدے پر کام کر رہے تھے۔ ایک نفیس' مخلص' بااخلاق اور شریف انسان تھے۔ وہ اکثر میرے آفس اپنی بیگم دو بیٹیوں اور بڑی بیٹی کے خاوند (داماد) کے



ساتھ چکر لگاتے۔ اُن کی رہائش کے ڈی اے اسکیم ون میں تھی۔ جمیل صاحب کی بیگم ایک پڑھی لکھی خوبصورت اور گھریلو عورت تھیں۔ اُن کی بڑی بیٹی کی شادی اپنے یونیورسٹی کے کلاس فیلو ایک عربی نوجوان سے ہوئی تھی وہ نہایت خوبصورت' نیک خصلت تھی ہمیشہ پردے میں رہا کرتی تھی' اُن کا خاوند عام سی واجبی شکل وصورت کا حامل تھا' شادی میں دولہا کی طرف سے والدین یا کوئی رشتے دار شریک نہیں تھا۔ صرف دو تین یونیورسٹی کے دوست شریک تھے۔ میں نے دبے الفاظ میں جمیل صاحب اور اُن کی بیگم کو اپنی تشویش سے آگاہ کیا تھا کہ اس موقع پر کم از کم لڑکے کے والدین کی شرکت ضروری تھی' اس کی یہ خوبی کہ وہ عربی ہے' امیر کبیر ہوگا زیادہ اہم بات نہیں' لیکن جمیل صاحب اور اُن کی بیگم نے میری تشویش پر توجہ نہ دی تھی' سو میں نے بھی زیادہ نہ کریدا تھا کہ یہ اُن کا ذاتی معاملہ تھا۔

جمیل صاحب اور ان کی بیگم کافی کے بہت شوقین تھے اور میرا آفس بوائے واقعی اچھی کافی بناتا تھا' اُن لوگوں کی آفس آمد کے دوران میں نے ایک چیز نوٹ کی تھی کہ اُن کا داماد جو بھی بات کرتا' جمیل صاحب کی بیگم سب کے سامنے اُن کا ماتھا چومتیں' ہاتھوں کے بوسے لیتیں ہوسکتا ہے اِس اقدام کے پیش نظر اُن کا مطلع نظر بیٹے اور داماد کا پیار مقصود ہوتا' لیکن اصولاً اور آداب محفل کے لحاظ سے یہ حرکت نازیبا اور ناشائستہ تھی' لیکن انہیں پروا نہ تھی اور جمیل صاحب بھی اس کا خاص نوٹس نہ لیتے تھے اور مجھے حقیقتاً بڑی کوفت ہوتی تھی۔ اور پھر یہ ہوا کہ میں کچھ کاروباری سلسلے میں باہر چلا گیا اور تقریباً ایک سال بعد واپس لوٹا تھا۔

وطن واپسی پر میں نے جمیل صاحب سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اسٹیل ملز سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی' اسکیم ون میں جو مکان تھا وہ چھوڑ چکے تھے اور بقول اُن کے پڑوسیوں کے وہ گلشن اقبال میں ایک فلیٹ میں شفٹ کرگئے ہیں' یہ سب جان کر مجھے بہت حیرت ہوئی کیونکہ سروس میں ابھی اُن کے دس بارہ سال باقی تھے۔ پھر گھر کی منتقلی اور عام سے فلیٹ میں قیام' یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

ایک دن میں جمیل صاحب سے ملنے اُن کے فلیٹ پر گیا' وہ عام سی بلڈنگ تھی' تھرڈ فلور پر اُن کا فلیٹ تھا جو دو بیڈ رومز پر مشتمل تھا۔ انہیں دیکھ کر میں بہت حیران ہوا' وہ کرسی پر سر جھکائے نظریں نیچی کیے اُداس بیٹھے تھے' اُن کی بیگم چھوٹے سے ٹیرس میں بیٹھی خاموش اور اُداس اُداس سی نظر آرہی تھیں' بیٹیاں دکھائی نہ دے رہی تھیں غالباً وہ پڑوس کا کوئی بچہ تھا جس نے دروازہ کھولا تھا' جمیل صاحب مجھے دیکھتے ہی نہایت بے تابی اور گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے تھے اُن کی آنکھوں میں آنسوؤں کی روانی تھی۔ مجھ سے ملنے پر اُن کے چہرے پر بے رونق مسرت تھی میں اُن کی دلی کیفیات سمجھ رہا تھا کہ ایسا کوئی واقعہ روپذیر ہوچکا ہے کہ جس کی وجہ سے یوں ہنستا بستا شاداب گھرانا اُداسی کی لپیٹ میں لپٹا ہے' بھابی سے دعا سلام ہوئی وہ بھی اسی طرح ملیں جیسے کوئی اپنا برسوں بعد دکھائی دے۔

میں نے جمیل صاحب کے ہاتھوں کو تھاما' اپنی بے چینی اور اضطراب کا اظہار کیا کہ یہ سب کیسے ہوا' انہوں نے دروازہ بند کیا اور بتانے لگے۔

''شیرازی صاحب! تقریباً ایک سال بعد آپ سے ملاقات ہورہی ہے اس عرصے میں کئی طوفان آئے چلے گئے لیکن اُن کے اثرات اور نقوش آج بھی ہماری زندگیوں میں ثبت ہوکر رہ گئے' اُن بیتے ایام میں آپ کو بہت یاد کیا۔ وہ

حسین ایام تھے' پھر دکھوں نے ایسا گھیرا کہ کوئی اپنا بھائی نہ دیتا تھا کہ جس سے حال دل کہتے' ویسے بھی مصیبت میں کون کسی کا ساتھ دیتا ہے۔''

''مجھے آج بھی یاد ہے کہ بڑی بیٹی کی شادی پر آپ نے اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا اور دوسرا بیگم صاحبہ کی اپنے داماد کی بے جا حمایت' بات بات پر حوصلہ افزائی آپ کو کھٹکتی تھی' لیکن ہم نے پروا نہ کی اس کا انجام خطرناک نکلا۔ ہوا یوں کہ میرے والدین نے چھوٹی بیٹی کے رشتے کے لیے ہمارے ایک دور کے رشتے دار کے بارے میں بات کی' وہ میری بڑی بیٹی کے رشتے والے معاملے کے حوالے سے خفا تھے' میری از حد خواہش تھی کہ اُن کی خفگی دور ہوجائے۔ وہ لڑکا جس کے لیے میرے والدین نے بات کی تھی نہایت ہی سعادت مند' نیک' اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا' ہم میاں بیوی از حد خوش ہوئے۔ مگر جب ہمارے داماد کو اِس رشتے کا پتہ چلا تو بہت سیخ پا ہوا' اُسے اس رشتے پر اعتراض تھا وہ چاہتا تھا کہ میری چھوٹی بیٹی کا رشتہ اُس کے ایک واقف کار سے ہو' داماد کا رشتہ اپنی جگہ لیکن بیٹی ہماری تھی ہماری اولاد تھی اُس کے مستقبل' نفع نقصان کے ہم ذمہ دار تھے۔ میں نے داماد کی خواہش' بلکہ مطالبہ رد کردیا اور کہا کہ وہی ہوگا جو میرے والدین چاہیں گے۔

میرے داماد نے اس بات کو اپنی ضد اور انا بنالیا تھا' ہر وقت لڑائی جھگڑے پر تیار رہنے لگا' میری بیٹی کے ساتھ ظلم اور زیادتی کرنے لگا' مختصر یہ کہ ہمارے ساتھ اُس کا رویہ معاندانہ ہوگیا تھا' ہم بہت پریشان تھے اور پھر ایک دن اُس ظالم اور شقی القلب انسان نے میری معصوم اور بے گناہ بیٹی کو طلاق دے دی' بیٹی دو کپڑوں میں ہمارے پاس آگئی تھی۔

مجھے بیگم صاحبہ سے یہ شکایت تھی کہ اُن کی جانب سے داماد کی بے وجہ حمایت' حوصلہ افزائی اور سر چڑھانے کے نتیجے میں یہ سانحہ پیش آیا' ہماری ہر وقت تُو تُو میں میں ہونے لگی تو گھر کا ماحول بہت خراب ہوگیا' اور پھر ایک روز ان سے لڑائی کے دوران میں نے غصے اور جذبات میں انہیں طلاق دے دی۔ اِس طلاق کی وجہ سے ہم سب بکھر گئے۔ منتشر ہوگئے اور اذیتوں کا شکار ہوگئے۔ ساری خوشیاں اور سکون برباد ہوگیا' میں گھر میں تنہا ہوگیا' بیوی اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ ماں باپ کے پاس چلی گئی' میری ذہنی کیفیت ایسی ہوگئی کہ میں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا' اب میں ہر وقت گھر میں پریشان و ہراساں رہتا تھا۔ تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی' پہلے بڑی بیٹی کی طلاق کا صدمہ' پھر چھوٹی کے رشتے کی تلخیاں' ہماری پچیس سالوں پر محیط رفاقت' پیار محبت' ایک غلط اقدام کی نذر ہوگئے' میں بہت پچھتا رہا تھا کہ میرے ایک جذباتی فیصلے نے پیار کی ڈوری کو توڑ دیا تھا' میری بیوی بھی گذرے ایام کو یاد کرکے ہر وقت رنج و غم میں پڑی رہتی تھی۔ اب میں بھی چاہتا تھا' اُس کی بھی خواہش تھی کہ دوبارہ اپنے رشتے میں بندھ جائیں اور پھر سے ایک نئی زندگی کا آغاز کریں' لیکن کیسے؟ یہ کس طرح ممکن ہوگا؟ ہم ہر وقت اُن ہی سوچوں میں غلطاں رہتے تھے پھر کسی نے صلاح دی کہ اس سلسلے میں علماء کرام سے رجوع کیا جائے وہ شرعی طور پر اس کا حل بتائیں گے۔

میں نے بنوری ٹاؤن کے علماء سے رجوع کیا تھا' ہر دو کے مسئلے کو بیان کیا' بتایا گیا کہ اس کا شرعی حل یہ ہے کہ 'حلالہ' کیا جائے۔ آپ کی سابقہ بیوی کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے' انسانی فطری تقاضے پورے کرے۔ پھر اُس کا خاوند

طلاق دے تو وہ دوبارہ آپ کے عقد میں آ سکتی ہے۔ جب تک وہ دوسرے مرد کے نکاح میں نہ ہوں گی اور اُس سے طلاق نہیں لیں گی۔ آپ کے لیے اُن سے رشتہ حرام ہے' اُن کی بات میری سمجھ میں آ گئی تھی' بیگم صاحبہ بھی تیار تھیں۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ کس سے نکاح کریں کس کی بیوی بنیں' جو انہیں طلاق دینے میں مخلص ہو۔

اسٹیل ملز کے زمانے میں تقریباً عرصہ بیس سال' ریاض میرا چپراسی تھا۔ بہت خدمت گزار اور ہر وقت فرمان کے تابع رہتا تھا۔ میں وقتاً فوقتاً اُس کی مالی مدد کرتا رہتا تھا۔ وہ شادی شدہ اور چار بچوں کا باپ تھا۔ اسے میں نے اعتماد میں لیا کہ وہ میری سابقہ بیوی سے نکاح کرے رات گزارے اور دوسری صبح طلاق دے۔ اس کے عوض میں اُس کی خاصی مالی مدد بھی کروں گا۔ اسے بھلا کیا اعتراض ہوتا' وہ فوراً تیار ہو گیا تھا۔

دو دن بعد اِس نکاح کا اہتمام کیا گیا' مولانا صاحب کو گھر بلایا' چند قریبی رشتے دار مدعو کیے' والدین بادل نخواستہ شریک ہوئے۔ شہادتوں اور گواہان کی موجودگی میں نکاح پڑھا گیا۔ نکاح کے بعد سب رخصت ہو گئے' اگلا مرحلہ ہمارے عقد ثانی کا تھا جو بعد از طلاق ہمارے درمیان ہونا تھا' ریاض اپنی منکوحہ کو لے کر چلا گیا اور دوسری صبح آنے کا وعدہ کیا۔ میں بوجھل دل اور عالم افسردگی کے ساتھ اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا اور ساری رات تڑپتا رہا' میں نے ایک جذباتی فیصلہ کیا تھا بے وجہ طلاق دی تھی' جو کہ میرے داماد کے ظلم کا شاخسانہ تھی' جس کی سزا شریعت نے یہ دی تھی کہ حلالہ ہو گا۔ بیوی شب باشی کرے گی شریعت نے یہ سزا صرف اس لیے رکھی ہے کہ جو ظلم زیادتی بے وقوفی کرے گا' حقوق العباد سے

غزل

اُس کی جانب مجھے میلان سا ہونے لگا ہے
دشمنِ جان میری جان سا ہونے لگا ہے

ایک قطرہ سا بچایا تھا لہو کا دل میں
وہی قطرہ ہے جو طوفان سا ہونے لگا ہے

لوگ اب اُس کے حوالوں سے مجھے جانتے ہیں
اِک مسافر میری پہچان سا ہونے لگا ہے

رت جگے راس نہیں تھے تو گلہ تھا مگر اب
ہجرِ جاناں ذرا آسان سا ہونے لگا ہے

آؤ ہم موت سے کہتے ہیں ذرا دیر کرے
زندگی کا کوئی امکان سا ہونے لگا ہے

زخم بھرنے لگے سب چاک رفو ہونے لگے
درد بڑھتا ہوا درمان سا ہونے لگا ہے

ہم بھی اب بھولنے والے ہیں سبھی داغ عدیلؔ
وہ بھی نستے ہیں پشیمان سا ہونے لگا ہے

اجمل عدیلؔ

انحراف ہو گا تو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

وہ رات بہت تاریک اور لمبی تھی جو آخر کار کٹ ہی گئی اور سپیدہ سحر نمودار ہوا صبح طلوع ہوئی' مگر میں انتظار کی گھڑیاں گنتے گنتے تھک گیا' صبح گزر گئی' دوپہر ختم ہو گئی۔ شام کے سائے ڈھل رہے تھے لیکن ریاض نہ آیا' جبکہ اس کی طرف سے عہد تھا کہ صبح وہ طلاق کی کارروائی مکمل کرے گا اور بیگم صاحبہ عدت میں بیٹھیں گی۔

رات کو میں بوجھل قدموں کے ساتھ اُس کے گھر گیا' وہ اپنی نئی بیوی کے ساتھ کمرے میں بند تھا' اُس کی پہلی بیوی اور بچے اپنے ماں باپ کے گھر گئے ہوئے تھے۔ میں دو گھنٹے انتظار کی سولی پر چڑھا رہا۔ کیا عجیب صورت حال اور تماشا تھا پچیس سال ساتھ رہنے والی شریک سفر محبت کرنے والی بیوی میرے سامنے دوسرے کی بانہوں میں بے بس تھی۔ آخر خدا خدا کر کے کمرے کا کھلا' وہ لپک کر میرے پاس آیا۔ میں نے شکایتاً اُس سے استفسار کیا کہ کیا وجہ ہے وہ ابھی تک گھر میں ہے۔ اور معاہدہ کی خلاف ورزی کر رہا ہے' کہنے لگا۔

''صاحب آپ کیوں جلدی کرتے ہیں' وہ میری بیوی ہے' منکوحہ ہے صبر کریں۔''

''ریاض تم میری حالت سے آگاہ ہو' ہمارے درمیان معاہدہ ہوا تھا کہ رات گزارنے کے بعد صبح اُسے آزاد کر دو گے اب کیوں منحرف ہو رہے ہو؟''

''میں جلد چھوڑ دوں گا' آپ کیوں بے تاب ہو رہے ہیں' سچی بات یہ ہے کہ میرا دل نہیں بھرا...... میں عنقریب......''

''دیکھو ریاض تم میرے صبر کا امتحان لے رہے ہو' ابھی فیصلہ کر دو ورنہ......'' مجھے غصہ آ گیا تھا۔

وہ میری بات کاٹ کے بولا تھا۔

''ورنہ کیا؟ آپ کیا کریں گے' آپ کیوں بھول گئے کہ وہ میرے نکاح میں ہے' پریشر ڈالا' سختی کی تو میں قانون کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا' آپ کے خلاف کارروائی ہو گی' جگ ہنسائی علیحدہ ہو گی' مناسب یہ ہو گا کہ انتظار کرو۔''

''شیرازی صاحب وہ دن میرے لیے قیامت سے کم نہ تھے' میں سخت اذیت کا شکار تھا وہ ایک بدنیت شخص کی بانہوں میں سسک رہی تھی' وہ اُس کے زیر اثر تھی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

میرے والدین اور خصوصاً میری دونوں بیٹیاں بہت زیادہ رنجیدہ اور اُداس تھیں' میں نے جب طلاق دی تھی تو انہیں بخوشی ماں کے حوالے کیا تھا لیکن اب وہ باپ کی سرپرستی' شفقت اور ماں کی ممتا سے محروم تھیں' انتظار کرتے کرتے اس عذاب کو جھیلتے جھیلتے چھ ماہ گزر گئے۔ آخر کار ریاض بیوی کو چھوڑنے' آزادی دینے پر تیار ہو گیا مگر اِس شرط پر کہ اگر میں اُسے مزید دس لاکھ روپے دوں تو وہ چھوڑ دے گا۔ چونکہ میں نے نوکری چھوڑ دی تھی' گریجویٹی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ اتنے پیسے کہاں سے دیتا آخر کار میرے والدین نے اپنا مکان فروخت کیا اور پیسے اس کے منہ پر مارے' تب اُس نے طلاق دی' بڑی مصیبتوں اور تکلیفوں کے بعد بیگم کی جان چھوٹی' وہ واپس آئیں اور عدت پوری کرنے کے بعد ہم نے دوبارہ نکاح کیا۔

آج وہ پھر میری بیوی ہیں' لیکن زندگی کے چند جذباتی فیصلوں اور اقدام کے عوض ہم نے بہت بھاری قیمت ادا کی ہے۔ ہماری زندگی میں اب وہ پہلے والا سکون اور آرام نہیں ہے بلکہ کھوئے کھوئے خاموش اور اکیلے اکیلے رہنا ہمارا وطیرہ بن چکا ہے۔

☆☆......☆☆

کراچی سے تیسری جیتی جاگتی کہانی

خالی ہاتھ

سلیم احمد کا ایقان

یہ	چاہا	تھا	کہ	پتھر	بن	کے	جی	لوں
سُو	اندر		سے		پگھلتا	جا رہا		ہوں

فوزیہ اختر

بعض دفعہ انسان زندگی میں ایسی غلطیاں کرتا ہے کہ عمر بھر کا پچھتاوا بن جاتا ہے۔ اور کفِ افسوس ملتا رہ جاتا ہے۔ مگر اس وقت ہاتھ خالی رہ جاتے ہیں' میری زندگی کی کہانی بھی کچھ اسی طرح



ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میرے ہاتھ خالی ہیں۔

میری صورت وشکل تو واجبی سی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ذہانت خوب عطا کی۔ مجھ سے بڑے دو بھائی تھے اور میں سب سے چھوٹی تھی۔ والدہ نہایت نیک اور صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں۔ والد صاحب سرکاری محکمے میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔

مگر انتہائی نیک اور ایمان دار' ساری زندگی حق حلال کی کمائی سے ایک گھر بنایا۔ والدہ نے اپنے سلیقے سے اس گھر میں چار چاند لگادیے' ہمارا گھر محبتوں اور امن کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔

میں نے میٹرک فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا تو گویا گھر میں جشن کا سماں بن گیا۔ والدہ میری بلائیں لیتے نہ تھکتیں تھیں اور بھائیوں نے پورے محلے میں مٹھائیاں تقسیم کی تھیں۔

زندگی کے دن یونہی ہنسی خوشی گزر رہے تھے اور میں اپنے حصے کی کامیابیاں سمیٹ رہی تھی۔ میرے لیے زندگی بہت خوبصورت ہوگئی تھی۔ اور اب ہوا یہ تھا کہ اپنے نہایت ذہین ہونے کے زعم اور والدین کے پیار ومحبت نے مجھے مغرور بنادیا تھا۔

میرا داخلہ کراچی کے سب سے بڑے کالج میں ہوا تھا۔ بڑے بھائی علی مجھے کالج چھوڑنے جاتے اور واپسی میں مجھے اپنے ساتھ لے آتے' پہلے دن جب میں کالج گئی تو بہت خوش تھی۔ یہاں میری ملاقات سیما سے ہوئی سیما مجھے بہت اچھی لگی وہ نہایت سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ میرا کالج کا پہلا دن خاصا خوشگوار تھا' میں گھر واپس آئی تو بہت خوش تھی اپنی والدہ کو سارا احوال سنایا۔ میری امی میری دوست تھیں۔ میں اُن سے اپنی ہر بات شیئر کرتی تھی۔

ایک دن جب میں کالج سے واپس آئی تو ایک خاتون امی جان کے پاس بیٹھی تھیں' میں نے سلام کیا تو امی نے تعارف کروایا۔

''یہ صائمہ ہیں میری اسکول فیلو' ہم نے میٹرک ساتھ ہی کیا تھا۔ ان کی بیٹی کی شادی ہے۔''

اگلے ہفتے ہم نے صائمہ آنٹی کی بیٹی کی شادی میں شرکت کی' صائمہ آنٹی نے بہت پرجوش طریقے سے ہمیں خوش آمدید کہا۔ آنٹی نے اپنے دونوں بچوں سے ہمارا تعارف کروایا۔ عاشر اور سمیر' عاشر آنٹی کا بڑا بیٹا تھا اور انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ عاشر کی نظریں بار بار میری جانب اٹھ رہی ہیں۔ میں نے کوئی خاص اہمیت نہ دی' واپسی میں بہت دیر ہوگئی رات ساڑھے گیارہ بجے کا ٹائم ہوگا۔ آنٹی صائمہ نے امی سے کہا۔

''اتنی دیر ہوگئی ہے کیسے جاؤ گی؟ ایسا کرو عاشر کے ساتھ چلی جاؤ وہ تمہیں گھر تک چھوڑ دے گا۔''

''نہیں عاشر کو خواہ مخواہ تکلیف کیوں دیتی ہو' ہم چلے جائیں گے۔'' امی نے شاید تکلفاً ہی کہا تھا۔

عاشر ہمیں گھر تک چھوڑنے آیا تھا۔ امی نے اُسے چائے کی آفر کی تھی۔

''نہیں آنٹی چائے آپ پر اُدھار رہی۔'' عاشر میری جانب معنی خیز نظروں سے دیکھتا ہوا مسکرادیا تھا۔

میرے بڑے بھائی علی نے ایم بی اے کرلیا تھا' وہ نوکری کے لیے کوشاں تھے' ابا جان کے

دوست کے توسط سے یہ مسئلہ بھی حل ہوگیا۔ بڑے بھائی کو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب مل گئی۔ والدہ بہت خوش تھیں والد صاحب بھی اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتے تھے۔

اِدھر بھائی جان کی جاب ہوئی اُدھر امی جان نے بھائی کے سر پر سہرا سجانے کا اعلان کردیا۔ لڑکیوں کی تلاش شروع ہوگئی۔

بھائی چاہتے تھے اُن کی بیوی خوبصورت اور سلیقہ مند ہو اور اللہ نے اُن کی مراد کرن بھابی کی صورت میں پوری کی' جو نہ صرف پڑھی لکھی بلکہ نہایت سلیقہ مند بھی تھیں' چند ماہ بعد بھائی کی شادی طے ہوگئی اور کرن بھابی دلہن بن کر ہمارے گھر آ گئیں۔

☆......☆......☆

میں اُن دنوں دن رات پڑھائی میں مصروف تھی کیونکہ میرے انٹر کے امتحانات ہونے والے تھے۔ میں صبح کالج اور شام میں کوچنگ' کے لیے جاتی تھی کہ میرے نمبر اچھے آئیں اس لیے دن رات محنت کررہی تھی۔ سیما اور میں نے مل کر نوٹس بنائے تھے اکثر ہم دونوں لائبریری ساتھ جاتے' اور پھر امتحانات کی تاریخ آ گئی ہماری مصروفیت اور بڑھ گئی' اللہ اللہ کرکے پیپرز ختم ہوئے تو ہم نے سکون کا سانس لیا' اللہ کا شکر تھا ہمارے پیپرز اچھے ہوئے تھے ہم گھر میں بیٹھے رزلٹ کا انتظار کررہے تھے۔

سیما سے اکثر فون پر بات ہوجایا کرتی تھی۔ یا پھر میں سیما کو گھر پر بلالیا کرتی تھی' وہ آجاتی تو ہم خوب گپ شپ کرتے۔ رزلٹ آیا تو میں نے فرسٹ ڈویژن میں انٹر پاس کیا تھا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ میں کامیابی سے اپنی منزل طے کررہی تھی۔ گھر میں سبھی بہت خوش تھے۔ میں نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

ایک دن صائمہ آنٹی ہمارے گھر آئی تھیں۔ امی نے مجھے چائے وغیرہ بنانے کے لیے کہا تھا۔

صائمہ آنٹی کی امی سے والہانہ محبت دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی دونوں سہیلیاں اپنے بچپن میں کھو جاتی تھیں اور پرانی یادیں تازہ کرتیں' فی زمانہ ایسی محبت دیکھنے میں بہت کم آتی ہے۔ جب صائمہ آنٹی چلی گئیں تو امی خوشی خوشی کمرے میں داخل ہوئیں میں واضح طور پر خوشی کے آثار اُن کے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔

''امی آپ بہت خوش نظر آرہی ہیں کیا بات ہے؟'' میں کہے بنا نہ رہ سکی۔

''بیٹا بات ہی کچھ ایسی ہے۔ تمہاری صائمہ آنٹی چاہتی ہیں کہ ہمارا رشتہ اور مضبوط ہوجائے' وہ عاشر کا پرپوزل لے کر آئی تھیں' سچ پوچھو تو مجھے عاشر بہت پسند ہے اور میں دل سے یہی چاہتی ہوں کہ تم صائمہ کی بہو بن جاؤ' صائمہ ایک سلجھی ہوئی اور پڑھی لکھی عورت ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ میرے بچپن کی دوست ہے اور بہنوں کی طرح ہے۔ میں آج ہی اِس سلسلے میں تمہارے ابو سے بات کروں گی۔'' امی ایک سانس میں سب کچھ کہہ گئی تھیں۔

''مگر! امی بے شک عاشر ایک اچھا پڑھا لکھا نوجوان ہے' لیکن میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی' میں ابھی بس پڑھنا چاہتی ہوں اعلیٰ کیریئر بنانا چاہتی ہوں۔'' میں نے امی کو دوٹوک جواب دیا تھا۔

''بیٹا زوبی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو...... عاشر پڑھا لکھا لڑکا ہے اور اب انجینئر بھی بن چکا ہے' ایسے اچھے رشتے تو قسمت والوں کو ہی ملا کرتے ہیں۔ تم چاہو تو شادی کے بعد بھی پڑھ سکتی ہو' اُن

کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں نوکر چاکر ہیں۔
اور اللہ کا دیا سب کچھ ہے اُن کے پاس' پھر ایسے بہترین رشتے گھر بیٹھے کہاں ملتے ہیں' بیٹی تم رشتے سے انکار نہ کرو' ناشکری کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔'' امی مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''کتنی اچھی خوبصورت لڑکیاں صرف اس وجہ سے گھر بیٹھی رہ جاتی ہیں کہ انہیں مناسب رشتہ نہیں ملتا' یا کوئی رشتہ آتا ہی نہیں' کبھی لوگ اچھے نہیں ہوتے تو کبھی کوئی اور مسئلہ...... تم خوش قسمت ہو کہ اتنا اچھا رشتہ گھر بیٹھے مل گیا ہے۔''

''امی! میں آپ سے کہہ چکی ہوں میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی' میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتی ہوں۔ پلیز مجھے سکون سے پڑھنے دیں۔ شادی کے لیے تو عمر پڑی ہے۔'' میری یہ بات سن کر امی خاموش ہوگئی تھیں۔

میں اور سیما یونیورسٹی میں بھی ساتھ ساتھ تھے۔ اُن ہی دنوں سیما کے لیے اُس کے چچازاد بھائی کا رشتہ آیا اور اُس کی وہاں منگنی ہوگئی۔ سیما بہت خوش دکھائی دیتی تھی اور اکثر اپنے منگیتر کی باتیں مجھ سے شیئر کرتی تھی۔

ہماری کلاس میں حسن بھی پڑھتا تھا' حسن اچھا اور نیک صفت طالب علم تھا اکثر میری اُس سے بات چیت ہو جایا کرتی تھی۔ ایک دن سیما کا فون آیا وہ یونیورسٹی نہیں آئے گی' اُس کی طبیعت خراب ہے' جبکہ میں یونیورسٹی کے لیے نکل چکی تھی۔

اُس روز موسم ابر آلود تھا' میں اپنا لیکچر نوٹ کر رہی تھی کہ سامنے سے حسن آتا دکھائی دیا۔

''ہیلو کیسی ہو زوبی اور اتنے اچھے موسم میں بھی کوئی بھلا پڑھائی کرتا ہے' چلو کینٹین چلتے ہیں اور چائے پیتے ہیں۔''

جواباً میں مسکرا دی۔

''ہاں کیوں نہیں؟''

''آج تمہاری سہیلی سیما نظر نہیں آ رہی' موصوفہ جونک کی طرح چمٹی رہتی ہیں۔''

''ہاں! آج اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

کینٹین میں حسن نے چائے منگوائی تھی اور مختلف موضوعات پر ابھی بحث کا سلسلہ جاری تھا کہ موسم جل تھل ہو گیا اور بارش شروع ہوگئی۔

''اُف خدایا! میں گھر کیسے جاؤں گی اتنی تیز بارش میں۔'' میں نے پریشان ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''زوبی! اگر تم برا نہ مانو تو میں تمہیں گھر تک چھوڑ دوں۔''

''مگر......!''

''اگر مگر کچھ نہیں' بھلا تم کیسے جاؤ گی' آ جاؤ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔'' اِس کے سوال میرے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا' میں گاڑی بیٹھ گئی تھی۔

سفر کے دوران حسن نے اچانک ہی مجھے مخاطب کیا تھا۔

''زوبی! میں بہت دنوں سے تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں مگر کہہ نہیں سکا' زوبی یہ ہمارا فائنل ایئر ہے اب ہم سب علیحدہ ہو جائیں گے' ہماری منزلیں بھی الگ ہیں۔ زوبی میں تمہیں بہت چاہتا ہوں اور تم سے شادی کا خواہش مند ہوں۔ میں نے جب سے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو اپنے دل میں بسا لیا تھا' میں دل ہی دل میں تمہاری ذہانت کو تمہارے کردار کو سراہتا رہا ہوں' میں تمہیں ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا تھا' اس لیے میں نے کبھی تم سے اِس بات کا ذکر نہیں کیا۔'' حسن

بس بولے ہی جا رہی تھا۔

''شاید میری یہ محبت یکطرفہ ہو' لیکن مجھے لگا تم بھی دل میں میرے لیے نرم گوشہ رکھتی ہو۔ پلیز میری چاہت میری محبت کا جواب چاہت ہی سے دینا' کہیں میرے دل کا خون نہ کر دینا' آج میں نے بہت سی ہمت جمع کر کے تم سے یہ بات کہی ہے۔''

میں بہت حیرانی سے حسن کو دیکھ رہی تھی' مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں۔

''لو زوبی تمہارا گھر آ گیا۔''

اچانک حسن کے جملے پر میں چونکی۔

''ہاں بس مجھے یہیں چھوڑ دو۔''

''زوبی میں تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا۔'' یہ کہنے کے بعد حسن مجھے ڈراپ کر کے جا چکا تھا اور میرے دل و دماغ میں ایک جنگ جاری تھی۔

میں گھر پہنچی تو امی کو اپنا منتظر پایا۔

''بیٹا موسم خراب ہونے کی وجہ سے میں بہت پریشان تھی اچھا ہوا تم آ گئیں۔ تم کپڑے بدل لو اور کھانا کھا لو۔''

''امی مجھے بھوک نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

شاید میرے دل کے کسی کونے میں بھی حسن کی محبت ایک چنگاری کی طرح موجود تھی جو راکھ میں دبی ہوئی تھی میرے دل نے کہا تم حسن کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ حسن تمہارا مستقبل ہے' تمہارا پیار ہے' ڈیسنٹ' پُر وقار' ذہین' تمہارا روشن کل' مگر...... دماغ نے کہا۔

''نہیں تمہاری منزل تو اعلیٰ مقام اور کیریئر ہے' اگر تم شادی کے چکر میں پڑ گئیں تو شاید اپنے خواب پورے نہ کر سکو اور تمہارے خواب ادھورے رہ جائیں گے۔''

یہ سب سوچتے سوچتے جانے کب میری آنکھ لگ گئی تھی۔

صبح امی نے مجھے جگاتے ہوئے کہا تھا۔

''بیٹا تمہیں کتنا سخت بخار ہے ناشتہ کر لو تاکہ میں دوا دے دوں۔''

''امی! مجھے کیا ہوا ہے بس ذرا سر میں درد تو ہے۔''

''نہیں نہیں کل تم بارش میں بھیگ گئی تھیں' اس لیے تمہیں بخار ہو گیا ہے' چلو کچھ کھا لو۔'' امی ٹھیک کہہ رہی تھیں' اُس وقت واقعی میرا جسم درد کی شدت سے ٹوٹ رہا تھا۔

شام تک کچھ طبیعت بہتر ہوئی تو میں نے سیما کو فون کیا مگر اُس سے بات نہ ہو سکی' میں سیما سے کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی' میں دوسرے دن بھی یونیورسٹی نہ جا سکی' میں فوری طور پر سیما سے ملنا چاہتی تھی' مگر امی نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ جب تک طبیعت ٹھیک نہیں ہو جاتی تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ اور پھر اتفاق سے یونیورسٹی سے واپسی پر سیما میرے گھر آ گئی تھی تو میں بہت خوش ہوئی تھی اور میں نے ساری بات سیما کو بتا دی تھی۔

''سیما تم میری بہت اچھی دوست ہو بتاؤ میں کیا کروں' میرے سامنے میرا مستقبل ہے اور میں اپنے خواب کو پورا کرنا چاہتی ہوں اور دوسری طرف حسن ہے بتاؤ میں کیا کروں؟'' سیما میری بات غور سے سن کر بولی۔

''زوبی حسن بہت اچھا لڑکا ہے۔ میں نے آج تک اُسے کسی سے فلرٹ کرتے نہیں دیکھا وہ ایک سلجھا ہوا انسان ہے۔ کتنی ہی لڑکیاں حسن پر مرتی ہیں تم خوش نصیب ہو کہ حسن تم سے پیار کرتا

ہے۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں تمہارے لیے چاہت کے دیپ جلتے دیکھے ہیں۔ وہ تمہارا قدر دان ہے' ہیرے کو جوہری ہی پہچانتا ہے۔ تم ہاں کردو' مجھے یقین ہے حسن ہر قدم پر تمہارا ساتھ دے گا' اوراعلیٰ تعلیم والے تمہارے خواب کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بنے گا۔'' وہ ذرا توقف کے بعد بولی تھی۔

''حسن آج بے چینی سے تمہارا منتظر تھا میں نے تمہارا نمبر بھی اُسے دے دیا ہے' وہ بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا میں نے بتادیا کہ تمہیں بخار ہے اس لیے تم نہیں آسکی ہو' زوبی مجھے یقین ہے کہ تم میری باتوں پر غور کروگی۔''

سیما کے جانے کے بعد میرے دل و دماغ میں جنگ جاری تھی اور جانے رات کے کس پہر میری آنکھ لگ گئی' صبح جب آنکھ کھلی تو سات بج رہے تھے' میں جلدی جلدی تیار ہوئی اور یونیورسٹی چلی گئی کلاس شروع ہونے والی تھی' پہلا پریڈ سرارشد کا ہوتا تھا اچانک میری نظر حسن پر پڑی تھی ایسا لگتا تھا جیسے پوری رات نہ سویا ہو' چہرے پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ کلاس کے بعد سیما اور میں لائبریری میں آکر بیٹھ گئے تھے اور میں اپنے مس لیکچر نوٹ کرنے لگی تھی کہ حسن کو اُس طرف آتا دیکھ کر سیما فوراً کھڑی ہوتے ہوئے بولی تھی۔

''زوبی وہ آرہا ہے میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔'' حسن میری کرسی کے قریب آکے بیٹھ گیا تھا۔

''زوبی! پھر تم نے کیا سوچا؟''

''حسن......!'' میں چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکی۔

''بولو......میں سن رہا ہوں زوبی!''

میں نے بہت سی ہمت جمع کرتے ہوئے کہا تھا۔

''حسن یہ ہمارا فائنل ایئر ہے' میں صرف اور صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دینا چاہتی ہوں' تم بہت اچھے ہو حسن مگر میں ابھی صرف اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتی ہوں اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتی ہوں' شادی کے چکر میں پڑھنا نہیں چاہتی' پلیز حسن! مجھے امید ہے تم مجھے ڈسٹرب نہیں کروگے۔''

''تم اطمینان رکھو' میں تمہیں بالکل ڈسٹرب نہیں کروں گا' مگر......تم اچھی طرح سے سوچ لو' ابھی بہت وقت ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کے چلا گیا تھا اور میں اُسے دور جاتے دیکھتی رہی تھی۔

امتحانات کی تاریخ آگئی تھی' ہم سب اُس کی تیاری میں مصروف تھے اور پھر اللہ کرکے امتحانات ختم ہوئے تھے تو کچھ سکون ملا تھا' وہ ہمارا یونیورسٹی میں آخری دن تھا سیما اور میں کینٹین میں بیٹھے تھے' حسن بھی وہیں مل گیا تھا' ہم سب نے مل کر چائے پی تھی اور یونیورسٹی کی باتیں کرتے رہے تھے جسے چھوڑنے کا ہم سب کو افسوس تھا۔

اب والدہ میری شادی کرنا چاہتی تھیں مگر میں شادی کرنے کو کسی صورت بھی تیار نہ تھی' سو نہ چاہتے ہوئے بھی والدہ نے چھوٹے بھائی کے لیے لڑکی دیکھنا شروع کردی تھی' یوں ایک دن سائرہ' بھائی کی دلہن بن کر ہمارے گھر آگئی تھیں۔

☆......☆......☆

وقت کا کام گزرنا ہے سو گزرتا رہا اور پھر ایک دن میرے پیارے ابو رات ایسے سوئے کہ کبھی نہ اٹھ سکے' میری زندگی میں ایسا بھی کبھی ہوگا' سوچا نہ تھا' والد صاحب کو نیند میں دل کا دورہ پڑا تھا' جو جان لیوا ثابت ہوا۔

گھر میں ایک کہرام مچ گیا تھا والدہ کو غشی کے دورے پڑ رہے تھے اس صدمے نے مجھے توڑ کے رکھ دیا تھا۔ زندگی جیسے رک سی گئی تھی لیکن مرنے والوں کے ساتھ مر نہیں سکتے' آخر زندگی کو چلنا ہے وہ چلتی رہی اور دھیرے دھیرے سب اپنے کاموں میں مشغول ہوگئے۔ ایسے وقت پر سیما نے میرا بہت ساتھ دیا' ورنہ شاید میں اس صدمے کو برداشت نہیں کرپاتی۔ والد صاحب سے والہانہ محبت اُن کا پیار اُن کی حوصلہ افزائی اُن کی شفقت کو میں کبھی نہیں بھول سکتی۔

کچھ عرصے بعد میرا رزلٹ آگیا تھا' میں نے فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی' کاش والد صاحب حیات ہوتے تو وہ میری کامیابی پر کتنا خوش ہوتے' اب مسئلہ یہ تھا کہ مجھے کچھ کرنا تھا۔ میں کسی پر بوجھ بننا نہیں چاہتی تھی۔ سو میں نے ایک پرائیویٹ کالج میں جاب کرلی تھی اور ساتھ ساتھ پبلک سروس کمیشن کی تیاری شروع کردی تھی۔ میں صبح صبح کالج جاتی اور تین بجے تک واپس آتی تھی۔

ایک دن میں کالج سے گھر آئی تو خاصی تھکی ہوئی تھی۔ ایسے میں اچانک فون کی گھنٹی بجی' میں نے فون ریسیو کیا' دوسری طرف حسن تھا اُس کی آواز سن کر میں ساری تھکن بھول گئی تھی۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے تھے' اُسی میں' میں نے اپنے اکیلے ہوجانے کی بات کی تھی۔

''نہیں زوبی! میں تمہارے ساتھ ہوں' تم کبھی اپنے آپ کو اکیلا نہیں سمجھنا۔'' جانے کیوں میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے تھے وہ مجھے تسلیاں دیتا رہا تھا۔

''پلیز تم اپنے آپ کو سنبھالو' تم تو بہت بہادر ہو میں تمہیں روتے نہیں دیکھ سکتا' پلیز زوبی!''

یونہی دن گزرتے رہے' اکثر حسن سے فون پر بات ہوجاتی تو دل کو تھوڑی تسلی مل جاتی۔ سیما کی فائنل ایئر کے بعد شادی ہوگئی اُس کے شوہر احمد بہت اچھے انسان تھے وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھے۔ سیما اپنی نئی زندگی میں بہت خوش تھی میری اُس سے اکثر فون پر بات ہوجاتی تھی۔

والد صاحب کے انتقال کے بعد رفتہ رفتہ بھابیوں نے اپنے رنگ دکھانے شروع کردیے تھے' وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو رائی کا پہاڑ بنادیتیں اور بھائیوں کے کان بھرتی تھیں' نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہم ماں بیٹی سے اکثر خفا رہتے تھے۔ میری چھوٹی بھابی نہ صرف بدلحاظ تھیں' بلکہ کافی بدزبان بھی تھیں۔ میں اُن کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی۔ اب انہوں نے یہ کہنا شروع کردیا تھا۔

''گھر چھوٹا پڑتا ہے' ہمیں بچوں کے لیے ایک اور کمرہ چاہیے۔''

ایک دن بھائی نے کہہ دیا۔

''زوبی تم اپنا سامان امی کے کمرے میں ڈال لو' اب بچے بڑے ہوگئے ہیں۔'' اور میں چاہتے ہوئے بھی یہ نہ کہہ سکی۔

''اِس گھر میں میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا آپ کا۔''

میں نے اپنا سامان امی کے کمرے میں رکھ لیا۔ اب ہم ماں بیٹی ایک کمرے میں محدود ہوکر رہ گئے تھے' کوئی ہمارا پرسان حال نہیں تھا۔ ایک دن حسن کا فون آیا تو وہ بہت اُداس تھا۔ وہ دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا۔

''زوبی! میں آج تک تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔''

''حسن میں مجبور ہوں والد کے انتقال کے بعد والدہ کی ذمے داری مجھ پر ہے۔''

"تم پھر سوچ لو زوبی! اتنی طویل زندگی کیسے گزارو گی' میں تمہاری راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گا' میں تمہارے بن ادھورا ہوں' میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔" اور میں کچھ نہ کہہ سکی تھی۔

حسابِ عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے
تمہیں نکال کر دیکھا تو سب خسارہ ہے

ایک دن میں اخبار پڑھ رہی تھی' اخبار میں پبلک سروس کمیشن کا اشتہار آیا تھا۔ میں نے اپلائی کر دیا' ٹیسٹ میں کامیابی ہوئی میں انٹرویو کی تیاری میں لگ گئی۔ اس معاملے میں قسمت نے میرا ساتھ دیا۔ انٹرویو میں کامیابی ہوئی۔ میں ایک بڑے ادارے میں آفیسر تعینات ہوگئی۔

میں بہت خوش تھی کہ مجھے میری منزل مل گئی تھی' مگر میری خوشی زیادہ دیر برقرار نہ رہی تھی' بڑے بھائی ملک سے باہر جانا چاہتے تھے' انہوں نے شور برپا کر دیا کہ کیوں نہ اس مکان کو بیچ دیا جائے تاکہ میں باہر جاسکوں' میں اور امی یہ نہیں چاہتے تھے کہ مکان بکے' مگر دونوں بھائیوں نے ہماری ایک نہ چلنے دی' انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ ہم ماں بیٹی کا کیا ہوگا' خودغرضی' اور لالچ نے انہیں اندھا کر دیا تھا۔ یوں ایک دن انہوں نے مکان بیچ دیا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ ہم ماں بیٹی کہاں رہیں' میں نے چھوٹے بھائی کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا' اپنے محلے میں ہی ایک دو کمروں کا مکان کرائے پر لے لیا اور اپنا سامان وہاں شفٹ کر دیا' والدہ کی دیکھ بھال اور گھر کے کام کاج کے لیے ایک ماسی رکھ لی تھی۔

☆......☆☆......☆

وقت کا کام گزرنا ہے سو وہ گزرتا رہا' اب میرے بالوں میں چاندی اترنا شروع ہوگئی' والدہ کو اب بھی میری فکر ستاتی۔

"اپنے لیے کچھ سوچو اور شادی کر لو۔" میں ہنس کر ٹال دیتی تھی۔

ہمارے محلے کے لوگوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا اِس کی وجہ یہ تھی کہ میرا بچپن میری جوانی اس محلے میں ہی گزرے' اتفاق سے ایک دن خبر ملی کہ احسان صاحب جنہوں نے ہمارا مکان خریدا تھا' وہ کسی مجبوری کے تحت مکان بیچ رہے ہیں۔

میں نے جب یہ خبر سنی تو فوراً احسان صاحب سے رابطہ کیا' میں چاہتی تھی کہ یہ مکان جو کبھی میرے والد کا تھا میں اسے خرید لوں۔ یہاں میرے بچپن کی یادیں تھیں۔ میرے ابو کی یادیں تھیں اُس آنگن میں ہم سب بہن بھائی مل کر کھیلے تھے۔

"یہ رشتے بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں؟"

چاہے ہم سے ناطہ توڑ لیں لیکن پھر بھی یادوں کی صورت آس پاس رہتے ہیں۔ خیر محلے کے چند معززین کو اعتماد میں لے کر میں نے وہ مکان خرید لیا تھا' جس دن میں نے وہ مکان خریدا تھا میری ماں کے آنسو تھمتے نہ تھے' میری ماں میری بلائیں لیتی نہ تھکتی تھیں۔

ہم دونوں اپنے مکان میں شفٹ ہوگئے تھے میں بہت خوش تھی کہ ہم اپنے گھر واپس آگئے تھے۔ میں نے گھر کو خوب ڈیکوریٹ کروایا' مگر میں اُن بچھڑے رشتوں کو واپس نہ لاسکی' بھائی جو ہم سے منہ موڑ چکے تھے۔ انہیں کبھی ہماری یاد نہیں آئی' بڑے بھائی پہلے خود باہر چلے گئے اور پھر اپنی فیملی کو بھی لے گئے تھے۔ چھوٹا بھائی اپنی بیوی کے آگے زبان نہیں کھول سکتا تھا والدہ کو اپنے بیٹوں کی بہت یاد آتی تھی ظاہر ہے وہ ماں تھیں یہ اُن کا فطری عمل تھا' اولاد کیسی بھی ہو لیکن کوئی ماں اپنی

اولاد کو نہیں بھول سکتی۔

ایک دن میرے پیون نے مجھے آفس میں انتہائی خوبصورت بکے لاکر دیا تھا۔

"میڈم یہ آپ کے لیے آیا ہے۔" ایک مسکراہٹ میرے چہرے پر بکھر گئی۔ کارڈ پر ایک چھوٹی سی تحریر لکھی تھی۔

"تمہیں تمہاری منزل مل گئی مبارکباد' حسن......!" یہ بکے حسن نے بھیجا تھا۔

"حسن......!" میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی' حسن تم کہاں ہو؟"

ایک دن سیما گھر آئی تو اُس نے بتایا۔

"حسن کینیڈا چلا گیا ہے ہمیشہ کے لیے......

اُس کی فیملی بھی وہیں شفٹ ہوگئی ہے' جاتے جاتے اُس نے کہا تھا۔ سیما تم زوبی کا بہت خیال رکھنا۔"

میری آنکھوں سے آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے' دل میں جیسے چھناکے سے کوئی چیز ٹوٹ گئی تھی۔ میری یہ کیفیت دیکھ کر سیما حیران ہوگئی تھی کہ محبت کو وقت کا ضیاع سمجھنے والی زوبی آج محبت کے کھو جانے کا ماتم کر رہی ہے۔

وقت نے اپنا سفر جاری رکھا تھا اور وہ غم سے بھرا دن بھی آیا تھا' جب میری زندگی میں والدہ کے دم سے جو روشنی تھی وہ بھی نہ رہی تھی لوگ آتے تعزیت کرتے اور چلے جاتے والدہ کے سوئم کے بعد گھر سُونا ہوگیا تھا۔ اب میں تھی اور میری تنہائی۔

میری ہمدرد میری دوست میری ماں مجھے چھوڑ کے جاچکی تھی۔ یہ تنہائی تو میرا مقدر بن گئی تھی میں خالی در و دیوار کو دیکھتی رہتی' مجھے سنبھلنے میں کئی مہینے لگ گئے تھے۔ میں ٹوٹ چکی تھی اگر سیما نہ ہوتی تو شاید دوبارہ اپنے پیروں پر نہ کھڑی ہو پاتی' سیما نے بہنوں کی طرح میرا خیال رکھا وہ اکثر گھر آجاتی تو دل بہل جاتا۔ پھر میں ہوتی اور میری تنہائی......

☆......☆☆......☆

آج میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں' میں کتنے برس پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔ آج سوچتی ہوں اگر میں شادی کر لیتی تو کتنا اچھا ہوتا میرا بھی گھر ہوتا کوئی غمگسار ہوتا' حسن کی یاد جب آتی ہے دل بھر آتا ہے۔ شاید یہ میرے اندر کا غرور اور تکبر تھا کہ میں نے کبھی شادی کی صورت ملنے والے سہارے مرد ذات کو اہمیت نہیں دی۔

"عورت چاہے کتنی مضبوط' کتنی پڑھی لکھی کیوں نہ ہو اُسے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے' ایک مرد کے مضبوط سہارے کی......"

مرد عورت کے بغیر اور عورت مرد کے بغیر کتنی ادھوری ہے۔

آج میں اکثر یہ بات سوچتی ہوں کہ میرے مرنے کے بعد میرے جنازے کو کاندھا دینے والا کوئی محرم مرد نہیں ہوگا بس یہی میرے محلے والے ہوں گے' جنہوں نے مجھے عزت دی' مجھے اپنی بہن سمجھا' آج میرے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے۔ میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔

یہ گھر جو میرے والدین کا ہے۔ میں نے ایک رفاعی ادارے کو دے دیا ہے میرے مرنے کے بعد یہ گھر اور میرا بینک بیلنس اس ادارے کو دے دیا جائے گا۔ اور اب دل میں صرف یہی حسرت ہے کہ مرنے سے پہلے ایک بار حسن کو دیکھ لوں' صرف ایک بار......!

☆☆......☆☆

شارٹ کٹ

عظمی جون کی فکر

ننگِ آدم راج سنگھاسن بیٹھے ہیں
قدموں میں انسان پڑا ہے دیکھو تو

تسنیم کوثر

کالے رنگ کی چم چم کرتی لمبی سی کار فراٹے بھرتی ہوئی میرے پاس سے گزر گئی تھی۔ میں نے بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹ کر خود کو اور بہادر کو بچالیا تھا...... کار کی رفتار خاصی تیز تھی۔ میں کار چلانے والی



کی جھلک ہی دیکھ سکی تھی مگر پھر بھی...... وہ میری پہچان کے دائرے میں آ گئی تھی۔ وہ عذرا تھی۔ یقیناً وہ عذرا تھی۔ خوبصورت سی عذرا...... جو میری کلاس فیلو تھی۔ ہم دونوں کا بچپن ساتھ گزرا تھا۔ ہم اکٹھے اسکول جاتے اکٹھے سپارہ پڑھنے جاتے...... ہم دونوں نے ایک ہی اسکول سے میٹرک کیا تھا۔

دس سالہ میٹرک دور میں اس کا اور میرا تقریباً روز کا ساتھ تھا پھر میں عذرا کو کیسے نہ پہچانتی؟ مگر وہ عذرا...... جسے میں جانتی تھی اس کا تعلق ایک بہت ہی غریب گھرانے سے تھا۔ عذرا کا باپ مزدوری کرتا تھا۔ ڈھیر سارے بہن بھائی تھے۔ روٹیوں کے لالے تھے۔ اگر یہ وہی عذرا تھی تو پھر یہ شاہانہ ٹھاٹھ باٹ...... میرے ذہن میں کھد بد ہونے لگی کیونکہ جس عذرا کو میں جانتی تھی اس کے گھر کے دروازے پر لٹکتا ہوا ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ اس گھر کے مکینوں کی غربت کے سارے راز فاش کر دیتا تھا۔ عذرا کو اپنی غریبی کا بہت دکھ تھا۔

وہ ہر وقت افسردہ سی رہتی...... نہ پڑھائی میں اس کا جی لگتا تھا اور نہ گھر میں' خوابوں کی دنیا میں کھوئے رہنا اُس کی عادت تھی۔ امارت اس کا شوق تھا۔ مگر غربت میں امارت کے صرف خواب ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی لیے وہ چڑچڑی سی ہو گئی تھی۔ اسی لیے وہ اسکول میں کوئی تقریب ہوتی یا کسی عزیز کی شادی' عذرا پر غم کے طوفان اُمڈ آتے۔ وہ پریشان ہو جاتی۔ ماں سے نئے کپڑوں کی فرمائش کرتی' گھنٹوں روتی رہتی' پہروں روٹھی رہتی۔ احساس کمتری میں گھری عذرا کئی کئی دن اسکول بھی نہ جاتی تھی۔ اسے نت نئے فیشن پسند تھے۔ اچھے کپڑے اور جوتے خریدنے کا شوق تھا' مگر اس کے یہ سب شوق پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ وسائل ہی نہیں تھے تو...... کہاں سے سارے شوق پورے ہوتے؟

حالات تو میرے گھر کے بھی زیادہ اچھے نہ تھے' مگر سفید پوشی کا بھرم رکھا گیا تھا۔ میں بہت قناعت پسند تھی۔ ہر حال میں خوش رہتی تھی۔ بچپن سے میری یہی عادت تھی جو مل گیا کھا لیا...... جو امی نے کپڑے بنا دیے وہ پہن لیے' سادگی میرا اشعار تھی اور میں عذرا کو بھی یہی سمجھاتی تھی مگر جب بھی اسے سمجھانا چاہا تو وہ مجھ سے اُلجھ پڑتی۔ جھنجلا کر کہتی۔

''زہرہ' زندگی ایک بار ہی ملتی ہے...... اگر وہ اتنی غریبی میں ہر شے کو ترستے ہوئے بیتے تو دکھ ہوتا ہے۔''

کہتی تو وہ ٹھیک ہی تھی۔ مگر نصیب میں جو لکھا ہو وہی ملتا ہے میں اسے سمجھاتی۔

''تم تو سب سے زیادہ امیر ہو...... تمہارے پاس حسن کی دولت ہے' تم ہم سب سے زیادہ خوبصورت ہو۔'' مگر وہ کچھ نہ سنتی نہ میری باتیں نہ اپنی ماں کی نصیحتیں۔

شب و روز اسی طرح بیت رہے تھے کہ ہم نے میٹرک کے پیپر دے کر اسکول کو خیر باد کہہ دیا اور یوں ہمارا روز کا ساتھ چھوٹ گیا۔ میں نے میٹرک کے بعد آگے پڑھنا چاہا تھا مگر اسی دوران بڑی ممانی اپنے بھتیجے کا رشتہ لے آئیں۔ امی تو نہال ہو گئی تھیں۔ ان کی بیٹی کے لیے خاندان سے رشتہ آ گیا تھا۔ میکے والے امی کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے ہاں اب بھی لڑکیاں بوجھ ہی سمجھی جاتی ہیں۔ ہم جیسے متوسط گھروں کی لڑکیوں کے رشتے مقدر سے ہی ہوتے ہیں۔ سفید پوش گھروں کی لڑکیاں خواب آنکھوں میں سجائے بالوں میں چاندی اترنے تک...... بس رشتوں کا انتظار ہی کیا کرتی ہیں۔ امی کی خوشی بے جا نہ تھی۔ میں بھی خوش تھی۔ اپنا گھر بسانے کا خیال ہی دل کو گدگدا دیتا ہے۔

احمد ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم تھے۔ تنخواہ بھی ٹھیک تھی اور ٹائم لگا کر اچھا خاصا کما لیتے تھے۔ امی نے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت بھی نہ دی۔ بس

جھٹ منگنی پٹ بیاہ کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئیں۔ میں مڈل کلاس سے نکل کر...... مڈل کلاس ہی میں آ گئی۔

احمد اچھے شوہر تھے...... محنتی تھے' ذمہ دار تھے۔ ان میں کوئی برائی نہ تھی۔ مگر اِن میں کوئی اچھائی بھی نہیں تھی۔ انہیں کوئی شوق نہیں تھا۔ ان کا کوئی حلقہ احباب نہیں تھا۔ ان کا کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ وہ تو بس ایک روبوٹ کی طرح صبح اٹھتے ناشتہ کر کے مجھے ترکاری لا دیتے...... رات گئے واپس آتے...... کھانا کھاتے اور سو رہتے' نہ انہیں گھومنے پھرنے کا شوق تھا...... نہ انہیں خوبصورت جذبوں کے اظہار کا سلیقہ آتا تھا۔ نہ برائی کرتے تھے نہ اچھائی کرتے تھے۔ شادی نے بھی احمد کی پختہ عادات کو نہ بدلا تھا۔ وہ ایک رٹو طوطے کی طرح وہی سبق پڑھ رہے تھے جو پڑھتے آئے تھے۔ وہ کولہو کے بیل کی طرح اسی ڈگر پر گامزن تھے جس پر چلتے آئے تھے۔ اپنے اِردگرد سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

گھریلو حالات و معاملات تو میرے گھر کے بھی آسودہ نہ تھے مگر ان میں رنگینی ضرور تھی۔ ایک دوسرے کی پسند ناپسند کا خیال رکھا جاتا تھا۔ امی کو سینما جانے کا شوق تھا اور ابا ناپسند کرتے ہوئے بھی امی کی خوشی کی خاطر ان کو ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ امی کو تحفے تحائف دیا کرتے تھے۔ امی نے بھی تو ابا کو اپنے سرتاج کو سچ مچ سر کا تاج بنا رکھا تھا۔ اُن کے پسندیدہ کھانے کا خیال' ان کے کپڑوں کا خیال...... میں نے امی کو ابا کا پرستار و وفا شعار پایا تھا۔ میری گھٹی میں بھی یہی سب کچھ تھا۔ اس لیے میری اور احمد کی خوب نبھی۔ میں نے کبھی یہ سوچنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ میری اپنی پسند کیا ہے؟ مجھے کہاں جانا ہے؟ مجھے کیا کرنا ہے؟ میں ایک وفا شعار بیوی کی طرح وہی کرتی جو احمد چاہتے تھے۔ جو ان کا جی چاہتا مجھے لا دیتے۔ وہ مجھے جہاں لے جاتے میں چوں چرا کیے بغیر ساتھ چل دیتی۔ میری اپنی کوئی پسند نہیں تھی۔ احمد کو محلے میں اِدھر اُدھر بلاوجہ بے مقصد آنا جانا پسند نہیں تھا۔ میں نے کبھی اُن کی غیر موجودگی میں بھی گھر سے باہر جھانکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جب کبھی اُن کے جی میں آتا مجھے امی سے ملوانے لے جاتے۔ کبھی امی کو اپنے ہاں لے آتے۔ میں نے احمد سے کبھی کوئی ضد' کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ یہ سب مجھے آتا ہی نہیں تھا میں نے امی کی اس نصیحت کو پلے باندھ رکھا تھا کہ فرمائش کرنے والی عورت کو مرد پسند نہیں کرتا...... واقعی...... امی نے ابا سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ میں بھی اسی ڈگر پر چل رہی تھی۔

☆......☆......☆

اِسی ڈگر پر چلتے چلتے کتنے ہی برس بیت گئے اب تو ہمارا بیٹا بھی دس برس کا ہو گیا تھا' ہماری زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی وہ پیار کرنے والے باپ تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک روایتی مرد تھے جنہیں بیوی کے چونچلے اٹھانا پسند تھا نہ بچے کے نخرے اٹھانا اچھا لگتا تھا۔ حالانکہ میں نے اپنے ہی خاندان کے بڑے بڑے سورماؤں کو بیوی بچوں کے سامنے گھٹنے ٹیکتے دیکھا تھا۔

احمد کو گھر کے کاموں میں گھسنا...... بچے کو گود میں اٹھائے اٹھائے پھرنا قطعاً پسند نہیں تھا۔ میں نے بھی ان سے یہ توقع کبھی نہیں کی تھی۔ یہ سب کام کرنے کے لیے میں جو تھی۔ ان کا کام کما کر لانا تھا۔ ہماری ضروریات پوری کرنا تھا اور وہ یہ کام کر رہے تھے۔ کمائی احمد کی تھی اور سلیقہ میرا...... اس آمیزش نے میرے گھر کو مثالی بنا دیا تھا۔ میرا گھر خوشیوں کا گہوارہ بن گیا تھا جس کی معطر ہوائیں مجھے کہیں نکلنے ہی نہ دیتی تھیں۔ محلے کی خواتین سے کہیں خوشی غمی میں ملاقات ہوتی تو وہ گلہ کرتیں۔

"بھئی بہادر کی امی کا کام تو ہم سب سے زیادہ ہے تبھی تو نظر نہیں آتیں۔" میں ہنس کر ٹال دیتی۔ میرے پاس سچ مچ وقت ہی نہیں تھا بلا مقصد اِدھر اُدھر پھرنے کا..... گھر کے کام فرصت ہی نہ دیتے تھے۔ جب سے احمد کو ہائی بلڈ پریشر کی شکایت ہوئی تھی۔ میں نے ان کے لیے پرہیزی کھانا بنانا شروع کر دیا تھا۔ صبح دفتر جاتے ہوئے انہیں کھانا پیک کر کے دیتی تھی۔ گھر کے ڈھیروں کام میری توجہ کے منتظر تھے' بہادر کا اسکول' ٹیوشن' یونیفارم یہ سب میری ذمہ داری تھی۔ امی جب بھی کہتیں بہادر کی چھٹیوں میں کچھ دن آ کر میرے پاس رہ جاؤ میں جھٹ کہتی۔

"نہیں امی میں تو گھر سے نکل ہی نہیں سکتی' احمد کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی' ویسے بھی ڈھیروں کام ہیں۔" تب امی بڑے فخریہ انداز میں احمد کو دیکھتیں جیسے کہہ رہی ہوں۔

"دیکھا میں نے بیٹی کی کیسی تربیت کی ہے؟"

بہادر کئی روز سے جیلانی پارک جانے کی ضد کر رہا تھا۔ اسکول والوں کے ٹرپ کے ساتھ وہ جب سے اُس پارک کی سیر کر آیا تھا اسے تو جیسے خبط ہو گیا تھا آبشار دیکھنے کا..... ہر روز اسکول سے آتے ہی وہ یہ ضد کرتا۔ میں احمد کی مصروفیت کو دیکھتے ہوئے اسے ٹالتی آ رہی تھی۔ میں جانتی تھی احمد صرف اتوار کو فارغ ہوتے ہیں اور میں یوں بھی انہیں کہنا نہیں چاہتی تھی کہ گھومنا پھرنا انہیں پسند نہیں تھا مگر مجھے یہ بھی خبر تھی کہ بچے تفریح چاہتے ہیں۔ ضد بھی کرتے ہیں اور ان کی جائز ضد پوری نہ ہو تو وہ..... احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایک رات احمد گھر لوٹے تو میں حسب معمول جاگ رہی تھی۔ میں نے انہیں کھانا گرم کر کے دیا۔ اور چائے بنانے چل دی۔ احمد کھانے کے فوراً بعد چائے ضرور پیتے تھے۔ چائے کا کپ انہیں تھماتے ہوئے میں نے کہا۔

"بہادر آپ کا انتظار کر کے ابھی سویا ہے۔"

"کیوں بھئی..... آج ایسی کیا بات تھی۔" وہ چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے بولے۔ میں چپ رہی شاید جملہ ترتیب دینے میں اُلجھ گئی تھی۔

"کوئی مسئلہ ہے کیا؟" مجھے چپ دیکھ کر احمد نے پوچھا۔

"نہیں..... بس وہ بہادر کئی دن سے ضد کر رہا ہے' جیلانی پارک جانے کی..... ایک دفعہ کیا ہو آیا' اُسے تو آبشار دیکھنے کی ضد ہی ہو گئی ہے۔" میں نے آہستہ سے مسئلہ احمد کے سامنے رکھ دیا۔

"ہاں تو ٹھیک ہے۔" وہ دھیرے سے مسکرا کر بولے۔

"اتوار کو تم کام ذرا جلدی نمٹا لینا ہو آئیں گے۔"

میں بے یقینی کی سی کیفیت میں انہیں دیکھنے لگی۔ میں خوش بھی تھی اور حیران بھی مجھے لگا..... غلطی سراسر میری تھی۔ جو بھی کچھ کہا نہیں..... کبھی کچھ مانگا نہیں شاید کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں خود تو کوئی شوق نہیں ہوتا..... مگر وہ دوسروں کی خواہش کو رد نہیں کرتے۔ احمد بھی ایسے ہی تھے اور یہ بات..... مجھے اتنے برسوں میں پتہ چلی تھی۔ احمد ٹکٹ خرید لائے تو ہم گیٹ کی طرف چل دیے۔ تبھی ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"زہرہ....." اپنا نام سن کر میں حیرانی سے پلٹی میری آنکھوں میں جھلملیاں ہونے لگیں۔ وہ عذرا ہی تھی۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ ہم کتنے برسوں بعد ملے تھے۔ میں نے احمد اور بہادر سے اس کا تعارف کرایا۔ سرسری سلام دعا کے بعد احمد بہادر کو لے کر آبشار دکھانے چلے گئے اور میں عذرا کے ساتھ درختوں کے جھنڈ میں گھرے سنگ مرمر کے بینچ پر جا بیٹھی۔ کتنی دیر ہم ماضی کی ورق گردانی میں گم رہیں۔ بہت سی باتیں کیں..... بچپن کے دن یاد کیے۔ اسکول کے قصے دہرائے اسی دوران عذرا مجھے ویسی ہی خوبصورت دکھائی

دی۔ تروتازہ' شاداب' شگفتہ شگفتہ.....

"تم بالکل نہیں بدلیں عذرا۔" میں کہے بغیر نہ رہ سکی۔

اُس نے ایک دل آویز مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

"بدلی تو تم بھی نہیں زہرہ..... ویسی ہی دقیانوسی ہو' جیسی تھیں وہی شرمیلا پن وہی چادر کی بکل' ہاں البتہ ممتا کا نکھار آیا ہوا ہے۔"

میں نے اس کی بات سُنی اَن سُنی کر کے پھر پوچھا۔

"اچھا بتاؤ نا شادی کہاں ہوئی تھی تمہاری؟"

وہ ایک زوردار ہنسی ہنس دی۔ مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہو اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"شادی اور میں؟ نہ بابا نہ..... میں ایسے جھنجٹ.....!"

حیرت سے میری آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔

"تو پھر یہ سج دھج..... یہ ٹھاٹ باٹ....." میرا اشارہ اس کے قیمتی زیورات اور کپڑوں کی طرف تھا۔

"یہ سب میں نے شادی کر کے نہیں پایا زہرہ....." وہ قدرے توقف سے بولی۔

"شادی کر لیتی تو تمہاری طرح میں بھی چادر کی بکل مارے بچے کی انگلی پکڑے دبکی ہوئی کسی دقیانوسی مرد کے پیچھے پیچھے چل رہی ہوتی۔ تم تو جانتی ہو میرے حالات کو..... کیسا رشتہ آتا وہاں میرے لیے زیادہ سے کسی مزدور کا..... کسی فیکٹری ورکر کا..... کتنا کما لیتا وہ؟ چار ہزار' پانچ ہزار یا پھر زیادہ سے زیادہ دس ہزار..... سب کچھ ویسا ہی رہتا زہرہ' جیسا پہلے تھا اور میں ایسی ترسی ہوئی زندگی جینا نہیں چاہتی تھی۔" اس کی آواز میں عجیب سا درد تھا۔

"تو پھر کیا تم نے ملازمت....." میں نے پوچھنا چاہا مگر وہ میری بات کاٹ کر کہنے لگی۔

"نہیں زہرہ میٹرک پاس کو کون ملازمت دیتا ہے..... بس یہ کہو میں نے جینے کا فن سیکھ لیا ہے۔ مجھے زندگی گزارنے کا سلیقہ آ گیا ہے۔"

"مگر کیسے؟" میں نے اُسے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم جانتی ہو زہرہ غربت زدہ زندگی مجھے کبھی پسند نہیں تھی۔ میں اپنی زندگی اپنے شوق پورے کر کے جینا چاہتی تھی۔ سو ایک شارٹ کٹ لیا میں نے۔" وہ عجیب پُراسرار لہجے میں بولی جس میں یاسیت تھی نہ شرمندگی۔

"یہ شارٹ کٹ میری زندگی کا چلن بدل گیا..... اور میں عذرا سے مس اجی بن گئی۔"

میں نے صدمے سے ساکت ہو کر اُس غلاظت میں لتھڑی ہوئی اجی کو دیکھا جس کی خواہشات نے میری اُس معصوم سی عذرا کو موت کی نیند سلا دیا تھا جو اپنی ضد پوری نہ ہونے پر پہروں رویا کرتی تھی۔

"عذرا! پلیز مجھے ابھی فوراً یہاں سے جانا ہے بہت شدید بو سی آ رہی ہے مجھے تمہارے پاس سے جو مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی۔" میں بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں کیا کرتی زہرہ! مجھ سے وہ سسکتی ہوئی زندگی نہیں گزاری جا رہی تھی۔" اُس نے لجاجت سے میرا ہاتھ تھامنا چاہا جسے میں نے جھٹک دیا۔

"تم نہیں جانتی اجی صاحبہ! وہ سسکتی ہوئی زندگی پھر بھی اِس گناہ آلود زندگی سے کتنی اچھی تھی۔ اُس کا ادراک تمہیں اُس وقت ہو گا جب بہت دیر ہو چکی ہو گی تمہارا تمہارا شارٹ کٹ راستہ تمہیں مبارک ہو۔" یہ کہہ کر میں اُس جانب چل دی تھی جہاں میرے شوہر اور اولاد کی صورت زندگی کا ایک خوبصورت لمبا سفر میرا منتظر تھا۔

☆☆.....☆☆

راولپنڈی سے پانچویں جیتی جاگتی کہانی

بس اچانک

نعیم ابرار کا ایقان

> بہت شاید تمہیں مانگا تھا میں نے
> مرے مایوس لمحوں کی دعا ہو

فرزانہ نگہت

اس شام جب میں کالج سے گھر پہنچی تو میں نے امی جان کے ساتھ ایک نہایت حسین وجمیل خاتون کو بیٹھے دیکھا۔ وہ واقعی اتنی حسین تھیں کہ انہیں دیکھ کر میں انہیں سلام کرنا ہی بھول گئی۔ اور



کچھ تحیرزدہ' کچھ مرعوب سی انہیں دیکھنے لگی۔
''بیٹی یہ بیگم فریحہ اسحاق ہیں' سامنے والی کوٹھی کی رہائشی...... اور فریحہ یہ میری بڑی بیٹی عدیلہ ہے۔ میں اس کے بارے میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں۔'' امی جان نے ہمیں ایک دوسرے سے متعارف کراتے ہوئے کہا۔
میں نے کچھ ہچکچاتے شرماتے انہیں سلام کیا۔ میری مرعوبیت اور تحیرزدگی اپنی جگہ قائم تھی۔
''آؤ بیٹی یہاں بیٹھ جاؤ۔'' انہوں نے نہایت محبت سے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے قریب پڑی خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
میں کتابیں تپائی پر رکھتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ مجھ سے میرے مضامین' پروفیسروں اور کالج کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ انہوں نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ ایم اے ایجوکیشن تھیں۔ انہوں نے کچھ عرصہ تک لاہور کے ایک کالج میں پروفیسری بھی کی تھی۔ ان کی باتیں بے حد سلجھی سنوری شائستگی اور وقار کی جھلک لیے ہوئے تھیں۔ انداز و اطوار بھی پروقار اور مہذب تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ ان کا تعلق کسی بے حد امیر کبیر اور ذی حیثیت خاندان سے تھا۔ ان کے رویے میں ایسی محبت و اپنائیت' خلوص اور بے تکلفی کا رنگ تھا کہ میری شرم و ہچکچاہٹ دور ہوتی گئی اور میں کھل کر ان سے باتیں کرنے لگی۔ اس دوران مجھے بھرپور نظروں سے انہیں دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ امی جان سے عمر میں کافی کم تھیں۔ شاید تیس پینتیس کے درمیان تھیں۔ کچھ فربہی مائل بھی تھیں۔ اس کے باوجود ان کا سراپا ان کی شخصیت انتہائی حسین و دلکش تھے۔ ان کے گھنے سیاہ بال بے حد دراز اور خوبصورت چمکیلے تھے اور بندھے ہوئے کمر سے بھی نیچے تک پہنچ رہے تھے۔
جب تک وہ باتیں کرتی رہیں میں ان کی حسین شخصیت کے سحر میں گم رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ باوجود دلخوشکن اور پرلطف باتوں کے ان کی شفاف سیاہ حسین آنکھوں میں کچھ حزن و ملال کی جھلک تھی۔ شاید یہ کوئی دکھ' کوئی غم تھا جو ان کے دل میں پنہاں تھا یا...... شاید یہ میرا وہم ہوسکتا تھا۔
ابا جان فوج کے محکمہ آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس میں آڈیٹر تھے۔ ان کی اس ملازمت کے سبب ہمیں کسی جگہ بہت کم ٹک کر رہنا نصیب ہوتا تھا۔ ایبٹ آباد سے پہلے ہم کیمبل پور میں تھے۔ جہاں ہمیں صرف ایک سال ہی رہنا نصیب ہوسکا تھا۔ ایبٹ آباد چھاؤنی میں ہمیں فوری طور پر کوئی بنگلہ نہ مل سکا تھا۔ اس لیے ہم مضافات شہری علاقے میں کرائے کی اس کوٹھی میں چلے آئے تھے۔ یہ خاصی وسیع اور عمدہ بنی ہوئی تھی۔ شہر کے اس مضافاتی علاقے میں جو بڑا ہرا بھرا سرسبز و شاداب تھا ایسی ہی کوٹھیاں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر بنی ہوئی تھیں۔ ان کے مکین اپنے ہی حالوں میں مست الست رہنے والے ایک دوسرے سے برائے نام میل جول رکھنے والے لوگ تھے۔ ہمیں وہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا پھر بھی ہماری کسی سے ایک بار بھی ملاقات نہ ہوئی۔ رسمی علیک سلیک البتہ ہوجاتی۔ لیکن کوئی کسی کے گھر نہ آتا جاتا تھا۔
ہماری کوٹھی کے سامنے سے گزرنے والی ویران پتلی سڑک کے پار ایک اچھی خاصی محل نما کوٹھی واقع تھی۔ جو قدیم طرز پر اور بے حد شاندار بنی ہوئی تھی۔ اس کی بلند و بالا چہار دیواری کے اندر لمبے لمبے چنار کے درخت لہرایا کرتے تھے۔ دیواروں پر پھولوں بھری بیلیں ہوا سے ہلکورے لیا

کرتی تھیں۔ اس کا شاندار اور پرشکوہ پھاٹک ہر وقت بند دکھائی دیتا تھا۔ کبھی کبھی اس میں سے ایک لمبی چوڑی چمچاتی کار باہر نکلتی یا اندر جاتی دکھائی دیتی۔ اس میں ڈرائیور کے ساتھ ایک شخص بیٹھا دکھائی دیتا۔ پختہ عمر کا سانولے رنگ گھنی مونچھوں اور قیمتی لباس میں ملبوس منہ میں پائپ لگائے بیٹھا دکھائی دینے والا یہ شخص شاید اس کوٹھی کا مالک تھا۔ کبھی کبھار اس کار میں ایک بے حد فیشن ایبل جامہ زیب خاتون تین بچوں کے ساتھ بیٹھی دکھائی دیتیں۔ شاید وہ اس شخص کی بیوی تھی۔ ان میاں بیوی اور ان کے بچوں کے سوا ہم نے اور کسی کو کوٹھی سے نکلتے نہ دیکھا تھا۔ اس لیے جب آنٹی فریحہ ہم سے ملنے آئیں تو مجھے بے حد حیرت ہوئی تھی۔ بعد میں امی جان نے بتایا کہ اس محل نما کوٹھی کے دو پورشن تھے۔ آنٹی فریحہ اس کے دوسرے پورشن میں رہتی تھیں جس کا دروازہ دوسری طرف کھلتا تھا۔
امی نے مجھے آنٹی فریحہ کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ یہ تھا کہ وہ ایک بیوہ خاتون تھیں۔ ان کے شوہر سیٹھ اسحاق چند سال ہوئے انتقال کرچکے تھے۔ وہ ان کی دوسری بیوی تھیں جن کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ سیٹھ اسحاق کی پہلی بیوی سے ایک بیٹا افضل تھا (وہی جس کو ہم کار میں آتے جاتے دیکھا کرتے تھے) وہ اس کوٹھی کے دوسرے پورشن میں رہتا تھا۔ اور سیٹھ صاحب کا کاروبار سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ تھا۔ سیٹھ اسحاق نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جائیداد دونوں بیویوں میں تقسیم کردی تھی۔ اس تقسیم سے یہ محل نما کوٹھی کچھ غیر منقولہ جائیداد' کافی دولت آنٹی فریحہ کے حصے میں آگئے تھے۔ باقی ساری جائیداد اور روپیہ پیسہ پہلی بیوی کو مل گئے تھے۔ سیٹھ اسحاق کی موت کے وقت دونوں بیویاں اسی محل نما کوٹھی میں رہ رہی تھیں۔ ان کی موت کے بعد اگر ان کی پہلی بیوی اور اس کا بیٹا افضل وہاں سے چلے جاتے تو فریحہ اتنی بڑی کوٹھی میں تنہا نہ رہ سکتی تھیں۔ اس لیے ان کی سوکن نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ اور اس کا بیٹا افضل ان کے پاس ہی رہیں۔ کوٹھی کو دو پورشنوں میں تقسیم کردیا جائے اور وہ اکٹھے رہتے ہوئے بھی الگ الگ رہیں۔ تاکہ اکٹھے رہنے کی صورت میں پیدا ہونے والی بدمزگیوں اور قباحتوں سے محفوظ رہیں۔ انہیں یہ تجویز معقول معلوم ہوئی۔ چنانچہ کوٹھی دو پورشنوں میں تقسیم کردی گئی۔ لیکن اس کے بعد ان کی سوکن عائشہ کو تھوڑے ہی عرصہ زندہ رہنا نصیب ہوسکا۔ ویسے بھی وہ ان کے مقابلے میں خاصی عمر رسیدہ تھیں۔ اُن کی موت کے بعد ان کا بیٹا افضل اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ اس پورشن میں رہ رہا تھا۔ وہ آنٹی فریحہ کا خوب خیال رکھتا تھا اور ان سے بے حد محبت کرتا تھا۔ بیوی بھی ان کی خوب خدمت گزار تھی۔ بچے بھی ہر دم ان کے پاس آئے رہتے تھے۔
''مجھے یہ بات کچھ مشکوک سی معلوم ہوتی ہے' افضل اور اس کی بیوی کی ایسی خدمت گزاریاں......'' امی جان نے ان کے حالات بتا چکنے کے بعد گہری سنجیدگی سے کہا۔
''آنٹی فریحہ کا کیا کوئی بہن بھائی نہیں' کوئی عزیز رشتہ دار وغیرہ؟'' میں نے پوچھا۔
''کوئی نہیں...... وہ اپنے والدین کی تنہا اولاد ہیں...... جو قریبی یا دور کے رشتہ دار ہیں وہ سب باہر کے ملکوں میں آباد ہیں۔ بے چاری تنہا عورت...... اللہ اس کا حافظ و نگہبان ہو۔'' میں نے عمیق نگاہی سے ان کی طرف دیکھا۔

''کوئی بات ہے امی جان؟''

''تم نے فرحیہ کے سوتیلے بیٹے کو دیکھا ہوگا؟ وہ اسی کی عمر کا دکھائی دیتا ہے' اور کچھ اچھا آدمی نہیں دکھائی دیتا۔ آگے میں کچھ نہیں کہوں گی اللہ بدگمانیوں سے بچائے۔ مجھے ان میاں بیوی کی نیتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔''

''لیکن امی جان آنٹی فرحیہ کے لیے ان کے جوڑ کے رشتوں کی کوئی کمی تھی جو ان کے ماں باپ نے انہیں سیٹھ اسحاق جیسے بوڑھے آدمی کے پلے باندھ دیا۔ جس کی پہلے ہی سے ایک بیوی اور شادی شدہ جوان بیٹا موجود تھا۔ انہیں دیکھتے ہوئے تو یہ ان پر انتہائی ظلم معلوم ہوتا ہے۔''

''ہاں...... لیکن ممکن ہے کہ ان کی کوئی مجبوری ہو یا کچھ اور...... یہ تو وہ خود ہی بتائیں گی تو معلوم ہوگا۔''

آنٹی فرحیہ سے اس ملاقات کے چند دن بعد میں اور امی جان ان سے ملنے ان کے گھر گئے۔ ان کا رہائشی پورشن خوب شاندار تھا۔ پھولوں بھرے پیڑوں پودوں بیلوں ہرے بھرے درختوں سے لدا وسیع وعریض چمن کسی بہشتی ارضی کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ اندرونی حصے کی آرائش و زیبائش بھی خوب تھی۔ شاندار اور پرشکوہ پورٹیکو میں آنٹی فرحیہ نے ہمارا پرجوش اور اپنائیت بھرا استقبال کیا اور ہمیں اندر شاہانہ طرز سے آراستہ نشست گاہ میں لے آئیں وہ ہماری آمد پر بے حد مسرور دکھائی دے رہی تھیں۔ صوفوں پر بیٹھتے ہی ہمارے درمیان پرلطف باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ ان باتوں کے دوران صاف ستھری خادمائیں قسم قسم اشیائے خورد ونوش کی ٹرالیاں لیے اندر داخل ہوگئیں۔ یہ واقعی شاہانہ خاطر مدارات تھی۔ کھانے پینے کے دوران باتیں بھی

چلتی رہیں۔ پھر کافی دیر بعد جب ہم جانے کو اٹھے تو شام گہری ہونے کو آرہی تھی۔

اس ملاقات کے بعد ہمارے درمیان دوستانہ روابط تیزی سے ترقی کرنے لگے اور آپس میں بے تکلفانہ فضا بھی قائم ہوگئی۔ اس دوران ہمیں آنٹی فرحیہ کے حالات جاننے کا موقع ملا۔ ان کی والدہ ان کے بچپن ہی میں انتقال کر چکی تھیں۔ ان کے والد سیٹھ داؤد کو اپنی بیوی سے بے حد محبت تھی۔ اس لیے باوجود جوان العمر اور مردانہ وجاہت سے مزین ہونے کے والدین اور عزیز واقارب کے اصرار کے باوجود انہوں نے دوسری شادی نہ کی تھی۔ اور اپنی تمام تر محبتوں اور شفقتوں کا مرکز اپنی اکلوتی بیٹی کو بنا کر تمام جوانی گزار دی تھی۔ وہ ایک کامیاب کاروباری تھے۔ لیکن دل کے پرانے مریض تھے۔ اسی مرض کی بدولت بڑھاپے میں ان سے کاروبار کی اچھی طرح دیکھ بھال ممکن نہ رہی۔ اور ان کا کاروبار مسلسل خسارے میں جانے لگا۔ جسے سنبھالا دینے کے لیے انہیں اِدھر اُدھر سے بھاری رقومات قرض لینی پڑتی رہیں۔ اس دوران فرحیہ ایم اے کر چکی تھیں اور ایک کالج میں پروفیسر لگ چکی تھیں۔ ان کی طرف سے سیٹھ داؤد کو تسلی تھی کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو چکی تھیں۔ لیکن خود اپنے قرضے اتارنے کی انہیں کوئی صورت نہ دکھائی دیتی تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب انہیں اپنا کاروبار ختم کر دینا چاہیے اور تمام قرض اتار کر گھر بیٹھ جانا چاہیے۔ لیکن قرضوں کی بھاری رقم کیسے اتاری جائے۔ یہ بات ان کے لیے مسلسل پریشانی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ اسی فکر و پریشانی میں ان کی نظر سیٹھ اسحاق پر پڑی۔ جن سے ان کی رسمی سی ہی علیک سلیک تھی۔ جو ان کے کاروباری حریف بھی

تھے۔ انہیں بالکل امید نہیں تھی کہ سیٹھ اسحاق ان کی کوئی مدد کر سکیں گے۔ پھر بھی انہوں نے کوشش کر لینا ضروری سمجھا۔ انہیں اس وقت بے حد حیرت ہوئی جب سیٹھ اسحاق نے نہ صرف ان کا اپنے دفتر میں بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا بلکہ انہیں قرضوں کی ادائیگی کے لیے بھاری رقم دینے پر بھی فوراً تیار ہوگئے لیکن اس کے لیے انہوں نے شرط یہ رکھی کہ وہ اپنی دختر یعنی فرحیہ کو ان سے بیاہ دیں ایسی صورت میں وہ انہیں قرض دی ہوئی رقم معاف کر دینے اور اس کا تحریری بیان لکھ کر دینے کو بھی تیار تھے۔ گلے گلے تک قرضوں کی دلدل میں دھنسے ہوئے سیٹھ داؤد کے لیے یہ بڑی بات تھی کہ انہیں قرض کی ایسی بڑی رقم معاف ہو جاتی۔ لیکن نازوں پلی حسین و جوان بیٹی کی شادی سیٹھ اسحاق جیسے کم صورت' بوڑھے شخص سے' جس کی بیوی بھی تھی اور فرحیہ ہی کی عمر کا جوان شادی شدہ بیٹا بھی تھا کرنا انہیں ایک کڑی کشمکش میں مبتلا کر گیا۔ انہوں نے سیٹھ اسحاق سے سوچنے' فیصلہ کرنے کے لیے چند دنوں کی مہلت لی اور گھر پہنچ کر تمام معاملات اپنی بیٹی کے سامنے رکھ دیے۔

فرحیہ اپنے باپ کی الجھنوں اور پریشانیوں سے بخوبی آگاہ تھیں۔ لیکن ان کے علاج سے قاصر تھیں۔ اب ان کی زبانی سیٹھ اسحاق والے سودے کا علم ہوتے ہی انہوں نے جوانی کی امنگوں' مستقبل کے حسین خوابوں' ارمانوں سب کی قربانی دینے کا فیصلہ کیا اور باپ کے سامنے سر جھکا دیا۔ یوں وہ سیٹھ اسحاق کی دوسری بیوی بن کر ان کے گھر چلی آئیں۔ شادی کے بعد سیٹھ اسحاق نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ انہوں نے سیٹھ داؤد کو قرضوں کی ادائیگی کے لیے نہ صرف بھاری رقم

دی بلکہ اسے معاف کرنے کی رسید بھی لکھ دی۔ یہ ان کا سیٹھ داؤد پر بہت بڑا احسان تھا۔ اس احسان کی قدر فرحیہ نے خوب کی۔ وہ سیٹھ اسحاق کے لیے ایک نہایت وفا شعار اطاعت گزار رفیقہ حیات ثابت ہوئیں۔ انہوں نے ان کے آرام' صحت' تندرستی کا ہر ممکن خیال رکھا اور ان کی بے حد خدمت کی' سیٹھ اسحاق بھی ان کے لیے بڑے قدردان شوہر ثابت ہوئے۔ انہوں نے دنیا کی ہر نعمت ان کے قدموں میں ڈھیر کر دی۔ انہیں باہر کے ملکوں کی سیر کرائی۔ ان کی خوب ناز برداریاں کیں اور اپنی زندگی میں اپنی جائیداد دونوں بیویوں کے درمیان مساویانہ تقسیم کر دی۔ اس طرح گویا انہوں نے فرحیہ کو مالی تحفظ دے دیا جن سے ان کی کوئی اولاد نہ ہو سکی تھی۔

ہم نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ آنٹی فرحیہ اپنی سوکن عائشہ کا کبھی ذکر نہ کرتی تھیں۔ اگر کرتی تھیں تو سرسری سے انداز میں مگر اچھے الفاظ میں۔

''میرے خیال میں شاید وہ روایتی سوکن ہوں گی۔ ہم نے ان کی تصویر نہیں دیکھی تھی لیکن میرے خیال میں وہ ویسی ہی ہوں گی اپنے بیٹے افضل جیسی سانولی رنگت اور معمولی نقوش و نگار والی' جو فرحیہ سے ان کے حسن و جمال کے سبب سوکناپے کا حسد و رقابت ضرور رکھتی ہوں گی۔''

ایک دن جب ہم آنٹی فرحیہ سے مل کر آئے تو امی جان نے رائے زنی کی۔

''اور یہ افضل کی بیوی زہرہ بھی آج تک ہم سے ملنے نہیں آئی۔''

''مجھے تو وہ بہت مغرور عورت معلوم ہوتی ہے۔ بیگم یزدانی بتا رہی تھیں کہ وہ ایک مرتبہ اس سے ملنے گئی تھیں۔ وہ ان سے ایسی رکھائی اور سرد مہری

سے پیش آئی کہ انہوں نے پھر کبھی اس کے گھر کا رخ نہیں کیا۔ اس علاقے کی دوسری عورتیں بھی اس سے ملتی جلتی نہیں نہ وہ خود کسی کے گھر جاتی ہے۔''

''یہ عجیب ہی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن فرحیہ تو ایسی نہیں وہ سب سے میل جول رکھتی ہے۔ مجھے تو یہ معاملہ کچھ مشکوک سا معلوم ہوتا ہے۔ خیر...... دوسروں کے معاملات کے تجسس اور کھوج کرید سے بھلا کیا حاصل؟ ہماری تو دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرحیہ کو اپنی امن میں رکھے۔''

وقت گزرتا گیا۔

آنٹی فرحیہ اور ہماری دوستی اور محبت بھی پھولتی پھلتی رہی۔ اتنے عرصے میں افضل کی بیوی ایک مرتبہ بھی ہم سے ملنے نہ آئی تھی۔ شاید وہ ہم سے کوئی واسطہ نہ رکھنا چاہتی تھی۔ اس کے رویے کو دیکھتے ہوئے ہم نے بھی اس سے ملنے کی کوئی کوشش نہ کی۔

پھر آنٹی فرحیہ ہمیں کچھ اُلجھی اُلجھی اور پریشان سی دکھائی دینے لگیں۔ ایک شام جب وہ ہم سے ملنے آئیں تو باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ افضل کا ارادہ اپنی تمام جائیداد بیچ باچ کر امریکہ جا کر آباد ہو جانے کا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ بھی اپنی تمام جائیداد فروخت کر دیں اور اس کے ساتھ امریکہ چل کر رہیں۔ کیونکہ ظاہر تھا ان لوگوں کے جانے کے بعد وہ اتنے بڑے گھر میں تنہا نہ رہ سکتی تھیں نہ اپنی جائیداد کی دیکھ ریکھ کر سکتی تھیں۔ اب ہمیں معلوم ہوا کہ وہ اتنے عرصے سے یوں اُلجھی اُلجھی اور پریشان کیوں دکھائی دے رہی تھیں۔

''خود آپ کا دل کیا امریکہ جانے کو کرتا ہے؟ وہاں آپ کے بہت سارے رشتہ دار بھی ہیں وہ وہاں آپ کا خیال رکھ سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''یہ کوئی مسئلہ نہیں...... لیکن ایسا مضبوط و مستحکم روز افزوں ترقی کرتا ہوا کاروبار لمبی چوڑی جائیداد چھوڑ کر کوئی یوں دیارِ غیر میں نہیں جا بسا کرتا۔ میں نے افضل کو سمجھانے کی بے حد کوشش کی تھی لیکن اس پر بری طرح سے امریکہ جا بسنے کا بھوت سوار ہے۔'' آنٹی فرحیہ بے بسی سے بولیں۔ امی جان بڑی سنجیدگی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

''اس نے ابھی کچھ کیا ہے؟ یعنی اپنی جائیداد کی فروخت کی کوشش؟ امریکہ میں قیام کا انتظام؟''

''اس نے کہا ہے کہ چند بڑی کمپنیاں اس کا کاروبار خریدنا چاہتی ہیں۔ وہ اس وقت ان کے ساتھ مصروف ہے اس کے بعد وہ امریکہ میں اپنے کاروبار کے امکانات کا جائزہ لینے وہاں رہن سہن کا انتظام کرنے جائے گا۔ پھر آ کر سب کچھ فروخت کر دے گا۔ میری جائیداد یں بھی......''

''فرحیہ......'' امی جان نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''تم اس کے چکر میں نہ آؤ۔ مجھے اس کی نیت نیک نہیں معلوم ہوتی۔ جانے وہ تمہاری جائیدادیں بیچ کر ان کی قیمت تمہیں دے گا یا نہیں؟ مجھے تو اس کا یقین بھی نہیں کہ یہ میاں بیوی تمہیں اپنے ساتھ امریکہ لے جائیں گے اور وہاں اپنے ساتھ رکھیں گے۔ آج کل تو حقیقی رشتوں تک کا خون سفید ہو چکا ہے۔ لوگ اپنے ماں باپ سگے بہن بھائیوں تک کو ساتھ نہیں رکھتے۔ پھر یہ تمہارا سوتیلا بیٹا ہے۔''

''افضل تو ایسا نہیں ہو سکتا آپا...... وہ تو

شروع ہی سے مجھ سے حقیقی بیٹے سے بڑھ کر محبت کرتا چلا آ رہا ہے۔ وہ میرا بے حد خدمت گزار اور فرمانبردار ہے۔ وہ مجھ سے ایسی بدی برائی بھلا کیوں کرے گا؟ میں تو ہرگز اپنے دل میں اس کے لیے کسی بدگمانی کو جگہ نہیں دے سکتی۔ میں نے محسوس کیا آنٹی فرحیہ کا لہجہ باوجود ٹھوس ہونے کے کچھ کمزور کچھ لرزاں سا تھا۔ شاید دل ہی دل میں وہ بھی کچھ محسوس کر رہی تھیں۔ امی جان گہری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

''تم اس حد تک اس پر اعتبار کرتی ہو تو خیر...... لیکن اپنی جائیداد کی فروخت کا اختیار اسے ہرگز نہ دینا۔'' آنٹی فرحیہ کے چہرے پر کچھ اُلجھن فکر و تذبذب کے تاثرات نمودار ہو گئے تھے۔

امی جان پھر بولیں۔

''اس کی اتنی تم سے محبت اور اتنی فرمانبرداریاں اور خدمت گزاریاں کسی کو بھی شک و شبہ میں مبتلا کر سکتی ہیں فرحیہ' حیرت ہے تم نے اس کی وجہ' غرض و مطلب جاننے کی اب تک کوئی کوشش کیوں نہیں کی؟ خدارا فرحیہ...... یوں آنکھیں بند کر کے اس پر اعتبار اور بھروسہ نہ کرتی چلی جاؤ۔ اپنی جائیداد کے معاملے میں تو محتاط ہی رہو۔'' آنٹی فرحیہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کی پیشانی پر شکن اور چہرے پر گہری سنجیدگی اور تفکرات کی پرچھائیں لرزاں تھیں۔

چند دن گزرے تھے۔ پھر ایک دن بس اچانک ہی انکل خاور ہمارے گھر آن پہنچے۔ ہمیں ان کی یوں غیر متوقع بلا اطلاع اور اچانک آمد پر بے پناہ حیرت کے ساتھ بے پناہ خوشی بھی ہوئی۔ وہ امی جان کے خالہ زاد بھائی تھے' لیکن ہم ان سے حقیقی ماموں کی طرح محبت کرتے تھے' کیونکہ امی جان کا کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔ اِدھر وہ بھی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ اس لیے ان میں اور امی جان میں بالکل حقیقی بہن بھائیوں جیسا پیار تھا۔ انہوں نے اب تک شادی نہ کی تھی حالانکہ ان کی شخصیت بڑی وجیہہ اور شاندار تھی۔ مردانہ حسن و وجاہت سے بھرپور تھی۔ ان کے لیے رشتوں کی کمی نہ تھی لیکن جانے کیوں انہوں نے کسی سے بھی شادی کرنا پسند نہ کیا تھا۔ ان کے ماں باپ ان کی شادی کا ارمان دلوں میں بسائے قبر میں جا سوئے تھے۔ مگر اس کے بعد بھی انہوں نے شادی نہ کی تھی اور ہمیشہ کے لیے امریکہ جا بسے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے خاندان والوں سے رشتہ ناطہ ختم نہ کیا تھا۔ ہم سب سے ان کی خط و کتابت بھی ہوئی رہتی تھی اور فون پر بھی رابطہ رہتا تھا۔ سال دو سال بعد وہ سب سے ملنے بھی آ جاتے تھے۔ ان کا قیام ہمارے گھر یعنی اپنی بہن کے گھر ہوتا تھا۔ وہ ہم تینوں بہن بھائیوں سے بے حد پیار کرتے تھے۔ وہ ہمیں خوب تحفے تحائف دیتے۔ ہمارے لیے نئے نئے چیزیں لاتے خوب سیر و تفریح کراتے۔ امی جان پر تو وہ فدا تھے جو ان کی اکلوتی بہن تھیں۔ ابا جان سے بھی وہ بے حد محبت کرتے اور ان کا احترام کرتے۔ اس لیے جب کبھی وہ آتے تو ہمیں بے پناہ خوشی ہوتی۔ اس مرتبہ ان کی اس غیر متوقع آمد پر بھی ہم خوب سرور و شاداں ہوئے۔ لیکن ہم نے ان سے شکایت بھی کی کہ وہ اگر ہمیں اپنے آنے کی اطلاع کر دیتے تو ہم انہیں لینے ایئرپورٹ پہنچ جاتے۔

''بس بھئی...... میں نے سوچا اس مرتبہ اچانک پہنچ کر آپ سب کو حیران کر دوں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ ویسے بھی وجیہہ و حسین تھے۔ بس ان کی کنپٹیوں پر کچھ سفید بال نمودار ہو چکے تھے۔ سر

کے سیاہ گھنے بالوں میں کہیں کہیں چاندنی کے تار جھلملا رہے تھے۔ مجھے کچھ دکھ سا محسوس ہوا۔ کتنی ہی عمر انہوں نے تنہا گزار دی تھی۔ ان کی بھی کیا زندگی تھی۔ کچھ دن آرام کرنے اور طویل سفر کی تھکن اتارنے کے بعد رشتہ داروں سے ملنے ملانے اور سیر و تفریح کے پروگرام بننے لگے۔ ان میں مگن ہوکر ہمیں آنٹی فرحیہ کا خیال ہی نہ رہا جو اتنے عرصے سے ایک بار بھی ملنے نہ آئی تھیں۔

اس شام ہم لاؤنج میں بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے۔ انکل خاور ہمیں امریکہ کی پُرلطف باتیں سنا رہے تھے جب دروازے کا پردہ ہٹا کر آنٹی فرحیہ اندر داخل ہوگئیں۔

''آؤ فرحیہ تم تو بڑے عرصے بعد آئیں۔'' امی انہیں دیکھتے ہی خوش ہوتے ہوئے بولیں۔

آنٹی فرحیہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوگئیں انہوں نے ہم سب پر نظر ڈالی پھر انکل خاور پر نظر پڑتے ہی وہ اپنی جگہ پر گویا مجسم ہوکر رہ گئیں۔

''خاور......'' ان کے منہ سے ٹوٹتے بکھرتے نکلا۔ وہ انہیں یوں دیکھنے لگیں گویا خواب سا دیکھ رہی ہوں۔

انکل خاور آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ ان کا چہرہ بے پناہ سفید پڑا ہوا تھا۔ لب لرز رہے تھے۔ پھر ان کے منہ سے سرگوشی نکلی۔

''فرحی......'' وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آنٹی فرحیہ کے قریب آ کر کھڑے ہوگئے۔

''فرحی...... یہ تم ہو نا؟''

ہم سب انتہائی تحیر زدہ سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی ہم سب کچھ جان چکے تھے۔ ماضی کا انتہائی حسین سربستہ راز ہم پر کھل رہا تھا۔ ایک انتہائی حسین و دلگداز داستانِ محبت کے درد و غم سے لبریز صفحات ایک ایک کرکے ہماری نظروں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

خاور اور فرحیہ یونیورسٹی کے زمانے میں ایک دوسرے کے کلاس فیلو تھے۔ طبقاتی فرق کے باوجود کہ فرحیہ ایک بڑے باپ کی بیٹی تھیں اور خاور ایک معمولی اسکول ماسٹر کے بیٹے تھے ان کے درمیان محبت کے تعلقات پیدا ہوگئے تھے۔ جو روز برز ترقی کرتے گئے۔ خاور اپنے آپ کو فرحیہ کا اہل بنانے کے لیے بے حد محنت کرتے رہے انہوں نے پہلے ایم اے میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی پھر سی ایس ایس میں تمام امیدواروں میں اول رہے اور ایک اہم سفارتی عہدے پر فائز ہوگئے۔ لیکن فرحیہ سے شادی کے لیے انہیں ابھی بہت کچھ بنانا بہت کچھ کمانا تھا۔ اس لیے انہوں نے فرحیہ سے چند سال انتظار کرنے کو کہا۔ وہ مان گئیں اور اتنا عرصہ کاٹنے کے لیے انہوں نے ایک گرلز کالج میں ملازمت کرلی۔ لیکن ہوا یہ کہ ان کے والد سیٹھ داؤد کو اپنی مسلسل بیماری کے سبب کاروبار میں گھاٹے پر گھاٹا ہونے لگا اور وہ مقروض ہوتے چلے گئے۔ ان کا قرضوں کا بوجھ اتنا بڑھ گیا کہ ان میں انہیں اتارنے کی نہ ہمت رہی نہ سکت...... مجبوراً انہیں اپنے کاروباری حریف سیٹھ اسحاق سے قرض کی بھیک مانگنی پڑی۔ اور قرضوں کی بھاری رقم معاف کروانے کے لیے اپنی اکلوتی نازوں پلی بیٹی کی شادی ان سے کرنی پڑی۔ فرحیہ کو اپنے بوڑھے اور بیمار باپ کی مجبوری کا احساس تھا۔ وہ ہرگز انہیں دکھ دینا اور نافرمانی کرنا نہ چاہتی تھیں۔ اس لیے وہ سیٹھ اسحاق کی بیوی بن گئیں۔ انتہائی مجبوری اور لاچاری کی اس شادی کا خاور کو اتنا رنج و ملال ہوا کہ انہوں نے شادی نہ کرنے کی گویا قسم کھالی۔

ان کے ماں باپ ان کی شادی کا ارمان دلوں میں لیے قبروں میں جا سوئے۔ وہ خود ملازمت کے سلسلے میں وطن سے دور ہی دور رہے۔ پھر بالآخر امریکہ جا بسے۔ جہاں انہوں نے مختلف منصوبوں میں سرمایہ کاری کی اور اپنے آپ کو دن رات کی محنت میں گم کرلیا۔ یونہی سال پر سال گزرتے گئے۔ ان کے کاروباری ترقی کرتے گئے۔ ان کی دولت میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ اپنے عزیزوں رشتہ داروں سے ملنے وطن بھی آتے رہے۔ وہ سب سے ملتے رہے لیکن فرحیہ سے ملنے کی انہوں نے کبھی کوئی کوشش نہ کی نہ ان کے بارے میں کوئی کھوج کرید کی۔ جوان کی زندگی کا ایک انتہائی المناک باب بن چکی تھیں۔ اور اب...... اتنے طویل عرصے بعد اُن کی کیسے اچانک انتہائی غیر متوقع طور پر یوں ملاقات ہوگئی تھی۔

''اب فطری بات ہے کہ آپ کے دل میں شادی کی خواہش پیدا ہو۔ لیکن افضل کا معاملہ بیچ میں ہے۔'' جب سب باتیں ہوچکی تو امی نے کہا۔

''یہ معاملہ مجھے اتنا سنگین اور پیچیدہ نہیں دیکھائی دیتا۔'' انکل خاور پُرسوچ لہجے میں بولے۔

''میرا خیال ہے ہمیں افضل سے خود بات کرلینی چاہیے۔ اس طرح ہمیں معلوم ہوجائے گا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ فرحیہ کی اس سے ایسی محبت عزت و احترام خدمت گزاریاں اور پھر امریکہ جا کر آباد ہونے کا ارادہ...... اس سب کا مقصد معلوم ہوجائے گا۔''

''ہاں یہ مناسب رہے گا ہمیں افضل سے ضرور مل لینا چاہیے۔'' ابا جان بولے۔ چنانچہ اگلے دن انکل خاور، امی جان اور ابا جان افضل سے ملنے چلے گئے۔ اسے پہلے آنے کی اطلاع دے دی گئی تھی اس لیے وہ اور اس کی بیوی گھر پر ہی تھے۔ اپنے شاندار پورشن کے شاندار لاؤنج میں انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا۔ پھر جب تعارفی مرحلہ طے ہوگیا تو طے شدہ پروگرام کے تحت آنٹی فرحیہ بھی وہاں آن پہنچیں۔ افضل اور اس کی بیوی کو اس پر بڑی حیرت ہوئی۔ لیکن پھر جب انکل خاور نے انہیں ماضی میں ان سے اپنے تعلق اور اب ارادۂ شادی کے بارے میں بتایا تو ان کی یہ حیرت شدید پریشانی غصے اور گھبراہٹ میں بدل گئی۔

''ہم تو چھوٹی امی سے بہت...... بہت...... بے پناہ محبت رکھتے ہیں۔ دل و جان سے ان کی خدمت کرتے چلے آرہے ہیں۔ انہیں آج تک ہماری طرف سے معمولی سی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ پھر انہیں شادی کی کیا سوجھی؟'' افضل کی بیوی تیز لہجے میں بولی۔

''اپنی زندگی کے فیصلے کرنے کا سب کو حق حاصل ہے محترمہ۔'' انکل خاور متحمل لہجے میں بولے۔

''فرحیہ نے آپ لوگوں کے ساتھ جتنی زندگی گزارنی تھی گزار لی...... آپ کی محبتوں اور خدمت گزاریوں کی وہ عمر بھر معترف رہیں گی۔ لیکن ابھی ان کے ساتھ طویل عمر پڑی ہے۔ جو یہ تنہا نہیں گزار سکتیں۔ اس لیے انہوں نے جو شادی کا فیصلہ کیا ہے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے کیا ہے۔''

''یہ عمر بھر ہمارے ساتھ آرام و سکون سے رہ سکتی ہیں۔'' افضل بولا اس کے لہجے میں دبے دبے سے غصے کے باوجود کمزوری کی جھلک تھی۔

''بے شک...... لیکن اب اگر انہوں نے

خاور بھائی سے شادی کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو آپ انہیں مجبور نہیں کر سکتے۔'' امی جان بولیں۔

''میں یہاں زیادہ عرصہ نہیں ٹھہر سکتا اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جلد شادی ہو جائے اور فرحیہ کی تمام جائیداد بھی فروخت ہو جائے۔ اس لیے آپ جس قدر جلد ممکن ہو سکے یہ کوٹھی خالی کر دیجیے۔ یہ ساری کوٹھی فرحیہ کی ملکیت ہے۔ وہ اسے فروخت کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔'' انکل خاور بولے۔

افضل کی بیوی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر بند کر لیا وہ اب تک آنٹی فرحیہ کو بڑی کینہ توز نظروں سے گھورتی چلی آ رہی تھی۔ افضل کا چہرہ تاریک سا پڑا ہوا تھا۔ وہ یوں خاموش تھا جیسے اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ رہا ہو۔ پھر بالآخر اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... ہم چند دنوں تک یہ کوٹھی خالی کر دیں گے۔''

ان کی طرف سے پیش کی گئی چائے خاموشی اور کچھ بدمزگی کے عالم میں پی گئی۔ پھر جب ابا جان امی جان اور انکل خاور وہاں سے جانے کے لیے اٹھے تو آنٹی بھی ان کے ساتھ ہو لیں۔

''حیرت کی بات ہے جو یہ کام اتنی آسانی سے ہو گیا۔'' گھر پہنچ کر جب سب لاؤنج میں آ کر بیٹھے تو امی جان متعجب لہجے میں بولیں۔

''حیرت مجھے بھی ہے...... لیکن اس سے زیادہ حیرت مجھے اس بات کی ہے کہ افضل نے ایک بار بھی جائیداد بیچ باچ کر امریکہ جا بسنے کا ذکر نہیں کیا۔'' آنٹی فرحیہ بولیں۔

''اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہو گا۔ بلکہ اس بہانے وہ تمہاری جائیداد پر قبضہ جمانے کا ارادہ کیے ہوئے ہو گا...... اس کے بعد اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہو گی کہ تمہارا کیا بنے گا۔'' امی جان بولیں۔

''ہاں اس کی تم سے محبت اور خدمت گزاریاں اسی مقصد کے لیے ہوں گی کہ تم اُس پر اندھا اعتماد کرنے لگو اور اپنی جائیداد کا اختیار اسے دے دو۔'' انکل خاور بولے۔

بعد میں یہ باتیں سچی اور صحیح ثابت ہوئیں۔ اس گھر کے ایک بوڑھے ملازم بابا دین محمد عرف بابا دینا نے جو سیٹھ اسحاق کا سچا نمک خوار اور آنٹی فرحیہ سے دلی ہمدردی رکھتا تھا۔ خود ایک دن آ کر ہمارے گھر ان باتوں کی حرف بہ حرف تصدیق کی۔ اس کے بیان کے مطابق افضل کو سیٹھ اسحاق کی فرحیہ سے شادی پر بے حد غم و غصہ تھا۔ اس شادی سے نہ صرف ایک بھاری رقم سیٹھ داؤد کے حوالے ہوئی تھی بلکہ لمبی چوڑی جائیداد کا بٹوارا بھی ہو گیا تھا۔ پھر سیٹھ اسحاق شادی کے بعد ان کی ماں کو بالکل بھول گئے تھے اور خود اسے بھی نظر انداز کرنے لگے تھے۔ ان کی موت کے بعد اس نے اپنی ماں کے ساتھ مل کر فرحیہ سے بدلہ لینے اور تقسیم شدہ جائیداد واپس لینے کے لیے یہ سازش تیار کی تھی کہ ہر طرح سے اس کی فرمانبرداری اور خدمت گزاری شروع کر دی تھی۔ ماں نے بھی اس کے ساتھ بڑی بہن جیسا پُرشفقت و پُرمحبت سلوک کرنا شروع کر دیا تھا۔ جس پر فرحیہ ان کے عزائم و مقاصد سے بے خبر انہیں اپنے ہمدرد و خیر خواہ سمجھنے لگی تھیں۔ اور ایسا محسوس کرنے لگی تھیں جیسے ان کے ساتھ شادی کر کے سیٹھ اسحاق نے ان ماں بیٹا پر بے حد ظلم کیا تھا۔ جائیداد کا بٹوارا تو مزید ظلم ثابت ہوا تھا۔ وہ اس کے ازالے کے بارے میں سوچنے لگی تھیں۔ اس کی انہیں ایک ہی صورت دکھائی دیتی تھی کہ وہ اپنی محل نما کوٹھی اور تمام جائیداد افضل کے نام کر دیں۔ اس کے بعد وہ عمر بھر آرام و آسائش سے افضل اور اس کی بیوی بچوں کے ساتھ رہ سکتی تھیں جو ان سے بے پناہ محبت رکھتے اور ان کا ہر ممکن خیال رکھتے چلے آ رہے تھے۔ اپنی ماں کی وفات کے بعد افضل نے ویسے بھی انہیں اپنی حقیقی ماں کا درجہ دے رکھا تھا۔ اس کی ان سے محبت اور خدمت گزاریوں میں اب اور بھی اضافہ ہو چکا تھا۔

بابا دینا شروع ہی سے سیٹھ اسحاق کا وفادار ملازم چلا آ رہا تھا سیٹھ صاحب اس پر ہر طرح سے اعتماد کرتے تھے اور اکثر راز کی باتیں بھی اس سے کہہ دیا کرتے تھے۔ انہیں شاید یقین نہ تھا کہ ان کی پہلی بیوی اور بیٹا فرحیہ کے ساتھ بنا کر رکھیں گے۔ اس لیے انہوں نے اپنے وقتِ آخر بابا دینا کو فرحیہ کا خیال رکھنے اور اپنی پہلی بیوی اور بیٹے پر نظر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ بابا دینا اس وقت سے لے کر اب تک تمام حالات پر گہری نظر رکھ رہا تھا اور عائشہ بیگم افضل اور اس کی بیوی کے فرحیہ کے ساتھ رویے کو مشکوک نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔ وہ بھانپ گیا تھا کہ ان لوگوں کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ ایک دن جب اسے چھپ کر افضل اور اس کی بیوی کی باتیں سننے کا موقع ملا تو اس کے شکوک و شبہات کی تصدیق ہو گئی۔ وہ لوگ فرحیہ کو منافقانہ محبت اور خدمت گزاریوں کی مار دے کر ان سے ان کی تمام جائیداد ہتھیانا چاہتے تھے۔ ان کی جائیداد پر قبضہ کر کے وہ انہیں گھر سے نکال دیتے۔ امریکہ جا بسنے کا اُن کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

بابا دینا نے ان باتوں کا فرحیہ سے کوئی ذکر نہ کیا لیکن باتوں ہی باتوں میں انہیں افضل اور اس کی بیوی کی طرف ہوشیار رہنے کی تاکید کی اور کہا کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی بڑا قدم نہ اٹھائیں۔ لیکن فرحیہ افضل پر اندھا اعتماد کرتی تھیں۔ انہوں نے بابا دینا کی باتوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور پھر جب افضل نے ان سے جائیداد بیچ کر امریکہ جا کر آباد ہونے کی بات کی تو وہ فوراً اِس پر تیار ہو گئیں اور باوجود یہ کہ امی جان کی باتوں کے سبب وہ افضل کی نیت و ارادے کے بارے میں کچھ مشکوک و شبہات میں مبتلا ہو چکی تھیں انہوں نے اسے اپنی جائیداد کی فروخت کا اختیار دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اب صرف مختار نامہ تیار ہونا باقی رہ گیا تھا کہ بس اچانک انکل خاور آ گئے۔

اب یہ ہوا کہ افضل اور اس کی بیوی ایک ہفتے کے اندر کوٹھی خالی کر کے چلے گئے۔ اُس کے بعد انکل خاور نے وکلاء کی ایک معروف فرم کی وساطت سے آنٹی فرحیہ کی تمام جائیداد بڑے منافع پر بکوا دی۔ اب ظاہر تھا ان کی شادی ہی ہونا تھی جو بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس میں تمام رشتہ داروں نے شرکت کی اور خوب رونق لگائی۔

اب انکل خاور اور آنٹی فرحیہ امریکہ میں بے حد پُرمسرت اور پُرآسائش زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے اب تین چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے بچے بھی ہیں۔

جب کبھی وہ ہم سے ملنے آتے ہیں تو گویا ویرانے میں بہار آ جاتی ہے۔

اور ہاں! افضل جیسا بھی تھا فطرتاً جرائم پیشہ یا بدقماش شخص ہرگز نہیں تھا۔ وہ آنٹی فرحیہ سے صرف اپنی ماں پر ہونے والے ظلم اور بے انصافی کا بدلہ لینا چاہتا تھا اور بس...... اسی لیے وہ انکل خاور کے سامنے شریفانہ طور پر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

☆☆......☆☆

ان لوگوں کی کہانیاں' جن کی دنیا غم اور دکھ سے آباد ہے



محمود شام کی فکر

وہ لمحہ کون سا تھا کہ جس کو نہ روئے ہم
اب تک پلک پلک ہے بجی آنسوؤں کی راکھ

رفعت محمود

جرنیلی سڑک پر کچھ فاصلے پر واقع ایک پسماندہ گاؤں کے ایک جھونپڑے نما مکان میں رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ جھونپڑے نما مکان کے عین وسط میں دھوئیں سے بھی کالی اور مکڑی



کے جالوں سے بھری چھت کے نیچے ایک بوسیدہ سی چارپائی بچھی تھی۔ جس پر ایک ننھا معصوم بچہ زندگی اور موت کی کشمکش میں بے ہوش پڑا تھا۔ چارپائی کی پائنتی سے سر ٹکائے کھچڑی نما بالوں اور پریشانیوں سے اُلجھا ہوا چہرہ لیے ڈھانچہ سی عورت اپنی ویران آنکھوں میں امید و بیم کی دنیا بسانے کی تک و دو کرتے ہوئے بے ہوش بچے کو ٹک ٹک گھورے جارہی تھی۔ اُس نے خود کو بھی اسی پُراسرار کمرے کے ایک کونے میں سمٹے ہوئے پایا۔ سر جھکائے ٹانگوں کو بازوؤں کے شکنجے میں جکڑے وہ جانے کن خیالات میں گم تھا۔

''نذر خان......'' کمرے کا سکوت ٹوٹا...... وہ بری طرح چونک کر چارپائی کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کی حاجرہ ویران مگر وحشت زدہ نظروں سے اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''نذر خان......'' وہی سہمی ہوئی آواز پھر سنائی دی۔

''ہوں......'' وہ ہاں کہنے کے لیے منہ بھی نہ کھول سکا۔

''بارُو (جبار) کو ابھی تک ہوش نہیں آیا۔'' ممتا فکر اور خوف کے مقتل میں تھی۔

''نذر خان میرا...... بارُو۔'' وہ سسکنے لگی۔

''حاجرہ...... چپ ہو جا حاجرہ۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''کیسے چپ ہو جاؤں۔'' وہ بری طرح پھٹ پڑی۔

''میرا بارو...... میرا بچہ۔'' اس کی آواز ہچکیوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی۔

''تو بتا میں کیا کروں؟'' نذر خان روہانسا ہو کر بولا۔

''میرے بارو کو بچا لے نذر خان...... اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں......'' حاجرہ کی چیخ نکل گئی۔

''کیسی باتیں کرتی ہے...... حاجرہ تُو......'' وہ جھنجلا گیا۔

''بارو کل سے بے ہوش ہے نذر خان کل سے......'' حاجرہ نے پائنتی کو مضبوطی سے تھام لیا۔

''تو میں کیسے ہوش میں لاؤں اسے......'' وہ بے بسی سے بولا۔

''بارو کو دوا اور ڈاکٹر کی ضرورت ہے...... ڈاکٹر پیسے مانگتا ہے اور ہمارے پاس تو روٹی کھانے کو بھی پیسے نہیں...... ڈاکٹر کے لیے کہاں سے لاؤں؟''

''کچھ بھی ہو نذر خان......'' وہ بلکنے لگی۔

''میرے بارو کو بچا لے...... اگر اسے کچھ ہو گیا تو...... تو......''

''نہیں نہیں......'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ نہیں ہو سکتا...... نہیں ہو سکتا۔''

ایک نظر بے ہوش بچے پر ڈال کر وہ بڑبڑاتا ہوا بوسیدہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کے ذہن پر جیسے کوئی ہتھوڑے برسا رہا تھا۔

''اگر بارو کو کچھ ہو گیا تو وہ کیا کرے گا۔ اس کے پاس تو اس کے کفن کے پیسے بھی نہیں ہیں...... وہ اس کو بغیر کفن کے کیسے دفنائے گا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی اور زمین کی تپش پاؤں نہ ٹکنے دیتی تھی۔ مگر وہ نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ ننگے سر ننگے پاؤں بھاگا چلا جارہا تھا۔ سپاٹ چہرے پر پسینے کی مسلسل بہنے والی لکیروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا رخ گاؤں سے کچھ دور پہاڑیوں میں واقع بابا نوگزہ کے مزار کی طرف تھا۔

مزار تک جانے کے لیے کوئی باقاعدہ سڑک تو نہ تھی' البتہ مریدوں اور منت ماننے والوں کی آمدورفت نے بڑی سڑک سے مزار تک دھول اڑاتی مٹی میں ایک کچی پگڈنڈی سی ضرور تراش دی تھی۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ بابا نوگزہ کے مزار پر صدقِ دل سے مانی گئی منت ضرور پوری ہوتی ہے اور یہ بھی

روایت تھی کہ منت پوری ہونے کے بعد لوگ مزار پر ریشمی چادر چڑھاتے تھے۔ چنانچہ مزار کی طرف جانے والا یہ راستہ صرف اُن ہی لوگوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا تھا جو مراد پوری ہونے کے بعد منت اتارنے جاتے تھے۔ تاہم کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا مسافر بھی اُدھر آنکلتا تھا تو وہ کچھ نہ کچھ اس مزار کی نذر کر دیتا۔ زیادہ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ نذرانے بابا نوگزہ کے مزار پر پہرہ دینے والے جن اور روحیں اٹھا لیتی ہیں۔ حالانکہ وہ نذرانے چند مخصوص راز داروں ہی کے کام آتے تھے۔ جن میں نذر خان بھی شامل ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ بھی ایک گرم شام کا ذکر تھا نذر کے گھر میں تین دن سے فاقہ تھا' مسلسل پانی پی پی کر اس کے اور حاجرہ کے منہ سے رال بہنے لگی تھی۔ انہیں اپنی تو اتنی فکر نہیں تھی مگر چھ ماہ کا بارو دودھ کے لیے بلک رہا تھا۔ تین دن کے فاقے نے حاجرہ کی چھاتیاں بنجر کر دی تھیں۔ نذر نے بہت کوشش کی کہ بارو کے لیے کہیں سے تھوڑا سا دودھ مل جائے مگر اسے مزدوری ملی نہ دودھ...... تھک ہار کر جب وہ زندگی سے مایوس ہو گیا تو کسی نے اسے بابا نوگزہ کے مزار پر جانے کا مشورہ دیا۔ وہ آخری امید کے سہارے مزار پر جا پہنچا تو اس کی حیرت اور خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ فرطِ مسرت سے اس کی چیخ نکل گئی۔ فرش پر نیلے پیلے نوٹ اور کئی سکے شاید اُس کے ہی منتظر تھے کہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگے۔ اس کی مراد اتنی جلدی پوری ہو جائے گی یہ تو اس کے گمان میں بھی نہ تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے انتہائی ہوشیاری سے اُس نے سارے سکے اور نوٹ سمیٹے اور مزار کی جانب سینکڑوں سلام کرتا ہوا لوٹ آیا۔ جب وہ مختلف چیزوں سے لدا پھندا گھر پہنچا تو حاجرہ اسے دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسنے لگی تھی۔

اس کے بعد تو نذر کا جیسے یہ معمول بن گیا کہ جس روز اسے مزدوری نہ ملتی وہ بابا نوگزہ کے مزار پر چلا جاتا اور کچھ نہ کچھ لے کر ہی گھر لوٹتا' مگر پچھلے تین ہفتوں سے نذر کو یہاں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ شاید کسی بھی سائل کی منت پوری نہیں ہو رہی تھی اور کوئی بھولا بھٹکا مسافر بھی اِدھر سے نہ گزرا تھا...... مسلسل ناکامی نے اسے پھر سے مایوس کر دیا تھا اور اس نے مزار پر جانا چھوڑ دیا تھا۔

مگر بارو کی نازک حالت اور حاجرہ کی ممتا نے اسے آج پھر بابا نوگزہ کے مزار پر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

گاؤں کا موڑ مڑتے ہی وہ جرنیلی سڑک پر آ گیا اور وہاں آ کر وہ ایک جھٹکے سے رک گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کا چہرہ دھول سے اَٹا ہوا تھا۔ اور پسینے کی لکیریں چہرے پر جمی گرد میں یوں چمک رہی تھیں جیسے بنجر اور ویران پہاڑوں کے طویل سلسلے میں چھوٹی بڑی سبز پگڈنڈیاں...... پسینے سے اس کا سارا جسم شرابور تھا۔ چیتھڑوں سے لٹکی قمیض اس کے جسم سے چپک کر رہ گئی تھی۔ طویل مسافت کی تھکن اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس نے اپنی میلی کچیلی دھوتی کا پلو پکڑ کر چہرے سے پسینہ پونچھا۔ اور پہلی سی رفتار کے ساتھ اس پگڈنڈی پر بھاگنے لگا جو بابا نوگزہ کے مزار کو جاتی تھی۔

مزار کی چوکھٹ کے قریب پہنچ کر وہ ٹھہر گیا۔ مزار کا فرش اس کی امیدوں کے مانند خالی تھا۔ تبھی وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا مزار کے عین وسط میں دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور قبر پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بہت دیر تک وہ یوں ہی دل کا بوجھ ہلکا کرتا رہا' لیکن جلد ہی اسے چونک جانا پڑا۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس پر نرم و

گداز شبنم کی چادر بچھا دی ہو۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو اپنا چہرہ ریشمی کپڑے میں چھپا ہوا پایا۔ خوشبوؤں کے جھونکے اس کے جسم کو معطر کر گئے۔ اسے عجیب سی لذت اور سکون کا احساس ہوا۔ کافی دیر وہ اسی کیفیت میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ اور پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر اس نے اپنے چہرے پر پڑے ہوئے کپڑے کو اٹھا دیا۔ وہ سبز رنگ کی ریشمی چادر تھی۔ اس نے نگاہوں کے ترازو میں چادر کو تولا اور دروازے کی سمت دیکھا۔ چادر ڈالنے والے لوگوں کا مختصر قافلہ کچے راستے کی دھول میں گم ہو چکا تھا۔ کچھ دیر وہ مٹی کے بادلوں کو گھورتا رہا..... پھر آہستگی سے اس کے دونوں ہاتھ آگے بڑھے اور ریشمی چادر گٹھڑی کی طرح اس کے بغل میں چھپ گئی۔ اُس نے وہاں مزید ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور واپس گاؤں کی جانب روانہ ہوا..... اس نے ایک بار چادر کو کھول کر دیکھا۔ چادر کے درمیان میں سنہری موتیوں سے کلمہ شہادت کڑھا ہوا تھا..... اس کا دل لرزا.....

''یہ گناہ ہے'' وہ بڑبڑایا۔

اتنی دیر میں وہ جرنیلی سڑک کے قریب آ گیا۔ اس نے چادر تہہ کر کے پھر بغل میں دبالی۔

''میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔''

وہ چادر کو بغل میں بھینچ کر لفظ چباتا ہوا بولا۔

''اس کے سوا میں کیا کرتا؟''

''کیا کرتا میں؟'' وہ کہتے کہتے رک گیا اور ایک لمحے کو سوچوں میں کھو گیا۔

''وہ اس چادر کا کیا کرے گا؟''

''بارو کا کفن ہی بن جائے گا۔''

''نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا۔'' وہ بری طرح ہانپنے لگا۔ سورج کی حدت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ زمین انگارے کی طرح دہکنے لگی تھی۔ مگر اسے زمین کی گرمی کا احساس نہ تھا نہ آسمان سے برستی ہوئی آگ کی پرواہ..... وہ تو اپنے آپ سے بے خبر سوچوں میں گم..... تیزی سے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں بارو کا بیمار اور لاغر جسم گھوم رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے شاداب ٹہنیاں سوکھ گئی ہوں اور پھول پتوں کی طرح بکھرنے لگے ہوں۔

''نہیں نہیں..... میرے بارو کو کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ سسکنے لگا۔ اُس کا دل کا گرم لہو آنکھوں کے راستے بہہ کر اس کے چہرے کو بھگونے لگا۔

وہ ہانپتا کانپتا گاؤں پہنچا۔ جب وہ اپنے گھر والی گلی میں داخل ہوا۔ تو گھر کے باہر موجود لوگوں کو دیکھ کر اس کا دل مٹھی میں آ گیا۔ وہ لرزتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ گھر کے قریب پہنچا تو اسے گھر کے اندر سے حاجرہ کے بین سنائی دیے.....

وہ بارو کی موت پر نوحہ کناں تھی۔ نذر بھی ہمت ہار بیٹھا اور دھاڑیں مارتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ بارو کا مردہ جسم ایک ٹوٹی چارپائی پر پڑا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور بارو کے بے جان جسم سے لپٹ گیا۔ حاجرہ اور نذر کی آہوں نے ہر ایک دل کو رنجیدہ کر دیا۔ نذر خان نے سبز ریشمی چادر کو کھول کر پھر اسے بارو کے مردہ جسم پر ڈال دیا اور.....

''میرا بیٹا..... میرا بارو.....'' کہہ کر رونے لگا۔

حاجرہ نے سبز چادر کو اور پر کڑھے کلمہ شہادت کو دیکھا تو بولی۔

''بارو کو اسی سبز کفن میں دفنائیں گے۔''

نذر نے ایک نظر حاجرہ کی طرف دیکھا اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے آنسوؤں سے بھری آنکھیں یوں زمین میں گاڑھ دی تھیں جیسے خود اُسے زمین میں گاڑھ دیا گیا ہو۔

☆☆.....☆☆

کراچی سے دوسری دکھی کہانی

ایک سوال

مہناز بٹ کا خیال

خوشا وقت آئی سحر رفتہ رفتہ
شب تار آئی مگر رفتہ رفتہ

نسیم سحر

نیلے آسمان نے تو یہ منظر پہلے بھی دیکھا تھا مگر وہ بے بس تھا مالک کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا تھا اور زمین چاہتی تو یہ منظر بپا کرنے والوں کو نیست و نابود کر دیتی مگر اُس کو بھی مالک کی رضا ہی



درکار تھی اور مالک کل کائنات کی مرضی یہی تھی کہ زمین کے اِس ٹکڑے پر بسنے والوں کی رسی ابھی مزید دراز کی جائے۔ چنانچہ کچھ نہ ہوا نہ زمین پھٹی نہ آسمان...... اور حوا کی بیٹی سرعام برہنہ ایک درخت پر لٹکا دی گئی' درخت نے بہت کوشش کی کہ اپنی شاخیں ہی اس مظلوم پر ڈال دے مگر ہائے بے بسی...... بالآخر ابھرتے ہوئے سورج کو ہی ترس آیا اور لوگوں کی چہل پہل شروع ہوئی اور پہلے نمبر پر گزرنے والے فرد نے یہ منظر دیکھا تو اُس غریب نے اپنی چادر اُس مظلوم پر ڈال دی۔

☆......☆......☆

''عابد تو کب اپنے گھر میں بات کرے گا؟'' زلیخا نے دوپٹے کا کونا مروڑتے ہوئے کہا۔

''کرلوں گا' کرلوں گا' آج کل ابے کی طبیعت خراب ہے ذرا تو بس تھوڑے دن رُک جا۔'' عابد نے جواب دیا۔

وہ دونوں اُس وقت اپنے اپنے گھروں سے کافی فاصلے پر کھیتوں سے ذرا ہٹ کے ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ یہ اُن کا ملنے کا ٹھکانہ تھا۔ دوسرے تیسرے دن وہ دنوں مغرب کے بعد یہاں پہنچ جاتے اور ڈھیروں باتیں کرتے اُن دنوں ہر ملاقات میں زلیخا کا اصرار ہوتا کہ وہ جلدی سے اپنے گھر والوں کو اُس کے گھر بھیجے تاکہ وہ شادی کے بعد ایک ہو جائیں' یوں کب تک چھپ چھپ کے ملتے رہیں گے۔ زلیخا اور عابد ایک دوسرے کی مخالف برادری سے تعلق رکھتے تھے گو کہ دشمنی نہیں تھی مگر دوستی اور رشتے داری بننے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا' مگر محبت یہ سب کب دیکھتی ہے وہ تو بس ہو جاتی ہے جس طرح زلیخا کو عابد سے ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

عابد اپنا کام ختم کر کے گھر واپس آرہا تھا کہ کنویں کے پاس اُسے ایک لڑکی نظر آئی جو پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی' لگتا تھا کہ اسے مدد کی ضرورت ہے۔ عابد قریب پہنچا تھا۔

''کیا مسئلہ ہے؟'' اس کنویں پر اکثر لڑکیاں پانی بھرنے آتی تھیں یہ روز کا معمول تھا کوئی نئی بات نہیں تھی اور اکثر لڑکیوں کو کوئی نہ کوئی مسئلہ بھی ہو جاتا' کبھی مٹکا ٹوٹ جاتا' کبھی رسی چھوٹ جاتی ہاتھ سے اور ڈول کنویں میں ہی رہ جاتا' تو آتے جاتے کوئی نہ کوئی گاؤں والا اُن کی مدد کر دیتا' اُس وقت بھی زلیخا کے ہاتھ سے رسی چھوٹ گئی تھی اور وہ جھک جھک کے اُسے پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی' مگر ناکام رہنے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھنے لگی تھی کہ شاید کوئی آجائے تو اُس سے اپنا مسئلہ کہے۔

اب شام ہو چلی تھی اور آمد و رفت کم ہو رہی تھی' اتفاق سے اُسی وقت عابد کا وہاں سے گزر ہوا تھا زلیخا کا مسئلہ جان کر عابد نے پاس سے ہی ایک لکڑی اٹھائی تھی' اور اُس کی مدد سے کنویں میں دیوار میں اٹکی رسی کھینچ کے نکال لی تھی۔ زلیخا نے اُس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ عابد اُس کے ہاتھ میں رسی پکڑا کے آگے بڑھ گیا تھا اور زلیخا اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔ وہ لمبے چوڑے گھبرو سے عابد پر فوراً ہی مرمٹی تھی۔

اِس کے بعد وہ اکثر کنویں کے پاس ہی نظر آنے لگی کہ شاید عابد آتا جاتا مل جائے' مگر پورے دس دن ہو گئے تھے وہ یہاں سے نہیں گزرا تھا زلیخا تو اُس کا نام بھی نہیں جانتی تھی اُس روز بھی وہ مایوس ہو کر پلٹنے ہی والی تھی کہ اُسے عابد آتا نظر آگیا۔ زلیخا کی تو من کی مراد پوری ہوگئی عابد اپنی دھن میں جارہا تھا کہ وہ سامنے آگئی۔

''کیا ہوا کیا پھر کنویں میں رسی گر گئی؟'' عابد نے سوال کیا وہ سمجھا کہ شاید کوئی مسئلہ ہے جو وہ وہاں کھڑی ہے ورنہ آس پاس کوئی نہ تھا اور شام بھی ہونے والی تھی۔

''نہیں تو......'' زلیخا شرمائی۔

''تو پھر یہاں کیوں کھڑی ہو شام ہو رہی ہے گھر جاؤ۔'' عابد نے اُس کو مشورہ دیا۔

''میں تو تیرے لیے کھڑی تھی۔'' زلیخا نے شرماتے ہوئے کہا۔

''میرے لیے کیوں؟'' عابد حیران ہوا۔

''پاگل! اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ لڑکی لڑکے کا انتظار کیوں کرتی ہے۔'' زلیخا نے مسکرا کے عابد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں تو کون کافر اُس جھیل جیسی گہری آنکھوں میں نہ ڈوبتا' پھر ان کی ملاقاتیں شروع ہو گئیں وہ ہر دوسرے تیسرے دن ملنے لگے تھے۔

☆......☆......☆

زلیخا کا باپ پنچائیت کا سربراہ تھا۔ زلیخا کے دو بھائی تھے جبکہ وہ خود اکلوتی تھی۔ عابد کی ایک ہی بہن نازیہ تھی' جسے وہ بہت چاہتا تھا۔ رفتہ رفتہ جب زلیخا اور عابد' دونوں ہی ایک دوسرے کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو گئے اور ایک دوسرے کے بغیر رہنا مشکل لگنے لگا تو زلیخا کا اصرار بڑھنے لگا کہ عابد اُس کا رشتہ مانگے' عابد کو اندازہ تھا کہ زلیخا اُس سے حیثیت میں زیادہ ہے اور برادری بھی الگ ہے' زلیخا کا باپ کبھی بھی رشتہ نہیں دے گا۔ مگر محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر آخر اُس نے اپنے ماں باپ کو بھیج ہی دیا مگر اُسے یقین تھا کہ انکار ہی ہوگا جبکہ زلیخا نے یقین تو دلایا تھا کہ وہ اپنے باپ کی لاڈلی ہے اور وہ انہیں منالے گی' مگر جاہلانہ اور جاگیردارانہ سوچ میں رشتوں کے تقدس سے زیادہ اپنے شملے اور برادری کی فکر ہوتی ہے' زلیخا کے باپ نے انکار کر دیا کہ وہ غیر برداری میں اور اپنے سے کم حیثیت خاندان میں بیٹی نہیں دے گا۔ اس کے بعد اِن دونوں کے پاس ایک ہی راستہ بچا تھا سو زلیخا کے کہنے پر عابد نے یہ قدم بھی اٹھایا' ایک رات زلیخا گھر سے نکلی تو واپس نہیں آئی۔ عابد اُسے لے کر دوسرے شہر چلا گیا تھا۔

زلیخا کا باپ تو بیٹی کے گھر سے جانے کے بعد غصے سے جیسے پاگل ہی ہو گیا تھا۔ اُس نے عابد کے ماں باپ کو بلا کر دھمکی دی کہ وہ اُن دونوں کا پتہ بتائیں' ورنہ وہ اُن سب کو جان سے مار دے گا' مگر اُن بیچاروں کو کیا پتہ تھا وہ تو خود لاعلم تھے' جب دو تین روز گزر گئے اور عابد اور زلیخا کا کچھ پتہ نہیں لگا تو زلیخا کے باپ نے پنچائیت بلالی۔ جس میں سارے گاؤں والے اور عابد کے ماں باپ بھی شامل تھے۔ پنچائیت کی رضامندی اور فیصلے کے مطابق یہ طے ہوا کہ عابد کی بہن نازیہ کی شادی زلیخا کے بھائی وسیم سے کر دی جائے' اگر بات یہیں تک محدود رہتی تو بھی بہتر تھا۔ مگر وسیم اِس رشتے کے لیے راضی نہ تھا وہ کسی اور کو پسند کرتا تھا' مگر پنچائیت کے اور خاص کر اپنے باپ کی مرضی کے سامنے انکار نہ کر سکا اور اس نے نازیہ سے شادی تو کر لی لیکن صرف پانچ دن بعد ہی اُسے طلاق دے دی' اگر وسیم میں انسانیت کی رمق باقی ہوتی تو بدلہ لینے کے لیے ایک بے قصور کے ماتھے پر طلاق کا داغ لگا دینا ہی کافی تھا' مگر ہمارے ہاں جہالت کے شاہکار یہ گاؤں برادری اور پنچایتی نظام صرف اپنا شملہ اونچا رکھنے کے لیے انسانیت کی سطح سے نیچے گر جاتے ہیں' ہونا تو یہ تھا کہ طلاق کے بعد نازیہ کو اس کے ماں باپ کے گھر بھجوا دیا جاتا' مگر پھر جاگیرداروں کا مکروہ

چہرہ کیسے سامنے آتا۔ وسیم کے چچا انور نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور نازیہ سے خود شادی کرلی لیکن اِس کو شادی کہنا تو شادی جیسے مقدس بندھن کی توہین تھی، یہ تو جہالت اور گمراہی کا گھناؤنا چہرہ تھا، جو نکاح جیسے مقدس رشتے کو بھی ذاتی ہوس کے لیے استعمال کرتے ہوئے وسیم کے چچا انور نے دکھایا۔ اُس نے نکاح کی آڑ میں خود بھی نازیہ کے ساتھ زیادتی کی، بلکہ اپنے اوباش دوستوں کو بھی اس گھناؤنے اور مکروہ فعل میں شامل کیا، جنھوں نے اُس معصوم اور بے قصور لڑکی کو بھیڑیوں کی طرح پانچ دن تک بھنبھوڑا، مگر اندر کا شیطان پھر بھی باز نہ آیا تو اُسے برہنہ کرکے درخت سے لٹکا دیا، جب صبح ہوئی تو لوگوں نے یہ منظر دیکھا اور اُس مظلوم کو اُتارا اور اُس کے برہنہ وجود پر چادر ڈالی۔ مگر وہ بے بس اور مجبور لڑکی اپنے ساتھ ہونے والی اس درندگی کو سہار نہ سکی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اُسے انصاف نہیں ملے گا۔ قانون کے رکھوالے اپنے الفاظ کے نشتر سے اُسے مزید بے آبرو کریں گے، اس لیے اُس نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا اور خود کو آگ لگا کے اِس جہانِ فانی سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ لیا، لوگوں نے اُسے بچانے کی کوشش کی مگر یہ تہمت معاشرے کے چہرے پر لگنا ضروری تھی اس لیے وہ جانبر نہ ہوسکی، اُس کی سوختہ لاش ہم سب سے ایک سوال کر رہی تھی کہ کیا ہم اب بھی دورِ جاہلیت میں زندہ ہیں۔ جب بیٹیوں کو رحمت بنا کر بھیجا جاتا ہے تو پھر ہم اُن سے یہ انسانیت سوز سلوک کیوں روا رکھتے ہیں۔

نہ جانے ہمارا کون سا عمل اور کون سی معافی ہمارے معاشرے کا یہ داغ دھو پائے گی؟

☆☆.....☆☆

غزل

کبھی لہجے بدلتے ہیں، کبھی تیور بدلتے ہیں
محبت رنگ بدلے تو سبھی منظر بدلتے ہیں

ہمیں بھی جستجو میں اب پرندوں جیسا ہونا ہے
اڑانوں میں وہ تھکتے ہیں نا بال و پر بدلتے ہیں

اِک ایسے موڑ پر ہم کو کہانی لے کے آئی ہے
جہاں کردار مر جاتے ہیں اور منظر بدلتے ہیں

خداؤں نے خدائی پر بنے ہیں آہنی جالے
جبینیں بھی نہیں تھکتیں، ناسنگِ در بدلتے ہیں

نئے گھر بھی نگل سکتا ہے سیلابِ بلا اُن کے
جو ڈر کے لوگ بارش سے پرانے گھر بدلتے ہیں

وہ جگنو ہیں جنھیں بے سمت اڑنا راس آتا ہے
بھٹک جاتے ہیں ہم تو جب ذرا محور بدلتے ہیں

ہدایت کاشف۔ رحیم یار خان

ڈیرہ اللہ یار سے تیسری دکھی کہانی

ایک ہوئی منزل

شگفتہ شفیق کا خیال

میرا	دل	چاہتا	ہے	رونے کو
اور	کاندھا	تیرے	بھگونے	کو

ساحل ابڑو

''بھیا! میرے چاند بھیا! آج تم شرط ہار جاؤ گے۔ اور میں جیت جاؤں گی، میری سانسوں اور موت کے درمیان بس کچھ فاصلہ باقی ہے، اور میں اس فاصلے کو جلد سے جلد سمیٹنے کی بھرپور کوشش



کروں گی۔اس لیے کہ میں نے شرط جیتنی ہے۔''

''میرے چاند بھیا! میں اس وقت ٹی بی سینی ٹوریم کے ایک کمرے میں بڑی مشکل سے تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی ہوں۔ کمرے میں میرے سامنے والی کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ اِس کھڑکی میں سے وہ پہاڑی نظارے اور وہ ہوٹل صاف نظر آرہے ہیں جہاں تم مجھے اور امی کو سیر کرانے لائے تھے اور ہم اِس ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اِس وقت میرا جی چاہتا ہے کہ میں اُن جگہوں کو قریب سے جا کر دیکھوں' شاید تمہارے قدموں اور تمہاری یادوں کے نشان مجھے مل جائیں' جو مجھے آخری منزل تک پہنچا دیں' مگر بے بسی تو دیکھو' بھیا میں کیسے وہاں تک جاسکتی ہوں مجھ سے تو چلا بھی نہیں جاتا اور پھر موت کے بے رحم لمحے مجھے تو اتنا وقت بھی تو نہیں دے رہے۔ کاش وقت ہی کچھ دیر کے لیے رک جائے۔ مگر وقت نے رکنا نہیں سیکھا۔

آج اسی وقت کے ساتھ وابستہ یادوں نے میرے من میں آگ سی لگا دی ہے۔ ہاں چاند بھیا! وہ دن یاد کرو کتنا پیارا تھا وہ دن جب شاہدہ اور شکیلہ دونوں باجیوں کی شادی ایک ساتھ ہوئی تھی۔ اُس دن تم بہت روئے تھے اور میں تمہیں تسلی دے رہی تھی۔

''بھیا نہ روئیں آپ کی سب سے پیاری اور لاڈلی چاندنی بہن تو اِسی گھر میں ہے۔''

''بھیا آپ کہا کرتے تھے جی چاہتا ہے چاندنی تیری شادی نہ کروں' کیونکہ اگر تو بھی پیا کے گھر چلی گئی تو یہ گھر سونا ہو جائے گا۔ اجڑ جائے گا۔''

مگر میں کہتی تھی۔

''بھیا پہلے تو آپ کی شادی ہوگی۔'' میں یہ کہتے ہوئے آپ کے گلے میں باہیں ڈال دیتی تھی۔

''بھیا آپ کوئی لڑکی پسند کرلیں ورنہ میں اپنی پسند کی بھابی لے آؤں گی۔'' مگر آپ میری بات کا جواب نہ دیتے تھے۔

''بھیا آپ اصولوں کے بہت پکے تھے' جن میں آپ کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ اولاد کو اپنے طور پر اپنی زندگی کا ساتھی چننے کا کوئی حق نہیں ہے' ماں باپ جو فیصلہ اولاد کے لیے کرتے ہیں انہیں وہ فیصلہ قبول کرنا چاہیے اِس میں اولاد کی بہتری اور فائدہ ہے۔

زندگی بہت مزے سے گزر رہی تھی' گھر میں خوشحالی تھی خوشیاں تھیں آپ مجھ سے کتنا پیار کرتے تھے اور مجھے بھی آپ جیسے بھائی پر فخر تھا۔ میں اپنے آپ کو ہر دکھ اور ہر غم سے محفوظ سمجھتی تھی۔ آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی فکر اور پریشانی نہیں تھی دوسری طرف آپ کو بھی ہر وقت میری ہی فکر رہتی تھی' مجھے چھینک بھی آتی تو بس آپ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جاتے' جونہی میں کسی چیز کی فرمائش کرتی' آپ فوراً ہی وہ چیز مجھے لاکر دیتے تھے اور میں بھی تو آپ کے بغیر ایک لمحہ بھی رہ نہیں سکتی تھی۔ کالج سے واپس آتی تو آپ کا انتظار شروع ہو جاتا اور جب آپ آجاتے تو ہم دونوں اکٹھے ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھاتے۔ ایک ہی گلاس میں پانی پیتے' ایک دن اسی طرح کھانے کے بعد میں نے دیکھا کہ آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں' میں آپ کی آنکھوں میں آنسو بھلا کیسے دیکھ سکتی تھی۔ میرا دل ڈوب رہا تھا۔ میں نے بہت محبت سے آپ کا ہاتھ تھام کر پوچھا تھا۔

''بھیا کیا بات ہے' آج آپ کی آنکھوں میں

آنسو؟'' تو آپ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولے تھے۔

''بس ویسے ہی پگلی' میں یہ سوچ رہا تھا کہ کسی دن تم بھی تو شاہدہ اور شکیلہ کی طرح اپنے بھیا کو چھوڑ کر چلی جاؤ گی' تو پھر میرا کھانے پر انتظار کون کیا کرے گا' ویسے تو خدا سے یہ دعا ہے کہ وہ میری عمر بھی میری چاندنی بہن کو لگا دے۔''

میں اِس بات سے ناراض ہو کر بولی تھی۔

''بھیا! آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ میری عمر میرے چاند بھیا کو لگ جائے اور ایسا ہی ہوگا۔'' میں نے یقین کے ساتھ کہا تھا۔

''چلو شرط لگا لو۔'' آپ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور میں شرط لگا بیٹھی تھی کہ اللہ تعالیٰ پہلے مجھے اپنے پاس بلائے گا۔ چاند بھیا کہنے یا کرنے میں تو وہ مذاق تھا مگر وہ مذاق اب ایک حقیقت کا روپ دھارنے لگا ہے' اور میں وہ شرط جیتنے لگی ہوں کاش! اِس وقت آپ میرے ساتھ ہوتے' مگر نہ جانے آپ کہاں ہیں' اُس دن کو جب آپ بغیر بتائے گھر سے چلے گئے تھے آج بیس برس گزر گئے ہیں' کچھ پتہ ہی نہیں کہ مجھ سے روٹھ کر کہاں جا بسے ہیں۔

''بھیا ایک بار صرف ایک بار اپنی چاندنی بہن کو معاف کر دیں' تاکہ میں سکون کی موت تو مر سکوں' میں جانتی ہوں آپ مجھ سے بہت ہی زیادہ ناراض ہیں۔''

''ہاں بھیا! مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہے۔ میں نے آپ کی بات نہ مان کر جو غلطی کی تھی' اُس کی بڑی سخت سزا بھگت رہی ہوں۔ میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتی جس دن ابو آپ کو بتا رہے تھے کہ کچھ لوگ آج چاندنی کے رشتہ کے لیے آرہے ہیں۔ تو آپ بہت ہی خوش ہوئے تھے۔ اور پھر ذرا دیر کے لیے آپ اُداس بھی ہو گئے تھے' مگر پھر آپ مہمانوں کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے تھے' میں نے آپ کی اور ابو کی باتیں سن لی تھیں اور میں اپنے کمرے میں آکر زاہد کی تصویر کو سامنے رکھ کر رونے لگی تھی۔ زاہد میرا کلاس فیلو تھا۔ میری زندگی تھا اور ہم ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے' میں نے اور اُس نے ایک ساتھ مرنے اور جینے کی قسمیں کھائی تھیں جہاں میں زاہد کو نہیں چھوڑ سکتی تھی وہاں مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ آپ کے یا ابو کے سامنے اپنی اُس محبت کا اظہار کروں۔

مہمانوں کے آنے میں ابھی دیر تھی آپ کسی چیز کو تلاش کرتے ہوئے اچانک میرے کمرے میں چلے آئے تھے اور مجھے یوں روتا دیکھ کر آپ تڑپ سے گئے تھے اور نہایت پریشانی میں سوال کیا تھا۔

''چاندنی تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟ تمہیں میری قسم میری بہن مجھے بتاؤ تمہیں کس نے دکھ دیا ہے؟'' مگر میں آپ کو کیا بتاتی۔ کچھ بھی نہ بتا سکی۔ آپ کے سامنے میں اپنے دل کا حال نہ سنا سکی۔ آپ نے مجھے چپ کرایا اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ میں مہمانوں سے فارغ ہو لوں پھر پوچھوں گا۔

مہمان آئے اور میرے رشتے کی بات پکی کر گئے۔ آپ رات کو کھانا کھانے کے بعد میرے کمرے میں آئے اور پھر سے بڑے لاڈ اور پیار سے دوپہر میں میرے رونے کی وجہ پوچھنے لگے۔

میری آنکھیں پھر چھلک پڑی تھیں میں زبان کھولنا چاہتی تھی مگر ہمت نہیں ہو رہی تھی کیونکہ ایک طرف ایک ایسے بھائی کا پیار تھا' جو مجھ پر دنیا کی ہر خوشی نچھاور کرنے کو تیار تھا اور دوسری طرف میری محبت زاہد تھا۔ جس کے ساتھ میں نے زندگی گزارنے کا عہد کر رکھا تھا۔

میں سخت کشمکش میں مبتلا تھی۔ میں زندگی کے دوراہے والی صلیب پر لٹک رہی تھی۔ جہاں پر مجھے

کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ میں جانتی تھی کہ آپ اپنے وہ اصول نہیں توڑیں گے جن کو آپ نے زندگی کا نصب العین بنا رکھا تھا۔ میں جانتی تھی کہ آپ اپنے اصولوں کی خاطر اپنی بہن کو بھی چھوڑ دیں گے۔ مگر میں مجبور تھی میں زاہد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی اور پھر محبوب کا پیار بھائی کی محبت پر غالب آ گیا۔ بادلوں کی طرح چھا گیا۔ مجھ میں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی۔ شاید زاہد کے پیار نے دی تھی۔ میں نے آپ کے سامنے صاف طور پر اُس رشتہ سے انکار کر دیا۔ جو اُس شام کو گھر والوں نے میرے لیے منتخب کیا تھا۔ میں نے آپ کو کہہ دیا تھا کہ آپ نے جس جگہ میرے رشتے کی بات کی ہے وہ مجھے منظور نہیں۔ میں نے اپنی زندگی کا ساتھی چن لیا ہے' میں اُس سے محبت کرتی ہوں' وہ میری زندگی ہے میری شادی صرف اُسی سے ہوگی۔

یہ انکشاف آپ کے لیے ناقابل یقین تھا آپ کے قدم زمین میں گڑ گئے تھے لگتا تھا آپ کے جسم سے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہے آپ نے ایک نظر میرے چہرے پر ڈالی تھی اور ایک زوردار تھپڑ میرے گالوں پر جڑ دیا تھا پھر آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ شاید اپنی بے بسی پر اور ایک بار پھر آپ کا وہی ہاتھ اٹھا تھا آپ نے اُسے دروازے کی دراز میں دے کر دروازے کو اتنی زور سے کھینچا تھا کہ آپ کا ہاتھ اُس میں آ کر کچل گیا تھا' میں دوڑ کر گئی تھی اور دروازہ کھول کر آپ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا تو آپ مجھے بے غیرت کہہ کر پرے دھکیلتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔

''آج بیس برس گئے ہیں میں نہیں جانتی کہ بھیا آپ کہاں ہو' زندہ ہو یا......''

بھیا آپ کے جانے کے بعد مجھ پر کیا گزری۔ یہ شاید آپ کو معلوم نہیں ہوگا' میں آپ کو بتا رہی ہوں آپ کے جانے کے بعد امی اور

غزل

ساحل پہ گھر بنا کے مٹاتے رہے ہیں ہم
خاموشیوں کو گیت سناتے رہے ہیں ہم

انگلی میں تیرے نام کا پہنا بس ایک حرف
اک جھوٹ تھا جو سب کو بتاتے رہے ہیں ہم

وہ راستہ عجیب تھا جس راہ چل پڑے
دے کر صدائیں گھر کو بھلاتے رہے ہیں ہم

اک سانس پر محیط ہے یہ زندگی کی ڈور
ہر رات اک چراغ بجھاتے رہے ہیں ہم

رستہ نیا نیا تھا سو منزل سے بے خبر
بس راستے کی دھول اُڑاتے رہے ہیں ہم

آئرن فرحت

ابو بہت پریشان رہے' میں نے انہیں بھی وہی کچھ بولا تھا جو میں نے آپ سے کہا تھا ہم تین سال تک آپ کو تلاش کرتے رہے' انتظار کرتے رہے مگر آپ نے میرے جرم کی سزا امی اور ابو کو بھی دے ڈالی تھی۔ آپ نہ آئے تو امی اور ابو نے مجبور ہو کر میری شادی زاہد سے کر دی تھی۔

شروع شروع میں زاہد نے مجھ سے بے پناہ محبت کی مگر پھر اُس کے رویے میں تبدیلی آ گئی' کیونکہ وہ دوستوں کی صحبت میں بگڑ کر شراب نوشی کے ساتھ جوا بھی کھیلنے لگا تھا۔

وہ محبت اور پیار کے بجائے سختی سے پیش آنے لگا۔ میں رات دیر سے گھر آنے کی وجہ پوچھتی تو وہ مجھے پیٹنے لگتا' اور پھر ایک ایک کر کے میرے تمام زیورات اُس کے جوئے کی نذر ہو گئے بھیا! میں نہیں جانتی تھی کہ زاہد انسان کے روپ میں ایک شیطان ہے۔ اُس کا سب سے غلیظ اور بے غیرتی والا روپ امی اور ابو کے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں مجھے دنیا میں تنہا چھوڑ کر اِس جہاں سے چلے جانے کے بعد پیش آیا۔ زاہد ہر روز ایک نئے آدمی کے ساتھ گھر آتا۔ اور مجھے اُس کے ہاتھ رات بھر کے لیے بیچ ڈالتا' آپ کی چاندی پر بربادیوں نے ڈیرے ڈال دیے' میں نے زاہد کے آگے ہاتھ جوڑے منتیں کیں کہ مجھے اِس گھناؤنی زندگی سے نجات دے دو' میں نے تم سے محبت کی اپنے جان سے پیارے بھائی کو ناراض کیا' مگر تم نے میری محبت کا یہ صلہ دیا ہے کہ میری زندگی' اجیرن کر دی ہے۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہی ہوں' میں نے اُس سے طلاق کا مطالبہ بھی کیا مگر زاہد نے میری ایک نہ سنی' میں نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش بھی کی' مگر ناکام رہی۔ اور زاہد کی زیادتیاں اور بھی بڑھ گئیں اور پھر یوں کچھ عرصے بعد میں ٹی بی کی مریضہ بن گئی تو زاہد نے طلاق نامہ میرے ہاتھ میں تھما دیا' بھیا میں کہاں جاتی پھر ایک رحم دل انسان نے میری داستان سن کر مجھے ٹی بی سینی ٹوریم میں داخل کرا دیا۔ مگر میں بجائے تندرست ہونے کے اور بھی بیمار ہوتی گئی کیونکہ جسم سے زیادہ میری روح گھائل ہے میری بیماری اب آخری اسٹیج پر پہنچ چکی ہے۔ موت میرے قریب تر ہے۔ بھیا میں زندگی سے ہار گئی ہوں' موت جیت گئی ہے مگر میرے چاند بھیا میں آپ سے لگائی ہوئی شرط جیت چلی ہوں کہ میں پہلے مروں گی۔''

''نرس یہ لو میرے بھائی اور میری تصویر میری داستان کے ساتھ یہ تصویر بھی شائع کروا دینا شاید اسے پڑھ کر بھیا میری قبر پر ہی آ جائیں' اور آ کر مجھے معاف کر دیں۔''

نرس نے تصویر ہاتھ میں لینے کی خاطر آگے بڑھایا مگر مگر...... چاندی تو اب اِس دنیا سے جا چکی تھی۔

ایمبولینس میں چاندنی کی لاش رکھوائی گئی تا کہ اِس لاوارث کو دفنایا جا سکے' اتنے میں وارڈ بوائے نے آ کر بتایا کہ سینی ٹوریم کے مردانہ وارڈ میں بھی ایک لاوارث مریض مر گیا ہے اسے بھی اِسی گاڑی میں ہی لے جانا ہوگا' تمام کاغذی کارروائی کے بعد وہ لاش بھی ایمبولینس میں رکھوا دی گئی تھی اور جب قبرستان پہنچ کر دونوں لاوارث لاشوں کی تدفین ہو رہی تھی تو وہاں موجود ایک وارڈ بوائے دوسرے وارڈ بوائے کو بتا رہا تھا کہ......

''ان دونوں لاوارث لاشوں کی کلائیوں پر اُس نے' چاند ظہیر اور چاندنی ظہیر' نام کندہ دیکھے ہیں۔''

☆☆......☆☆

چشم کشا کہانیاں

ایسی کہانیاں جن کا انجام اور طرح کا ہے

خونی صحرا

منظر بھوپالی کا خیال

موت سے جو ڈر جاؤ زندگی نہیں ملتی	جنگ جیتنا چاہو کشتیاں جلا دینا

افتخار چوہدری

جھیل کے صاف شفاف ٹھہرے ہوئے پانی میں آسمان کا عکس اتنا واضح نظر آرہا تھا جیسے انسانی آنکھ براہ راست آسمان ہی کو دیکھ رہی ہو۔ چودہویں کا چاند ستاروں کے ہمراہ جھیل میں اترا



ہوا انتہائی خوبصورت لگ رہا تھا۔ یہ چھوٹی سی جھیل ہی اس نخلستان کے لیے زندگی اور ہریالی کا باعث تھی ،جبکہ اس نخلستان کے اردگرد موجود دنیا کا خوفناک ترین صحرا اپنی وسعتوں میں اسرار اور وحشتیں سمیٹے ہوئے تھا۔ رات کے اس آخری پہر کافی سردی ہو رہی تھی، یہی سردی سورج نکلتے ہی قیامت خیز گرمی میں تبدیل ہو کر محض خواب جیسی لگتی تھی۔

میں پچھلے چھتیس گھنٹے سے اس لق دق صحرا میں بھٹکتا پھر رہا تھا، یہ گزرے ہوئے چند گھنٹے میری زندگی کا اذیت ناک وقت تھا، میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے کبھی اس طرح بھی صحرا کی خاک چھاننا پڑے گی۔

چند روز قبل میں بی اے کے ایگزام کا آخری پیپر دے کر گھر پہنچا تو دیکھا امی ابو دونوں پریشان بیٹھے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ میرے ایک کزن کی شادی ہے جو صحرائے چولستان کے قریب ایک گوٹھ میں رہتے ہیں، چچا کے سب سے بیٹے کی شادی تھی اس پہلی خوشی کے موقعے پر انہوں نے ابو کو اصرار سے بلوایا تھا۔

مگر پریشانی یہ تھی کہ شادی کی تاریخوں میں ہی ابو کو اپنی فرم کے ایک وفد کے ساتھ چائنہ جانا تھا، ان کی ٹکٹ بھی کنفرم ہو چکی تھی۔ میں نے ان کی پریشانی کے پیش نظر خود شادی میں جانے کی پیشکش کر دی تو ابو کھل اٹھے۔

میں شادی سے دو دن پہلے ہی ریل گاڑی کے ذریعے رحیم یار خان کے لیے روانہ ہو گیا، رحیم یار خان سے آگے بس کے روٹ سے اسلام گڑھ اور پھر وہاں سے ایک اور کھٹارا بس کے ذریعے صحرائے چولستان کے کنارے آباد مانجھی گوٹھ جا پہنچا۔ یہ سارا سفر طے کرنے میں چوبیس گھنٹے سے زائد وقت لگ گیا ۔مانجھی گوٹھ ایک بہت پرانے قلعے کی فصیل کے اندر آباد تھا۔ یہ قلعہ ایک ٹیلہ نما جگہ پر بنا ہوا تھا

میں زندگی میں پہلی بار چچا کے گھر آیا تھا، مجھے دیکھ کر سب گھر والے کھل اٹھے، چچا کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں سب باری باری امی ابو کے نہ آنے کا گلہ کر رہے تھے، جبکہ مجھے بار بار ان کی مجبوری کی وضاحت کرنی پڑ رہی تھی، ان کا گلہ اپنی جگہ درست تھا کیونکہ پچھلے سال میری ہمشیرہ کی شادی میں چچا اپنی پوری فیملی سمیت شامل ہوئے تھے۔

رات کو دیر تک سب گھر والے میرے گرد بیٹھے گپیں لگاتے رہے، اسی لیے میں اگلے دن دیر تک سوتا رہا، اس صحرائی گوٹھ کی سادہ اور لاہور کی مشینی زندگی میں زمین آسمان کا فرق تھا، یہاں ہریالی کے نام پر بس کھجوروں کے درخت دیکھنے کو مل رہے تھے، یا پھر فصیل سے باہر حد نظر تک پھیلے ہوئے ریت کے ٹیلے اور جا بجا پھیلی ہوئی خوردرو جھاڑیوں کی بہتات تھی۔

ادا خالد چلو تمہیں تھوڑا گھما پھرا لاؤں یہاں بیٹھے بور ہو رہے ہو گے، اگلے دن سہ پہر کے وقت میرے کزن اختر نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے اپنے مخصوص سندھی لہجے میں کہا، یہ بھائی اختر چچا کے سب سے بڑے بیٹے تھے جو ایک سکول میں ٹیچر تھے، انہیں کی شادی ہو رہی تھی، ادا جانا کہاں ہے میں نے ان کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے پوچھا۔

یار رات تک تمام مہمان پہنچ جائیں گے مگر ابھی تک ٹینٹ اور کراکری کا سامان نہیں آیا میرا خیال ہے ایک بار جا کر دوکان دار کو یاد دہانی کروا دینی چاہیے تاکہ انتظامات بروقت مکمل کیے جاسکیں۔

آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ادا چلو چلتے ہیں، میں نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا، اسی لمحے صائمہ لسی کا جگ لیے ہوئے نمودار ہوئی، وہ اختر بھائی سے چھوٹی تھی۔

ادا میں نے آپ لوگوں کے لیے لسی بنائی ہے یہ تو پیتے جاؤ، اس نے ہمارے ارادے بھانپتے ہوئے کہا ۔لے ہی آئی ہو تو پلا دو، میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور پھر ہم لسی پی کر کمرے سے باہر برآمدے میں نکل آئے ،برآمدے میں چاچی بیٹھی چاول صاف کر رہی تھیں۔ صحن میں ابھی کافی تیز دھوپ تھی۔

ماں جی ہم کراکری والے کے پاس جا رہے ہیں ،اختر بھائی نے چچی سے مخاطب ہو کر کہا۔

بیٹا جلدی لوٹ آنا ،انہوں نے اٹھ کر ہم دونوں کے سروں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے تاکید کی۔

گھر سے نکلتے ہوئے اختر بھائی نے اپنا بائیسکل بھی ساتھ لے لیا۔

یہ چھوٹا سا تو گوٹھ ہے ہم پیدل ہی چلتے ہیں، میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ٹینٹ سروس کی دوکان ہمارے گوٹھ میں نہیں ہے وہ یہاں سے چند کلومیٹر دور ایک اور گوٹھ میں ہے۔ انہوں نے جواب دیا تو میں سر ہلا کر رہ گیا۔ ہم قلعے کی بیرونی فصیل میں لگے ہوئے دیوہیکل دروازے تک پیدل ہی آئے، راستے میں چند دوکانوں کا ایک چھوٹا سا بازار تھا جس میں سبزی اور کریانہ مرچنٹ کی دکانیں تھیں۔ انہی میں سے ایک دوکان چچا کی تھی، جہاں ہم چند لمحوں کے لیے رکے اور پھر آگے بڑھ گئے۔

یہاں سب لوگوں کے رنگ گہرے گندمی تھے اور ہر شخص کے پاس اجرک یا پرنہ ضرور تھا، جو کندھے یا سر پر پگڑی کی شکل میں موجود تھا، فصیل کے دیوہیکل دروازے کے قریب پہنچ کر اختر بھائی سائیکل پر بیٹھ گئے ،اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں بھی اچک کر کیریئر پر بیٹھ گیا۔

یہ قلعہ ایک اونچے ٹیلے پر بنا ہوا تھا اس لیے سائیکل ڈھلانی سڑک پر خودبخود پھسلتا چلا گیا، اس کی رفتار بھی کافی تیز تھی، قلعے سے نیچے موجود مین سڑک تک ہم بنا کوئی پیڈل مارے پہنچ گئے، یہ وہی سڑک تھی جس پر میں ایک کھٹارا بس کے ذریعے سفر کر کے یہاں تک پہنچا تھا۔ اب ہم اس چوک سے آگے کی طرف جا رہے تھے، یہ چند فٹ چوڑی سنسان سڑک تھی، جس پر دور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا ،سڑک کے دونوں اطراف جہاں تک نظر جا رہی تھی ،اونچے نیچے ریتلے ٹیلے اور جا بجا خاردار جھاڑیاں پھیلی ہوئیں تھی۔ یہ ہمارے بائیں طرف چولستان کا صحرا ہے اس میں دنیا کے خطرناک ترین سنا پُر سنیک اور بلیک سکارپین موجود ہیں، جن کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں ہے، اس شخص کو بہت خوش نصیب سمجھا جاتا ہے ، جسے بچھو یا کھڑ کھڑیا سانپ ڈس لے اور وہ طبی امداد ملنے تک زندہ رہ جائے ،اختر بھائی نے سڑک کے بائیں طرف موجود صحرائے چولستان کے بارے میں بتایا۔ ادا کیا واقعی ان کا زہر اتنا تیز ہے کہ آدمی طبی امداد ملنے سے پہلے ہی مر جاتا ہے، کوئی تو طریقہ ہو گا بچاؤ کا، میں نے حیرت سے پوچھا۔

آج تک تو ان کا ڈسا ہوا کوئی نہیں بچ سکا، ہاں اگر کھڑ کھڑیا سانپ سے سامنا ہو جائے تو کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی آنکھوں میں نہ دیکھا جائے، کیونکہ کہا جاتا ہے کہ وہ شکار کو اپنی آنکھوں کے سحر میں جکڑ لیتا ہے، تو پھر شکار حرکت کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

اختر بھائی نے اس خطرناک سانپ کے ہلاکت خیز طریقہ واردات کے بارے میں بتایا تو مجھے سن کر ہی جھرجھری آ گئی۔

اس طرف تو انڈیا کی سرحد بھی قریب ہی ہو گی ،میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

ہاں یہاں سے سرحد زیادہ دور نہیں ہے، سرحد کے دونوں طرف سمگلروں کو کنٹرول کرنے کے لیے جگہ جگہ رینجر اور بی ایس ایف نے چوکیاں قائم کی ہوئی ہیں، بلکے انڈین باڈر فورس نے تو سرچنگ سرکل بنایا ہوا ہے اس صحرا میں درجہ حرارت زیادہ ہونے کی وجہ سے اکثر ریت کے طوفان اٹھتے رہتے ہیں، اگر آج صحرا میں تمہیں کوئی ریت کا بہت بڑا ٹیلہ نظر آئے تو ہوسکتا ہے کل وہ تمہیں ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے ریت کے طوفان ایسے ہی ان ٹیلوں کی جگہیں بدلتے رہتے ہیں، ایسی صورت حال سے نپٹنے کے لیے دونوں اطراف کی فورس نے خصوصی انتظام کیے ہوئے ہیں، ۔اختر بھائی نے میرے سوال کا جواب تفصیل سے دیا، کیا اس صحرا میں کبھی آپ کو طوفان کا سامنا کرنا پڑا ہے، میں نے تجسس سے پوچھا۔

نہیں آج تک تو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میرا صحرا میں طوفان سے سامنا ہوا ہو، اور اللہ نہ کرے کہ کوئی دشمن بھی ایسی صورت حال سے دوچار ہو، کیونکہ ریت کا طوفان اتنا شدید ہوتا ہے کہ چند منٹ میں ہی انسانی جسم کو چھیل کر رکھ دیتا ہے، آج تک سنا تو نہیں کہ کوئی

طوفان میں پھنس کر بچ گیا ہو، اور اگر کوئی معجزہ ہو بھی جائے تو متاثرہ شخص کا سینڈ بلائینڈ ہونا یقینی ہوتا ہے، ویسے میں اکثر چاندنی راتوں میں دوستوں کے ساتھ شکار کے لیے صحرا میں جاتا رہتا ہوں، یہاں ایک خاص قسم کا جانور ملتا ہے جس کی شباہت خرگوش سے ملتی جلتی ہے، وہ صحرائی جھاڑیوں پر گزارا کرتا ہے اس کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے، اگر تم شکار کا شوق رکھتے ہو تو شادی کے بعد مزید ایک دو دن رک جاؤ مل کر شکار کھیلیں گے۔

اختر بھائی نے مجھے شکار کی آفر کی تو میرے اندر کا ایڈونچر پسند نوجوان انگڑائی لے کر بیدار ہوگیا، میں تو آج کل کالج سے فری ہوں اگر آپ واقعی مجھے شکار پر ساتھ لے جائیں گے تو مجھے مزید ایک دو دن رہنے میں کوئی مسئلہ نہیں، میں نے پُر جوش انداز میں رضا مندی ظاہر کی۔

تو پھر ٹھیک ہے ویسے سے اگلے دن کا پروگرام پکا سمجھو، اختر بھائی نے حتمی انداز میں پروگرام فائنل کر دیا، ہم اسی طرح مختلف موضوعات پر باتیں کرتے ہوئے وجنتی گوٹھ پہنچ گئے، یہاں کی آبادی ماجھی گوٹھ کے مقابلے میں تھوڑی زیادہ تھی، مگر یہاں کے بازار میں بھی دوکانیں بس گنتی کی ہی تھیں،۔

ان میں سے ایک ہماری مطلوبہ دوکان بھی تھی، جس کی کچی اینٹوں سے بنی ہوئی خستہ دیوار پر قلعی سے سندھی رسم الخط میں کرمانو الاٹینٹ سروس لکھا ہوا تھا، دوکان اندر سے نیم تاریک تھی مگر درجہ حرارت باہر کی نسبت حیرت انگیز حد تک کم تھا، خستہ سی ٹیبل کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا حقے کے کش لگا رہا تھا۔ وہ ہمیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

خوش آمدید ماسٹر صاحب کیسے احوال ہیں اس نے اپنی مخصوص علاقائی زبان میں پوچھا اور باری باری ہم سے مصافحہ کیا، اور ہمیں ٹیبل کے اطراف میں موجود کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

مولا سائیں کا خاص کرم ہے ملک صاحب۔ اختر بھائی نے بھی اسی مخصوص مٹھاس بھرے لہجے میں جواب دیا۔

لگتا ہے یہ نوجوان کسی شہر سے آیا ہے اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

جی ہاں یہ میرے تایا زاد خالد صاحب ہیں لاہور سے آئے ہیں اختر بھائی نے میرا تعارف کروا دیا۔

گھنا سوھنا ایں (بہت خوب صورت ہے) ملک صاحب نے مجھے ستائیشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کون میں یا لاہور میں نے اختر بھائی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بات اچک لی۔

میرا سوال سن کر ملک صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

سائیں ہم نے تو کبھی لاہور دیکھا ہی نہیں اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

جنے لاہور نئیں ویکھیا اوہ جمیا ای نئیں میں نے برجستہ جواب دیا، تو وہ میری پنجابی میں کہی ہوئی بات کا مفہوم سمجھ گیا، اور کافی دیر تک ہنستا رہا۔

بچپن سے سنتے تو یہی آرہے ہیں مگر کبھی دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

اس نے کھسیانے سے انداز میں جواب دیا جیسے اسے واقعی لاہور نہ دیکھنے کا قلق ہو۔

ملک صاحب میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ آج رات تقریباً سبھی مہمان پہنچ جائینگے، مگر ابھی تک ٹینٹ اور کراکری کا سامان نہیں پہنچا۔

اختر بھائی نے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

فکر نہ کریں ماسٹر صاحب ایک دو گھنٹوں میں سامان آپ کے گھر پہنچ جائے گا، وہ دراصل ساتھ والے ایک گوٹھ میں شادی کی تقریب تھی، جو کل رات ہی ختم ہوئی ہے سامان وہاں گیا ہوا تھا، میں نے اپنے لڑکوں کو ٹرالی دے کر وہاں بھیجا ہوا ہے، وہ بس واپس آتے ہی ہونگے،۔ تب تک میں آپ کے لیے ستو بنوا کر لاتا ہوں، اس نے سامان کے بارے میں تفصیل بتا کر آخر میں اٹھتے ہوئے کہا۔

نہیں ملک صاحب اس کی ضرورت نہیں اب آپ ہمیں اجازت دیں بس مہربانی فرما کر سامان ذرا جلدی بھجوا دیں، اختر بھائی نے اٹھتے ہوئے کہا تو میں بھی ان کی تقلید میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اور پھر ہم سلام دعا کے بعد واپسی کے لیے چل پڑے ابھی ہم نے دو سے تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اچانک ہی بائیسکل کا ٹائر پنکچر ہوگیا۔

اوہ اسے کیا ہوگیا ابھی چند دن پہلے ہی تو ٹائر ٹیوب بدلوائے تھے۔

اختر بھائی نے پریشان ہوتے ہوئے کہا، کیا پنکچر لگوانے کے لیے واپس وجنتی گوٹھ چلیں، انہوں نے دور عقب میں نظر آنے والے گوٹھ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

کیا اپنے گوٹھ میں سائیکلوں کی دوکان نہیں ہے میں نے پوچھا۔

ہے تو مگر ابھی سفر کافی زیادہ ہے، جبکہ اس گوٹھ سے تو ابھی ہم دو تین کلومیٹر ہی دور ہیں، انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

تو پھر ہم واپس مڑنے کی بجائے اپنے گوٹھ کی طرف چلتے ہیں میں نے تجویز دی۔

کیا تم سات آٹھ کلومیٹر پیدل چل لو گے۔ اختر بھائی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

بھائی میں شہری ضرور ہوں، مگر اتنا سہل پسند نہیں کہ چند کلومیٹر پیدل نہ چل سکوں، اور ویسے بھی آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں روزانہ پندرہ کلو میٹر دوڑ لگاتا ہوں، میں نے بتایا تو وہ حیران رہ گئے، اس وقت تک سورج مغرب کی طرف جھک چکا تھا، اور گرمی کی شدت میں نمایاں کمی ہو چکی تھی، ہم باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے، سڑک کے دونوں اطراف میں سنہری ریت لہر دار صورت میں پڑی ہوئی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

ویسے اگر ہم یہاں سے صحرا میں داخل ہو جائیں تو شارٹ کٹ راستے سے محض چار کلومیٹر کے لگ بھگ چلنا پڑے گا، جب کہ یہی سفر سڑک کے ذریعے آٹھ کلو میٹر کے قریب ہے، اختر بھائی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا، یہ ٹھیک رہے گا ہم صحرا کے راستے چلتے ہیں اسطرح میرا صحرا میں سفر کرنے کا شوق بھی پورا ہو جائے گا، اور ہم گھر بھی جلدی پہنچ جائیں گے۔

میری بات سن کر انہوں نے سائیکل کا رخ صحرا کی طرف موڑ دیا، میں زندگی میں پہلی بار صحرا میں داخل ہوا تھا، نرم ریت میں میرے جوگر دھنس رہے تھے، مجھے عجیب سے احساس کیساتھ اچھا محسوس ہو رہا تھا، اختر بھائی مجھے صحرا میں پائے جانے والے جانوروں کے بارے میں بتا رہے تھے، میں ان کی باتیں دلچسپی سے سن رہا تھا، ایسے ہی باتیں کرتے ہوئے ہم ماجھی گوٹھ کے اتنے قریب پہنچ گئے کہ دور سے ہمیں قلعے کی فصیل نظر آنے لگی۔

یہاں اس صحرا میں ایک ایسی چھپکلی بھی ہے جو اگر آپ کے جسم کے کسی بھی حصے کو سونگھ لے تو جسم کا وہ حصہ تھوڑی ہی دیر میں گلنا سڑنا شروع ہو جاتا ہے۔

اختر بھائی نے ایک اور جانور کے بارے میں بتایا۔ میں جو قلعے کی فصیل کی طرف دیکھ رہا تھا چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوگیا، کیا واقعی میں نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، اس کے علاوہ یہاں ایک گولڈن سینڈ فلائی بھی پائی جاتی ہے، وہ ہوتی تو عام مکھیوں جیسی ہی ہے مگر اس کا رنگ سنہرا ہوتا ہے، اگر وہ جسم کے کسی حصے پر کاٹ لے تو چند گھنٹوں میں ہی متاثرہ حصے پر آر پار سوراخ ہو جاتا ہے، انہوں نے چھپکلی کے بعد گولڈن سینڈ فلائی کے زہریلے پن کے بارے میں تفصیل بتائی تو مجھے صحرا سے ڈر محسوس ہونے لگا، میں نے ایک بار پھر فصیل کی طرف دیکھا تو ٹھٹھک کر رک گیا، کچھ دیر پہلے تو قلعے کی فصیل واضح نظر آرہی تھی، مگر اب وہ اس قدر دھندلا چکی تھی کہ غور سے دیکھنے پر بھی نظر نہیں آرہی تھی، مجھے رُکتا دیکھ کر اختر بھائی نے میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھا، اور پھر میری نظروں کے تعاقب میں قلعے کی طرف دیکھا تو ان کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔

خیر تھیوے مولا سائیں (اللہ خیریت رکھے) یہ تو ریت کا طوفان آرہا ہے۔

یہ لو اسے سر اور چہرے پر مضبوطی سے باندھ لو

اور میرا ہاتھ تھام لو کسی بھی حال میں چھوٹنا نہیں چاہیے

انہوں نے اپنے کندھے پر موجود پرنہ اتار کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

مگر آپ کیا کریں گے، میں نے پوچھا۔ میری فکر نہ کرو تم جلدی سے باندھ لو اختر بھائی نے سخت لہجے میں جواب دیا تو میں نے اس رومال سے سر اور چہرے کو اچھی طرح کور کرلیا۔

اس دوران اختر بھائی نے اپنی قمیض کے بٹن کھول کر اسے کالر سے پکڑ کر اوپر کی جانب کھینچا تو ان کا پورا سر قمیض کے اندر چھپ گیا، اس وقت تک ہمارے اردگرد فضا میں ریت اڑنا شروع ہو چکی تھی، اور سرشام ہی گہرا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

میرا ہاتھ تھام لو ہم گوٹھ کی طرف بڑھتے رہیں گے، اگر طوفان کی شدت زیادہ ہو گی تو ہم بیٹھ جائیں گے، اور طوفان کم ہونے کا انتظار کریں گے انہوں نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو میں نے مضبوطی سے ان کا ہاتھ تھام لیا، ہم سر جھکائے ابھی چند ہی قدم چلے تھے، کہ طوفان شدت اختیار کر گیا، ہم سے قدم اٹھانا بھی مشکل ہو گیا۔

اختر بھائی نے دوسرا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا، تو میں وہیں بیٹھ گیا، شاید سائیکل ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، ہوا کی رفتار تیز ہونے کی وجہ سے ایک عجیب طرح کی گونج پیدا ہو رہی تھی جیسے ہزاروں بلائیں مل کر رو رہی ہوں۔

اس تیز رفتار طوفان میں ریت کے ذرے کسی ریگمار کی طرح ہمارے جسموں کو رگڑ رہے تھے۔

پھر مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میرے قدموں کے نیچے سے ریت بیٹھنے لگی ہو جس سے میرے پاؤں ریت میں دھنسنے لگے۔

اسی لمحے اختر بھائی نے چیخ کر کچھ کہا، مگر مجھے ان کی بات کی سمجھ نہیں آئی، انہوں نے ایک بار پھر کچھ کہا اور میرا ہاتھ کھینچنے لگے، میں اٹھنے سے ڈر رہا تھا طوفان کی شدت سے لگ رہا تھا کہ اگر میں نے کھڑا ہونے کی کوشش کی تو ہوا مجھے کسی حقیر تنکے کی طرح فضا میں اٹھا لے گی، اُسی لمحے مجھ پر انکشاف ہوا کہ ہم ریت کی دلدل میں پھنس چکے ہیں کیونکہ میری ریت میں دھنسنے کی رفتار بڑھنے لگی تھی، میرا دل خوف کی وجہ سے بیٹھنے لگا تو میں بنا سوچے سمجھے یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

اس بھیانک غلطی کا خمیازہ مجھے اگلے ہی لمحے مجھے بھگتنا پڑ گیا۔ ہوا نے مجھے کسی حقیر تنکے کی طرح اپنی لپیٹ میں لے کر ایک جھٹکے سے اوپر اٹھایا تو اختر بھائی کا ہاتھ میری گرفت سے نکل گیا۔

ہوا مجھے ادھر اُدھر ایسے پٹخنے لگی جیسے میں کوئی بے وزن چیز ہوں، کوشش کے باوجود میں خود کو سنبھال نہیں پا رہا تھا، اسی تگ و دو میں میرے سر اور منہ پر بندھا کپڑا ابھی کھل گیا، چہرے پر سے کپڑا ہٹتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ دردناک عذاب کسے کہتے ہیں۔

مجھے بالکل ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں چکی کے دو پاٹوں کے درمیان رگڑا جا رہا ہوں، میں حتی الامکان اپنے حواس قائم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مگر اس کے باوجود ہر گزرتے لمحے حواس میرا ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے، ریت کا طوفان مجھے کسی ہلکے کاغذ کی طرح اپنے ساتھ اڑائے لیے جا رہا تھا۔

میرے ذہن میں ابھرنے والا یہ آخری خیال تھا کہ شاید اب میں کبھی اپنے امی ابو کو نہیں دیکھ پاؤں گا، اس کے ساتھ ہی جیسے کیمرہ بند ہونے پر سکرین تاریک ہو جاتی ہے میرا ذہن بھی ایسے ہی گہرے اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔

رات کی تاریکی میں سے جیسے سحر کی کرنیں دھیرے دھیرے پھوٹتی ہیں، کچھ ایسے ہی انداز میں میرے حواس پہ چھائی ہوئی بے ہوشی کی دبیز چادر آہستگی سے کھسکی تو میرا ذہن انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا، میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو میرے منہ سے بے اختیار کراہیں نکل گئیں، نقاہت بھرے جسم نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا، مجھے اپنے چہرے اور ہاتھوں پر شدید جلن کا احساس ہو رہا تھا، میں نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو وہ ریت کی رگڑ سے بری طرح چھل چکے تھے، اور خون رس رس کر سوکھ گیا تھا، سوکھے ہوئے خون کے ساتھ ریت کے ذرے بھی

بری طرح سے چپکے ہوئے تھے، میرا ہاتھ بے اختیار اپنے چہرے کی طرف اٹھ گیا، پورا چہرہ ہاتھوں کی طرح مجروح ہو چکا تھا۔

شدید پیاس سے گلا سوکھ کر کانٹے کی طرح دکھ رہا تھا، میں نے ایک بار پھر ہمت کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا، اطراف میں نظر دوڑائی تو چاروں طرف ریت کا سمندر اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھا، رات کی تیرگی میں سے صبح کا اجالا پھیلنے کو تھا، اس وقت فضاء میں اتنی پرسکون خاموشی چھائی ہوئی تھی جیسے یہاں طوفان تو کجا کبھی تیز ہوا بھی نہ چلی ہو، سورج نکلنے ہی والا تھا۔

اگر سورج نکلنے سے پہلے میں صحرا سے باہر نکلنے یا کوئی سایہ ڈھونڈنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو شدید گرمی اور پیاس میرے لیے ایک اور امتحان ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ سوچ میرے ذہن میں ابھرتے ہی میں روہانسہ ہو گیا، زندگی میں کبھی کوئی تکلیف نہیں دیکھی تھی، مگر اب پے در پے پڑنے والی مصیبتوں نے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اپنے جسم میں موجود توانائی کو مجتمع کیا اور اٹھ کھڑا ہوا، میرے ذہن میں بس ایک ہی بات بار بار گردش کر رہی تھی کہ کہیں پیاس کی وجہ سے میں اس خوفناک صحرا میں سراب کا شکار نہ ہو جاؤں، بہت زیادہ نقاہت کے باوجود میں لڑکھڑاتے قدموں سے چلا جا رہا تھا، مشرق کی طرف آسمان پر پھیلتی ہوئی روشنی سے میں نے سمت کا تعین کر لیا تھا، میرے چلنے کی رفتار کافی کم تھی بحر حال یہی شکر تھا کہ میں چل رہا تھا، اگلے آدھے گھنٹے میں سورج نکل کر بلند ہو چکا تھا اس کی آگ برساتی شعاعیں صحرا میں موجود خنکی کو بتدریج کم کرتی چلی جا رہی تھیں۔

جس رفتار سے درجہ حرارت بڑھ رہا تھا، اس سے لگ رہا تھا کہ یہ پرسکون نظر آنے والا صحرا کچھ ہی دیر میں جہنم کی طرح تپنے والا تھا، مگر مجھے ابھی تک صحرا کے ختم ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے، اس پر مزید یہ کہ میرے جسم میں موجود توانائی آخری مرحلے میں تھی، میرا ہر اٹھنے والا قدم پہلے سے سست ہو رہا تھا ہمت کسی بھی لمحے جواب دینے والی تھی، میں نے بے بسی سے مڑ کر سورج کی طرف دیکھا تو اس کی تیز حدت مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہوئی۔

میرے پاس زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا، میں نے ایک بار پھر بے بسی اور لاچارگی میں چاروں طرف نظر دوڑائی تو میری آنکھوں میں رکے ہوئے آنسو بے اختیار گالوں پر بہہ گئے، یقینی موت کو سامنے دیکھ کر بے بسی کی کیفیت کیسی ہوتی ہے، یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو چکی تھی، مگر لگ رہا تھا کہ یہ احساسات اور محسوسات کسی کو بتانے سے پہلے ہی میری روح قفس کے اس پنجرے سے آزاد ہو چکی ہو گی۔

مایوسی مختلف خیالوں کی صورت میں مجھ پر حملہ آور ہو چکی تھی، جو مجھے وقت سے پہلے موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی، میں نے اپنے دِل و دماغ کو یکسو کر کے اپنے پروردگار کی طرف متوجہ کر لیا اور سجدے میں گر کر بلک بلک کر رونے لگا، میری زبان پر کہنے کو کوئی لفظ نہیں تھا اور دل میں مانگنے کے لیے کوئی دُعا نہیں تھی میرے آنسو، حالت اور کیفیت ہی میرے وکیل بنے ہوئے تھے، کچھ دیر بعد جب من کا غبار ہلکا ہوا تو ایک بار پھر چل پڑا۔

اس وقت تک سورج کی تمازت حدت میں بدل چکی تھی پسینے کے قطرے جسم پر پھسلنے سے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کینچوے رینگ رہے ہوں، زبان حلق تک خشک ہو چکی تھی، میں قدم رکھ کہیں رہا تھا اور وہ پڑ کہیں رہا تھا اسی دوران مجھے بار بار سراب نظر آنے لگے کبھی ایسے محسوس ہوتا جیسے تھوڑے فاصلے پر دریا بہہ رہا ہو کبھی سرسبز جنگل نظر آنے لگتا، سراب اتنے واضح اور کلئیر ہو سکتے ہیں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

دل بے اختیار سامنے نظر آنے والے پانی کی طرف جانے کو مچل بھی اٹھا مگر میں نے اپنی قوت ارادی کو آخری حد تک استعمال کرتے ہوئے خود کو کنٹرول کیے ہوئے تھا کچھ دیر بعد مجھے ریت کے ایک ٹیلے کے دو دو نظر آنے لگے تھے، دفعتاً میری نظر ایک چھوٹی سی جھاڑی پر پڑی تو میرے قدم وہیں رک گئے میں نے آنکھوں کو کئی بار رگڑ کر دیکھا مگر وہ جوں کی توں موجود رہی، میں نے قدم اس کی طرف بڑھائے

تو میرا دماغ مجھے متنبہ کرنے لگا کہ یہ سراب ہے اس کے پیچھے مت بھاگو، مگر میرا اپنے قدموں پر کوئی اختیار نہیں رہ گیا تھا قدم خود بخود اسی جھاڑی کی طرف اٹھ رہے تھے، پھر جب میں اس جھاڑی کے قریب جا گرا اور ہاتھ بڑھا کر اسے چھوا تب یقین ہوا کہ وہ محض سراب نہیں حقیقت میں موجود ہے، تھوڑی سی کوشش سے میں اس جھاڑی کو اکھیڑنے میں کامیاب ہو گیا اس کی کئی شاخہ جڑ کا ذائقہ کسیلا تھا مگر وہ پانی سے بھری ہوئی تھی جس سے میرا حلق تر ہو گیا تو حواس کچھ ٹھکانے آ گئے۔ میں اگلے چند منٹ میں جھاڑی والی جگہ سے ریت ہٹا کر کافی بڑا گڈھا بنا چکا تھا، میں جوں جوں ریت ہٹا رہا تھا نیچے سے گیلی ریت نکلتی آ رہی تھی، بالآخر میں اتنی گہرائی تک پہنچ گیا کہ ریت میں سے پانی سم کر اوپر آنے لگا تو میں اپنی شرٹ کو بھگو کر منہ میں نچوڑنے لگا یہ پانی میرے لیے نئی زندگی کی نوید لے کر آیا تھا، میں سارا دن جھاڑی کو سر پر رکھ کر اس گیلے گڈھے میں پڑا رہا سورج ڈھلنے پر باہر نکل آیا اور خود کو سفر کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔

کیونکہ اگر آج رات میں صحرا کو عبور نہ کر سکتا تو پھر کل دن کی قیامت خیز گرمی سے میں کسی صورت نہیں بچ سکتا تھا آج تو خوش قسمتی کی وجہ سے جھاڑی میری زندگی کی ضمانت بن گئی تھی، انہی خیالوں کے تحت میرے اٹھنے والے قدموں کی رفتار کافی تیز تھی۔

بنا رکے آدھی رات تک مسلسل چلنے کے بعد میں اس نخلستان تک پہنچا تھا یہاں پہنچ کر مجھے ایسے لگا جیسے میں موت کو پچھاڑ کر زندگی کی سرحد میں داخل ہو گیا ہوں۔ ابھی میں جھیل میں اترے ہوئے چاند ستاروں کے سحر میں کھویا ہوا تھا کہ پانچ اونٹوں پر مشتمل ایک قافلہ وہاں آ پہنچا، اس سے پہلے کہ مجھ پر واضح ہوتا کہ وہ کون لوگ ہیں اور میں کسی درخت کی اوٹ میں چھپتا ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی، میں ابھی اپنی جگہ سے اٹھا ہی تھا کہ ایک دم سے کئی ٹارچوں کی تیز روشنیوں نے بیک وقت مجھے اپنے حصار میں لے لیا تو میری آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔

ہالٹ اگر بھاگنے کی کوشش کی تو بھون دیے جاؤ گے، ایک گرجدار آواز نے مجھے خبردار کرتے ہوئے پہلے راجستھانی اور پھر ہندی میں وہی بات دہرائی تو میرا ذہن بھک سے اڑ گیا، میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے یکدم جیسے سلب ہو گئی تھی، بس ایک ہی بات ذہن میں گردش کر رہی تھی کہ کیا میں سرحد کراس کر چکا ہوں، اور اس وقت میں انڈیا کے علاقے میں ہوں۔ میں اپنے حواس میں تب لوٹا جب انڈین بی ایس ایف کے جوانوں نے مجھے اٹھا کر ریت پر پٹخا اور چند لمحوں میں میری تلاشی لینے کے بعد ہاتھوں کو پشت پر لیجا کر ہتھکڑی لگا دی۔

اگر یہاں سے ہلنے کی کوشش کی تو سیدھا کھوپڑی میں گولی ماروں گا، ایک فوجی نے اپنی جی تو گن کی سرد نال میرے سر پر رکھتے ہوئے وارننگ دی، تو خوف کے مارے میرا پورا جسم کسی تشنج زدہ مریض کی طرح کانپنے لگا، اور ذہن میں انڈین فورسز کے ظلم و بربریت کے وہ واقعات گھومنے لگے جو میں اکثر اخبارات اور میڈیا کے ذریعے دیکھتا رہتا تھا، صحرا سے تو میں شاید بچ ہی جاتا مگر ان ظالموں کے چنگل سے شاید جیتے جی جان چھوٹنا کوئی معجزہ ہی ہو گا۔

فوجیوں نے دو گیس لیمپ روشن کر لیے جن سے اردگرد کا ماحول روشن ہو گیا، فوجیوں نے کمانڈوز کی وردیاں پہنی ہوئی تھی۔

ایک فوجی نے میرے قریب فولڈنگ چیئر لا کر رکھ دی اور پھر مجھے اٹھ کر گھٹنوں کے بل کھڑا ہونے کا کہا تو میں نے بنا کسی چوں چراں کے اس کا کہا مان لیا، تو وہ فوجی اپنی گن میرے سر سے لگا کر کھڑا ہو گیا۔

اسی وقت ایک لمبا تڑنگا باڈی بلڈر ٹائپ نوجوان ٹہلنے کے انداز میں چلتا ہوا اندر آیا اور آ کر میرے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا، اس کی وردی پر کیپٹن کا رینک لگا ہوا تھا، جبکہ نیم پلیٹ پر کیپٹن راجندر لکھا ہوا تھا۔

کون ہو تم اور یہ تمہارے چہرے کو کیا ہوا ہے، اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے انگریزی میں پوچھا تو میں نے اسے تمام تفصیل اسے بتا دی۔

میری بات سن کر وہ کچھ دیر سوچتی ہوئی نظروں

سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر اپنی پاکٹ میں سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر سگریٹ سلگانے لگا۔

اچھی سٹوری ہے اس نے ایک کش لگا کر فضا میں دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

میں جذباتی انداز میں قسمیں اٹھا اٹھا کر اسے اپنے بے گناہ ہونے اور حادثاتی طور پر سرحد عبور کرنے کے بارے میں قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا، مگر وہ ہر بار میری بات سن کر اثبات میں سر ہلا دیتا، جس سے میری بے چینی مزید بڑھ جاتی۔

مجھے اتنا تو کنفرم تھا کہ اگر یہ لوگ مجھے کسی انیٹروگیشن سنٹر میں لے گئے تو میرے بچنے کا امکان صفر ہو جانا تھا، اسی لیے میں اسے ہر حال میں اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کے لیے ہذیانی انداز میں اپنی صفائیاں دے رہا تھا، اور منتوں ترلوں کے ساتھ اسے واسطے بھی دے رہا تھا کہ مجھے واپس جانے دیں۔

وہ کافی دیر میری صفائیاں سنتا رہا، اور پھر مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

تم جو بھی باتیں کر رہے ہو اگر میں یہ ساری سچ مان بھی لوں تب بھی تمہاری پوزیشن میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، کیونکہ تم اس وقت انڈین سرحد کے پانچ کلو میٹر اندر کھڑے ہو اور اس وقت یہی سب سے بڑی حقیقت ہے، کیپٹن راجندر نے ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے سپاٹ اور سرد لہجے میں جواب دیا تو مجھے اپنا وقت پورا ہوتا ہوا نظر آنے لگا، جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا اس سے میں سمجھ گیا کہ وہاں سے سرحد کس طرف ہے۔

سر پلیز آپ کو آپ کے بھگوان کی قسم ہے آپ میری بے گناہی کا یقین کر لیں، میں واقعی حادثاتی طور پر ادھر آ نکلا ہوں، میں نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں اور بھرائے ہوئے لہجے کے ساتھ آخری کوشش کی۔ سوری تمہاری تفتیش ہو گی اس کے بعد اگر تم بے گناہ ثابت ہوئے تو ہماری حکومت کے صوابدید پر ہو گا کہ وہ تمہیں تمہاری حکومت کے حوالے کس شرط پر کرتے ہیں، اس نے حتمی انداز میں جواب دیا، اور فوجیوں کو اشارہ کیا تو انہوں نے ایک بار پھر مجھے ریت پر لٹا کر میرے پاؤں بھی باندھ دیے اور چہرے پر کالے رنگ کا تھیلا چڑھا دیا، اور مجھے اٹھا کر ایک اونٹ پر رکھے ہوئے پالنے میں ٹھونس دیا، اور قافلہ نخلستان کی جس سمت سے آیا تھا اب اس کی مخالف سمت میں چل پڑا، میری تمام منتیں اور ترلے بے کار ہو چکے تھے، کیپٹن راجندر کو میں اپنی بے گناہی کا یقین نہیں دلا سکا تھا، مجھے پالنے میں بے ہنگم انداز میں ٹھونسا گیا تھا، اونٹ کے چلنے سے مجھے ہلکورے آ رہے تھے، قافلہ انہی ہلکوروں میں لگ بھگ آدھا گھنٹہ سفر کرتا رہا اور پھر ایک جگہ رک گیا، کچھ دیر بعد اونٹ کو نیچے بٹھایا گیا، اور فوجیوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا اور پھر پاؤں والی بندش کھولنے کے ساتھ ہی چہرے پر چڑھے ہوئے تھیلے کو بھی اتار دیا گیا۔

یہ ایک چھوٹا سا نخلستان تھا، جس میں کثرت سے کھجوروں کے درخت لگے ہوئے تھے، ایک طرف چھوٹی سی عمارت بنی ہوئی تھی جس کے اوپر ہندوؤں کے مندروں کی طرز کے لمبوترے گنبد بنے ہوئے تھے، ابھی میں اس عمارت کی طرف دیکھ ہی رہا تھا، جب ایک فوجی مجھے گھسیٹتے ہوئے قریبی درخت کے پاس لے گیا اور میری ہتھکڑی کی زنجیر کو درخت کے ساتھ باندھ دیا، اسی وقت عمارت میں سے درجن کے قریب پنڈت اور داسیوں کے حلیے والے افراد نمودار ہوئے، داسیوں نے ہاتھوں میں تھالیاں اٹھا رکھی تھیں، جن میں ناریل کے علاوہ کئی قسم کے لوازمات رکھے ہوئے تھے، اور ہر تھالی کے درمیان میں ایک دیا جل رہا تھا، وہ سب فوجیوں کے پاس پہنچے اور پھر داسیاں فوجیوں کی آرتی اتارنے اور تلک لگانے لگیں، جب کہ پنڈت اپنی مخصوص زبان میں کوئی اشلوک پڑھ رہے تھے، پنڈت اور داسیوں کے اس گروہ کو ایک بوڑھا پنڈت لیڈ کر رہا تھا، اس کا رنگ سیاہی مائل جبکہ جسم فربہ تھا، کیپٹن راجندر اس بوڑھے کے سامنے بچھا جا رہا تھا۔

یہ کون ہے بوڑھے پنڈت نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا، کیپٹن راجندر نے اسے میرے بارے میں تفصیل بتا دی۔

تفصیل سننے کے بعد وہ بوڑھا دھیرے سے چلتا ہوا میرے سامنے آ کھڑا ہوا، اور کافی دیر تک مجھے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا اسکی نظروں میں عجیب طرح کی چمک تھی۔

کیا تم شادی شدہ ہو، اس نے مجھ سے براہ راست سوال کیا۔

میں نے بول کو جواب دینے کی بجائے محض انکار میں سر ہلا دیا۔

کیا تم نے اس کے پکڑے جانے کی اطلاع آگے فارورڈ کر دی ہے۔ اس بار اس نے کیپٹن راجندر سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

نہیں سوامی جی ابھی میں نے اس کے پکڑے جانے کی اطلاع آفس میں نہیں دی اس نے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔

تو پھر ٹھیک ہے اسے یہیں چھوڑ جاؤ، کل رات پونم ماشی ہے، کالی ماتا کی خصوصی پوجا بھی ہے اس پوجا میں ایک انسانی جان کی بلی دینی ہوتی ہے، تم نے میری مشکل آسان کر دی ہے تم بہت دھن بھاگیا ہو بوڑھے سوامی نے اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ جیسے آپ کی اِچھا سوامی جی، ویسے میرے علم میں تھا کہ کل رات پونم ماشی ہے اسی لیے میں نے اس کے ملنے کی اطلاع آفس میں نہیں کی اور اسے آپ کے پاس لے آیا، میں اور میرے سب ساتھی کالی ماں کے ہی پجاری ہیں، اس لیے یہ بات کسی طرح لیک نہیں ہو سکتی ہے کہ ہم اسے آپ کے پاس لائے ہیں۔ اور میں آپ کی دیا سے ہی آج اس مقام پر ہوں، کیپٹن راجندر نے پہلے سے بھی زیادہ مودبانہ انداز میں کہا۔

میں ہونقوں کی طرح باری باری ان کے مکروہ چہرے دیکھ رہا تھا، جیسے وہ کسی انسان کی بجائے جانور کو ذبح کرنے کی بات کر رہے ہوں۔

سر آپ مجھے ان کے پاس نہیں چھوڑ سکتے، مجھے اپنے آفس لے چلیں مجھ پر مقدمہ کریں عدالت میں پیش کر دا کر سزا دلوائیں جو دل کرتا ہے کریں مگر مجھے یہاں مت چھوڑ کر جائیں، میں نے انتہائی خوف زدہ لہجے میں کیپٹن راجندر کی منت کی۔

مگر میری بات کا جواب دینے کی بجائے اس نے مسکراتے ہوئے میرے گال تھپتھپائے اور بوڑھے سوامی کے ساتھ مندر کی طرف بڑھ گیا۔

جاتے ہوئے اس نے فوجیوں کو کچھ اشارہ کیا تو وہ میری طرف بڑھ آئے، ان کے ساتھ دو ہٹے کٹے پنڈت بھی تھے، جنہوں نے گیروے رنگ کی چادریں جسم پر لپیٹی ہوئی تھیں، وہ سب مجھے گھسیٹتے ہوئے مندر کے اندر لے آئے، اور کئی تنگ و تاریک راہداریوں سے گزرتے ہوئے ایک وسیع ہال میں پہنچ گئے، ہال کی ایک دیوار کے ساتھ کالی ماتا کا خوف ناک مجسمہ استادہ تھا، دیوی کی لمبی اور سرخ زبان منہ سے باہر لٹک رہی تھی، جبکہ بڑی بڑی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلی ہوئی تھی۔

اس کے گھٹنوں پر ایک نوجوان برہنہ لڑکی کی لاش کا مجسمہ بنا ہوا تھا، جس کی کٹی ہوئی شہہ رگ سے ٹپکتا ہوا خون دیوی کے قدموں پر گرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

دیوی کی عریانیت کو سونے کے زیورات سے چھپانے کی ناکام کوشش کی گئی تھی، اس کے سر پر رکھے ہوئے سونے کے بہت بڑے تاج کے درمیان ایک یاقوت فٹ کیا گیا تھا، جو بلا مبالغہ انتہائی نادر تھا، مجموعی طور پر دیوی کا مجسمہ رگوں میں لہو جما دینے والا منظر لیے ہوئے تھا۔

اس ہال میں سے عجیب سی سرانڈ آ رہی تھی، جس کی وجہ سے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا، میری نظر دیوی کے قدموں میں رکھے ہوئے پتھر پر پڑی تو ہال میں پھیلی ہوئی سرانڈ کی حقیقت بھی مجھ پر منکشف ہو گئی، پتھر اور اس کے ارد گرد خون کی کافی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی، جو سوکھ کر سیاہ ہو چکا تھا۔

مجھے بھی اس پتھر کے قریب گڈھے ہوئے کھونٹے سے باندھ دیا گیا، مجھے باندھنے کے بعد فوجی اور پنڈت وہاں سے چلے گئے۔

بے بسی سے میرے آنسو گرتے چلے جا رہے تھے، امی ابو شدت سے یاد آ رہے تھے، میں بلک بلک کر رونے لگا تھا، مجھے اپنی قضا آتی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی، میں بے اختیاری کے عالم میں سجدے میں گر گیا، اور اپنے رب سے گڑگڑا گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا، حالات کو دیکھتے ہوئے مجھ پر مایوسی انتہا درجے تک چھا چکی تھی، مجھے اپنے بچ جانے کی ایک فیصد امید بھی نہیں رہ گئی تھی، ایسے ہی سجدے میں پڑے ہوئے نجانے کتنا وقت گزر گیا۔

وہ ایک زوردار ٹھوکر تھی جو میری پسلیوں پر لگی تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

میرے سامنے وہی بوڑھا سوامی کھڑا تھا، اس کے ساتھ ایک انتہائی خوبصورت لڑکی تھی، جس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی۔

بدبخت یہاں صرف کالی ماں کی پوجا ہوتی ہے اور وہی یہاں کی حکمران ہے، تمہارا خدا یہاں کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر تمہارا رونا دھونا ہو گیا ہو تو یہ بھوجن کر لو، بوڑھے سوامی نے حقارت آمیز لہجے میں کہا تو اسی اثنا میں لڑکی نے کھانے کی ٹرے میرے سامنے رکھ دی، اور جس خاموشی سے آئی تھی ویسے ہی واپس مڑ گئی۔

سر پلیز مجھے معاف کر دیں میں ساری زندگی آپ کو دعائیں دوں گا،، میں ایک بار پھر منتیں کرنے لگا۔

مگر بوڑھا سوامی میری بات سننے کی بجائے کالی دیوی کے سامنے ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کر کے زیر لب کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

اچانک میری نظر اس کی کمر کے قریب دھوتی کی شکل میں بندھے ہوئے گیروے رنگ کی چادر پر پڑی اس میں وہی چابیاں اڑسی ہوئی تھی، جس تالے سے مجھے زنجیر کے ساتھ باندھا گیا تھا، چابیاں دیکھ کر میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا اسی خیال کے تحت میں نے نظروں سے ہی اپنے ہاتھوں اور دوسری طرف کھونٹے سے بندھی ہوئی زنجیر کی لمبائی ناپی اور پھر اپنے اور سوامی کے درمیانی فاصلے کا اندازہ لگایا۔

مجھے بات بنتی ہوئی نظر آئی، تو میں نے ابھی یا کبھی نہیں کے مصداق آگے بڑھتے ہوئے ہوا میں اچھلا اور دونوں پیروں کی قینچی سوامی کے گلے میں ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچا تو وہ ہڑبڑا کر ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا تو اس کی گردن میری ٹانگوں کے شکنجے سے نکل گئی۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، مجھے لگا کہ یہ لوگ میری اس حرکت کی وجہ سے پونم ماشی کی رات کا انتظار کیے بغیر ابھی کالی دیوی کے چرنوں میں میری بلی دے دیں گے۔

مگر قدرت کو شاید مجھ پر ترس آ گیا تھا۔

سوامی جو ایک جھٹکے سے گردن چھڑوا کر پیچھے ہٹا تھا اس کا پاؤں پھسلا تو میری طرف ہی آ گرا۔

میں نے بنا وقت ضائع کیے اپنے ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے ہاتھوں کو اس کے سر پر سے گزارتے ہوئے اس کی گردن پر شکنجہ فٹ کر دیا۔

یقینی موت کو سامنے دیکھ کر میرے اندر کا ڈر اور خوف ایک ایسے زہریلے سانپ کا روپ دھار چکا تھا جو اب کسی بھی راستہ روکنے والے کو ڈس سکتا تھا۔

اگر انہوں نے میری جان لینے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا تو میرا بھی حق بنتا تھا کہ میں روتے دھوتے ہوئے جان دینے کی بجائے اپنے دفاع کے لیے جو بن پاتا وہ کرتا۔

سوامی کا بوڑھا جسم میرے کسے ہوئے شکنجے میں ٹھیک سے پھڑ پھڑا بھی نہیں پا رہا تھا، چند منٹ میں ہی ایک جیتا جاگتا انسان ایک لاش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جب میں ہال سے باہر نکلا تو ہال کے دروازے کو میں نے وہی تالا لگا دیا جو میری ہتھکڑی کو لگا ہوا تھا، اس طرح شاید مجھے بھاگنے کے لیے کچھ وقت مل جاتا۔ اندھیری رہداریوں سے گزرتا ہوا بیرونی دروازے کے پاس پہنچا ہی تھا کہ اچانک ایک طرف سے وہی داسی نکل کے میرے سامنے آ گئی جو سوامی کے ساتھ مجھے کھانا دینے آئی تھی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر ہکی بکی سی رہ گئی، وہ بلاشبہ قدرت کا شہکار تھی، اس سے پہلے کہ میں اس کی گردن دبوچتا اسنے ہاتھ بڑھا کر بیرونی دروازے کی کنڈی کھول دی اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا تو میں حیرت سے سن ہو گیا، مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ دشمن ہوتے ہوئے بھی ایسا کیوں کر رہی تھی، اس نے ایک بار پھر مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا تو میں نے ہاتھ اٹھا کر سلیوٹ کے انداز میں سلام کیا اور دل میں اپنی اس محسنہ کے

لیے ممنویت کے جذبات لیے مندر سے باہر نکل آیا۔
اونٹ کھجوروں کے درختوں سے ویسے ہی بندھے ہوئے تھے، ان پر سے پالنے بھی نہیں اتارے گئے تھے، شاید فوجیوں نے یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا تھا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سب سے صحت مند اونٹ کی رسی کھول لی، اور پھر اس پر سوار ہوتے ہوئے اسے ہانک دیا۔

میں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا، مگر ہر طرف پر سکون خاموشی چھائی ہوئی تھی، کچھ دور آنے کے بعد میں نے اونٹ کی رفتار بڑھا دی، اور اسے ممکنہ حد تک تیز دوڑانے لگا، ابھی میں پہلے والے نخلستان کے قریب ہی پہنچا تھا جب مجھے اپنے عقب میں دوڑتے ہوئے اونٹوں کے سائے نظر آنے لگے، تو میرے اعصاب تن گئے، دشمن کو نا صرف میرے فرار کا علم ہو چکا تھا بلکہ وہ تو میرے سر پر پہنچے والے تھے، میں اونٹ کو پوری قوت سے پیٹنے لگا، تو اس نے اپنی رفتار بڑھا دی، اگلے کئی منٹ کی ریس میں وہ میرے انتہائی قریب پہنچ چکے تھے۔

سب سے آگے کیپٹن راجندر کا اونٹ تھا، وہ گالیاں بکنے کے ساتھ مجھے رکنے کا کہہ رہا تھا، مگر میں اونٹ کی رفتار کو کسی قیمت پر بھی کم نہیں ہونے دے رہا تھا۔ ان کے ہاتھ لگنے کا مطلب انتہائی دردناک موت کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

اچانک سامنے تھوڑے فاصلے پر کچھ روشنیاں حرکت کرتی ہوئی نظر آنے لگی، اور پھر جلد ہی بجھ گئیں، تو میں کنفیوز ہو گیا، کہیں یہ بھی انڈین آرمی تو نہیں یہ سوچ کر ہی میرا دل بیٹھنے لگا، اگر ایسا ہوتا تو اب تک کی تمام جدوجہد بیکار ہو جانی تھی۔

اسی لمحے میرے عقب سے گولیوں کا پورا برسٹ فائر کیا گیا تو ان میں سے کئی گولیاں میرے اونٹ کو لگیں تو وہ شدید تکلیف سے بلبلانے لگا، اور اس کی رفتار بھی نا ہونے کے برابر رہ گئی۔

ابھی سرحد نجانے کتنی دور تھی، میں نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھا اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا، اللہ مجھے بچا لے۔

کیپٹن راجندر کا اونٹ میرے برابر پہنچ چکا تھا اگلے ہی لمحے اس نے چھلانگ لگائی اور اڑتا ہوا مجھ پر آ گرا۔

ہم ایک دوسرے سے الجھتے ہوئے اونٹ سے نیچے ریت پر آ گرے، ابھی میں اٹھنے کوشش کر ہی رہا تھا، کہ کیپٹن راجندر کا جاندار پنچ میری پسلیوں پر لگا تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اس اندھیرے میں نیلے پیلے تارے گردش کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔

میں نے سر کو جھٹک کر اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کی مگر اس نے مجھے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ایک ہاف سپین راؤنڈ کک میرے سینے پر دے ماری تو میں ڈکراتا ہوا منہ کے بل ریت پر آ گرا، اسی وقت مجھے منہ بھر کر خون کی الٹی آئی اور میرا جسم تکلیف کی شدت سے کانپنے لگا۔

میرے ذہن پر اندھیرا غالب آتا جا رہا تھا، جسے میں بار بار سر جھٹک کر دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسی لمحے فضا ہیوی مشین گن کی فائرنگ سے گونج اٹھی، تو ہم دونوں حیرت سے اطراف میں دیکھنے لگے، کیونکہ اس فائرنگ سے کیپٹن راجندر کے ساتھی شکار ہو چکے تھے، جو بالکل ہمارے نزدیک پہنچ چکے تھے، وہ تینوں فوجی اور ان کے اونٹ ریت پر پڑے تڑپ رہے تھے۔

اسی لمحے ہمارے اردگرد موجود ریت کے ٹیلوں سے بے شمار فوجیوں نے نکل کر کیپٹن راجندر کو اپنے نشانے پر رکھ لیا۔ ان میں سے ایک فوجی میری قریب آیا اور مجھے کھڑا ہونے میں مدد دی تو میں اٹھ کھڑا ہوا وہ پاک فوج کا کیپٹن تھا۔

میں کیپٹن فاروق ہوں، تم ٹھیک ہو، اس نے انتہائی شفیق لہجے میں پوچھا، تو میں سر ہلا کر رہ گیا۔

اپنے ہاتھ سر پر رکھ کر نیچے لیٹ جاؤ کیپٹن فاروق نے راجندر کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ میں نے تو سنا تھا کہ پاکستانی فوجی بڑے بہادر ہوتے ہیں، مجھ نہتے کو گرفتار کر کے تم کونسا تیر مارو گے۔ کیپٹن راجندر نے طنزیہ انداز میں کہا، تو

دھاڑ مارنے کے انداز میں چیختا ہوا اس کی طرف بڑھا مگر کیپٹن فاروق نے مسکراتے ہوئے مجھے روک لیا۔ زندگی میں پہلی بار پوری معنویت کے ساتھ مجھے علم ہوا کہ اپنے گھر میں بلی شیر کیسے بن جاتی ہے۔

خود کو پاک شاہینوں کے درمیان پا کر میرا سارا ڈر اور خوف کافور ہو چکا تھا۔

تمہاری بہادری بھی ابھی میں نے دیکھی ہے۔ جو ایک بے بس سول نوجوان پر ظلم ڈھا کر خود کے سورما ہونے کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہو، کیپٹن فاروق نے سرد لہجے میں جواب دیا تو کھرا جواب سن کر کیپٹن راجندر نے چپ سادھ لی۔

صوبیدار صاحب میں اس چانکیائی گرو کے چیلے کو ایک چانس دے رہا ہوں تا کہ اگر اسے کوئی خوش فہمی ہے تو دور کر لے۔

اگر یہ مجھے فائٹ میں ہرا دے تو آپ لوگ اسے روکنے کی بجائے پورے پروٹوکول کے ساتھ واپس سرحد کراس کروا دیں گے۔

کیپٹن فاروق نے ایک طرف کھڑے صوبیدار سے مخاطب ہو کر کہا۔

یس سر، صوبیدار نے مختصر سا جواب دیا، تو کیپٹن فاروق آہستگی سے چلتے ہوئے راجندر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے رہے جیسے ایک دوسرے کو تول رہے ہوں، پھر اچانک راجندر کسی چھلاوے کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا اور جمپ بیک کک کیپٹن فاروق کے سینے پر مارنا چاہی، اس کی برق رفتاری بلاشبہ حیرت انگیز حد تک حیران کن تھی، اس سے پہلے کہ کک کیپٹن فاروق کے سینے پر لگتی وہ ہوا میں ہائی جمپ کے انداز میں اچھلا اور بیک فلیپ کرتے ہوئے ہوا میں گھوم گیا، اسی وقت راجندر کی ٹانگیں فضا میں گھومتے ہوئے کیپٹن فاروق کے ہاتھوں میں جکڑی گئیں، اگلے ہی لمحے جب کیپٹن فاروق گھوم کر سیدھا ریت پر کھڑا ہوا تو کیپٹن راجندر کی ٹانگیں اس کے مضبوط ہاتھوں میں جکڑی ہوئی تھی، جبکہ الٹا لٹکا ہوا راجندر بری طرح سے مچل رہا تھا کیپٹن فاروق ایک بار پھر فضا میں اچھلا اور پوری قوت سے راجندر کا سر نیچے مارا تو اسکا سر کندھوں تک ریت میں دھنستا چلا گیا وہ سر کو ریت میں سے باہر نکالنے کی کوشش میں تڑپتا رہا مگر کیپٹن فاروق نے اس وقت تک اس کی ٹانگیں نہیں چھوڑی جب تک اس کی مزاحمت دم نہیں توڑ گئی۔

کیپٹن راجندر کچھ دیر پہلے تک خود کو فرعون ثانی سمجھ رہا تھا، مگر میرے پاک وطن کے مردِ مجاہد نے اسے چند لمحوں میں دھول چٹوا دی تھی۔

کیپٹن فاروق جب اسکی ٹانگیں چھوڑ کر پیچھے ہٹا تو وہ زمین میں الٹا گڑا رہ گیا۔

تمہارے چچا نے تمہارے صحرا میں گم ہونے کی رپورٹ درج کروائی تھی، مگر کافی سرچ کے بعد بھی جب تم نہیں ملے تو غالب گمان یہی تھا کہ تم طوفان میں سمت کھو کر سرحد پار کر گئے ہو، اسی لیے ہم تمہارے واپس آنے کی مبہم سی امید پر الرٹ تھے، چلو یونٹ آفس میں تمہارے چچا اور کزن تمہارے بارے میں کسی خبر کے منتظر بیٹھے ہیں۔

کیپٹن فاروق نے تفصیل بتائی تو میں تشکر آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا، اور پھر آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ کا بوسہ لیا تو اس شیر دل انسان نے ہنستے ہوئے مجھے گلے لگا لیا۔

یونٹ آفس میں چچا جان اور اختر بھائی پریشان بیٹھے ہوئے تھے ان کے چہرے کا حال مجھ سے بھی زیادہ برا تھا مجھے دیکھتے ہی چچا جان اٹھ کھڑے ہوئے اور دوڑ کر مجھے گلے لگا لیا، خدا کا شکر ہے بیٹا تم مل گئے ورنہ میں اپنے بھائی کو کیا منہ دکھاتا۔

مجھے تو اللہ نے بچا لیا، اب اختر بھائی کا سوچیں کیا وہ یہ منہ دلہن کو دکھائیں گے، میری بات سن کر آفس قہقہوں سے گونج اٹھا۔

آج اس واقعے کو سالوں بیت چکے ہیں لیکن جب بھی مجھے وہ لمحے یاد آتے ہیں تو بے اختیار میری زبان پر شکرانے کے الفاظ جاری ہو جاتے ہیں سچ کہتے ہیں جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔

☆☆......☆☆

وہ مانگنے والی

نعیم ابرار کا خیال

> تلاشِ رزق میں رد کر کے خود کو
> یہاں ہر شخص آدھا ہو رہا ہے

نازیہ بتول رضا

اُس روز چھٹی کا دن تھا شوہر صاحب اپنے کسی دوست کے ساتھ ہاسپٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے' اس لیے رات کو ناشتہ نہیں آ سکا تھا' بچے ابھی اتنے بڑے نہیں تھے کہ انہیں سودا سلف لینے کے



لیے دکان بھیج سکوں' میں نے سوچا کہ دونوں بچوں کو ساتھ لے جا کر قریبی بیکری سے ناشتہ لے آؤں' سو اسی خیال کے تحت میں نے عبایا پہنا اور دونوں بچوں کو ساتھ لے کر نکلی' بیکری سے واپسی پر کیا دیکھتی ہوں کہ سامنے والے دروازے پر ایک عورت کچھ پیسوں کے لیے گڑگڑا رہی ہے اور سامنے والی عورت نے 'معاف کرو' کہہ کر دروازہ بند کر دیا' میرے قدم اس عورت کو دیکھ کر جم سے گئے تھے۔

وہ بہت کمزور اور نحیف سی لگ رہی تھی اور سب سے بڑھ کر اس کے الفاظ تھے جنہوں نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا تھا کہ میں چاہتے ہوئے بھی قدم آگے نہ بڑھا سکی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''مجھے میرے بچے کی تدفین کرنی ہے اس کے لیے پیسے مانگ رہی ہوں خدارا میری مدد کر دو۔'' میں اس کے الفاظ سن کر پتھر کی ہو گئی تھی' میری جگہ کوئی بھی نرم دل عورت ہوتی تو شاید اس کی حالت بھی میرے جیسی ہی ہوتی اور بقول میرے شوہر کے کہ میں کچھ زیادہ ہی رحم دل ہوں اور مجھے فوراً ہر کسی پر ترس آ جاتا ہے' جبکہ میری نند کہتی ہے کہ بھابی آپ کو تو کوئی بہت آرام سے بے وقوف بنا سکتا ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود میرا دل ہے کہ مانتا نہیں' میں کسی کی مدد کیے بنا نہیں رہ سکتی چاہے کچھ بھی ہو جائے کیا کروں اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اللہ پاک نے ایسا نرم دل دیا ہے جو کسی کی تکلیف نہیں دیکھ سکتا اور ہر کسی کی مدد کرنا چاہتا ہے' جس طرح بھی ممکن ہو۔ بہرحال میں خود اس عورت کی طرف بڑھی اور بڑی نرمی سے پوچھا۔

''کیا ہوا' کیا مسئلہ ہے مجھے بتاؤ؟''

''ارے باجی کیا بتاؤں کل میرا بیٹا مر گیا ہے' اب تک تدفین نہیں ہو سکی ہے' ہر ایک سے سوال کر رہی ہوں کہ خدارا میرے بچے کی تدفین کروا دو لیکن کوئی میری بات سننے کو تیار نہیں ہے سب بے حس ہیں۔'' وہ شکست خوردہ لہجے میں بول رہی تھی۔

اُس کے الفاظ مجھ پر بجلی بن کر گرے اور میرا دل ڈوبنے لگا' میں اس کا درد اپنے سینے میں محسوس کرنے لگی کیونکہ میں بھی ایک ماں ہوں ہوش و خرد نے میرا ساتھ چھوڑ دیا اور میں اسے تھام کر اپنے گھر کے اندر لے آئی مجھے اس پر بے انتہا ترس آ رہا تھا' ایک تو اس کا حال سے بے حال ہوتا وجود' جو تیز ہوا سے بھی اڑ جائے لگتا تھا جیسے دنوں کی بھوکی ہو اور پھر اس کا پہاڑ جیسا دکھ جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا میں اس کی ہر ممکن مدد کرنا چاہتی تھی۔

''تم یہاں تسلی سے بیٹھو میں تمہارے لیے پانی لاتی ہوں۔'' اس کے منع کرنے کے باوجود میں نے اسے زبردستی بٹھا کر پانی پلایا' اس نے آدھا گلاس پی کر چھوڑ دیا اور دیوار سے سر ٹکا لیا۔ میں اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گئی اور اس سے پوچھنے لگی۔

''اب مجھے بتاؤ کہ تمہارے بیٹے کو کیا ہوا تھا اس کا انتقال کیسے ہوا' کیا بیمار تھا؟''

اس نے ایک نظر مجھے دیکھا شاید میں پہلی عورت تھی جو اس سے اس کا حال دل پوچھ رہی تھی۔ اس کا درد بانٹ رہی تھی' اس کی آنکھوں میں بڑی حیرت تھی وہ گویا ہوئی۔

''کیا بتاؤں باجی ہم بہت غریب لوگ ہیں' میرا ایک ہی بیٹا تھا شایان نام تھا اس کا' گیارہ سال کا تھا میرا بیٹا کہ اچانک اسے بخار ہو گیا میں

اس کا علاج نہیں کرواسکی اور کل اُس کا انتقال ہوگیا۔'' اتنا کہہ کراس نے چہرہ چھپالیا۔

''ہائے میں اب تک اپنے بچے کی تدفین بھی نہیں کرسکی کتنی مجبور ہوں میں۔''

اس کے الفاظ تھے یا نشتر جو میرے دل میں پیوست ہوگئے' میرا دل دکھ سے بھرگیا اور آنکھوں سے اشک جاری ہوگئے' میں نے پوچھا۔

''تمہارا شوہر کیا کام کرتا ہے اور تمہارا کوئی عزیز رشتے دار نہیں ہے کیا جو تمہاری مدد کرسکتے تمہارا میکہ' سسرال......!''

''باجی میرا شوہر مزدوری کرتا ہے کبھی دیہاڑی مل جاتی ہے اور کبھی کئی کئی دن ہم ایسے ہی گزارہ کرتے ہیں' اور میرا کوئی بھی نہیں ہے صرف ایک بھائی ہے جو معذور ہے وہ بھی پنجاب سے آگیا ہے لیکن وہ میری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔''

''اور تمہارا بچہ اس وقت کہاں ہے تم تو یہاں ہو؟''

''وہ...... اُسے ایدھی میں رکھا ہے گھر میں کیسے رکھتی اس لیے سرد خانے میں اس کی لاش رکھوادی ہے تاکہ ہم کفن دفن کا انتظام کرسکیں۔''

اُس کی اس بات سے میں چونک گئی۔

''لیکن جس کے پاس کفن دفن کے پیسے نہ ہوں تو ایدھی والے خود سارا انتظام کرتے ہیں' تم نے اُن سے کہا نہیں۔'' میرے لہجے میں حیرت نمایاں تھی' ایدھی کی خدمات سے میں بے خبر نہیں تھی۔

''نہیں نہیں باجی' میں اپنے بچے کو خود کفن دینا چاہتی ہوں' بس اسی لیے لوگوں سے بھیک مانگ رہی ہوں میرا شوہر اور بھائی وہیں پر ہیں' میں پیسوں کا انتظام کرنے نکلی ہوں۔''

میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے' خدا کسی ماں کو اتنا مجبور نہ کرے کہ وہ اپنی اولاد کے کفن دفن کا انتظام بھی نہ کرسکے' میرا دل درد سے پھٹنے لگا مجھے اس ماں پر بے انتہا ترس آرہا تھا وہ کتنی بے بس تھی اُف! میں نے شدت غم سے روتے ہوئے اس عورت کو گلے لگایا اور ایسے روئی جیسے میرا کوئی عزیز مرگیا ہو۔

اُس عورت سے زیادہ میرے اشک بہہ رہے تھے' شاید اُس کے آنسو خشک ہوگئے تھے' میرے بچے حیرت سے مجھے تک رہے تھے' پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ اس عورت نے کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا بھوکی ہوگی' ظاہر ہے بیٹے کے غم میں اسے ناشتے کھانے کا ہوش کہاں ہوگا میں اٹھتے ہوئے بولی۔

''تم بیٹھو میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لاتی ہوں' تم بھوکی ہوگی ناں۔'' اُس نے میرا ہاتھ پکڑلیا۔

''نہیں باجی مجھے کچھ نہیں کھانا ہے مجھے بس پیسوں کا انتظام کرکے اپنے شایان کے پاس جانا ہے مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''ارے ایسے کیسے تم بھوکی پھروگی' کچھ کھاؤ مجھے پتہ ہے تم نے کچھ نہیں کھایا ہے تمہاری حالت بتارہی ہے کہ تم دنوں سے بھوکی ہو حالت دیکھو اپنی...... پلیز کچھ اپنا بھی خیال کرو کچھ کھالو۔'' میں نے اس سے التجا کی لیکن وہ نہ مانی۔

''نہیں باجی خدارا مجھے کھانے کے لیے نہ کہیں' آپ نے میری بات سنی میرے درد کو محسوس کیا' میرے لیے یہی کافی ہے بس میری کچھ مدد کردیں تاکہ میں جاؤں' ویسے بھی میرے حلق سے کچھ نہیں اترے گا جب تک میں اپنے شایان کی تدفین نہیں کردوں گی مجھے کچھ پیسے دے دیں بس......!''

وہ نقاہت سے بول رہی تھی' تھکن اور بھوک اس پر غلبہ پارہے تھے لیکن ان سب سے بڑھ کر اس کا غم تھا جو اسے تھکن اور بھوک کا احساس نہیں ہونے دے رہا تھا' اس کی حالت دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رورہا تھا۔

جی چاہ رہا تھا کہ اس کے سارے دکھ سمیٹ لوں اور میں نے دل میں تہیہ بھی کرلیا کہ میں اپنے شوہر سے کہہ کر آج ہی اس کے بیٹے کی تدفین کرواتی ہوں' لیکن اس عورت سے کچھ نہیں کہا میں نے اس کے ہاتھ پر کچھ پیسے رکھے اسے تسلیاں دیں' چلتے چلتے ایک بار پھر اسے گلے سے لگایا اور رخصت کیا۔

وہ میرے گھر سے نکل ہی رہی تھی کہ اوپر سے بھابی اتر آئیں (اُن دنوں میں کرائے پر رہتی تھی اوپر مالک مکان تھے' میں انہیں بھابی کہتی تھی اور وہ مجھے)

''ارے بھابی یہ کسے گھسا لیا ہے گھر میں یہ مانگنے والیاں ہیں اور......''

وہ اور بھی کچھ کہتیں میں نے اُن کی بات کاٹی۔

''نہیں بھابی یہ مانگنے والی نہیں ہے یہ تو ہماری ایک مجبور عورت ہے اپنے بچے کی تدفین کے لیے پیسے جمع کررہی ہے اور......''

اب انہوں نے میری بات کاٹی۔

''ارے بھابی تم نہیں جانتیں یہ لوگ بھیک مانگنے کے الگ الگ طریقے اور ہتھکنڈے آزماتے ہیں جس سے لوگ ان پر ترس کھائیں اور انہیں زیادہ سے زیادہ پیسے دیں' تم تو بہت بھولی ہو آرام سے تمہیں کوئی لوٹ کے لے جائے گا کسی دن۔'' پھر وہ اس عورت سے مخاطب ہوئیں۔

''لو بھئی تمہیں پیسے مل گئے ناں چلو نکلو یہاں سے۔'' مجھے بھابی کا یہ کہنا برا لگا میں نے ٹوک دیا۔

''خدارا بھابی ایسے نہ کہیں وہ ویسے ہی دکھی ہے۔'' اس عرصے میں وہ عورت کچھ نہ بولی تھی' مجھے حیرت بھی تھی کہ وہ اتنی تذلیل پر بھی خاموش ہے اس لیے میں اس کی طرف داری کررہی تھی۔

''ارے ان کے دکھ میں جانتی ہوں۔'' بھابی بولیں اور وہ عورت چپ چاپ باہر نکل گئی۔

اُس کی خاموش میرے دل پر مکے کی طرح لگی' میں بھابی سے بولی۔

''نہیں بھابی وہ واقعی میں دکھی تھی باقی اس کا دین ایمان جانے میں نے تو جو کیا انسانیت کے ناطے کیا باقی اللہ دیکھ رہا ہے اور میں لٹنے کے ڈر سے اپنے اندر سے انسانیت ختم نہیں کرسکتی' میرا دل نہیں مانتا کہ مجھ سے کوئی سوال کرے اور میں اسے خالی لوٹا دوں' جب میری نیت صاف ہے تو میرے ساتھ کچھ غلط نہیں ہوسکتا۔''

میں بڑے یقین سے بولی اور اندر آگئی' بھابی چپ چاپ اوپر چلی گئی تھیں۔

بچوں کو جیسے تیسے ناشتہ کروایا' دل بہت بھرا بھرا ہورہا تھا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے فون اٹھایا اور اپنے شوہر کو فون ملانے لگی' مجھے پتہ تھا وہ میری بات ضرور سمجھیں گے' بہرحال میں نے انہیں ساری بات بتائی بچے کا نام بتایا اور کہا کہ وہ فوری طور پر معلوم کرکے اس بچے کی تدفین کا بندوبست کریں۔

میں بہت جذباتی ہورہی تھی میرے شوہر حالت کی سنگینی کو سمجھ گئے کہ مجھے اس مسئلے کے حل ہونے تک سکون نہیں ملے گا' خود میرے شوہر بھی دردمند دل رکھتے ہیں اور ہر کسی کی مدد کے لیے

فوراً تیار ہو جاتے ہیں' سو وہ اس کام کے لیے بھی فوراً تیار ہو گئے اور بولے۔

''تم بے فکر رہو میں ابھی معلوم کرتا ہوں اور یہ تو نیکی کا کام ہے بس اب مطمئن ہو جاؤ میں ابھی آدھے گھنٹے بعد تم سے رابطہ کرتا ہوں او کے۔''

میں بولی۔

''پلیز رضا جلدی کچھ کریں۔''

''ہاں ہاں' تم بے فکر رہو یہ کام میں خود کردوں گا۔'' رضا نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا اور میں سولی پر لٹکی رہی۔

اُس عورت کا غم میں دل پر محسوس کر رہی تھی لیکن اپنے شوہر سے کہہ کر دل کو یہ اطمینان تھا کہ اب اس مسئلے کو خود میرے شوہر ہینڈل کر لیں گے لیکن وقت تھا کہ کاٹے نہیں کٹ رہا تھا' بہر حال تھوڑی دیر بعد ہی میرے فون کی بیل بجی میں نے فوراً ریسیو کیا لائن پر میرے شوہر تھے بولے۔

''تم نے بچے کا نام شایان بتایا تھا ناں؟''

''جی جی شایان نام ہے اُس کا' کچھ پتہ چلا؟'' میں بے صبری سے بولی۔

''دیکھو نازیہ میں اس وقت یہاں ایدھی سینٹر کے سرد خانے پر موجود ہوں' رجسٹر میرے سامنے ہے میں نے خود چیک کیا ہے' دو دن پہلے تو کیا پچھلے دس بارہ دن میں بھی ایسی کوئی انٹری نہیں ہے' اور پھر اگر ایسا کوئی غریب نادار ہوتا ہے تو اُس کے کفن دفن کا انتظام یہ لوگ خود کر دیتے ہیں تم بیکار میں صبح سے پریشان ہو رہی ہو' وہ عورت پیشہ ور بھکارن تھی جو تمہیں بے وقوف بنا کر پیسے لے گئی بہر حال کوئی بات نہیں تم پریشان مت ہو تمہاری تسلی کے لیے میں نے خود رجسٹر چیک کیا ہے یہاں ایسا کوئی بچہ نہیں ہے تم ایسا کرو دوا کھا کر تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ۔''

''لیکن رضا وہ عورت.....'' میری سوئی وہیں اٹکی تھی۔

''ارے وہ عورت دھوکے باز تھی' تم سے جھوٹ بول کے پیسے لے گئی' اب تم اسے چھوڑو اور اپنی طبیعت دیکھو میں بس گھر پہنچ رہا ہوں او کے۔'' یہ کہہ کر رضا نے فون رکھ دیا لیکن میرا دل ماننے کو تیار نہ تھا ایک پل کو مجھے لگا کہ شاید رضا نے مجھے تسلی دینے کو جھوٹ بول دیا ہو' لیکن فوراً اس خیال کی نفی بھی کر دی۔

نہیں نہیں رضا میرے ساتھ جھوٹ نہیں بول سکتے اور پھر وہ تو خود اس طرح کی نیکی کرنے کا موقع ڈھونڈتے ہیں' وہ بھلا کیوں جھوٹ بولیں گے' تو پھر کیا وہ عورت جھوٹ بول رہی تھی تو کیا کوئی بھیک مانگنے کے لیے اس حد تک بھی جا سکتا ہے؟ میرا ذہن اُلجھنے لگا تھوڑی دیر میں رضا بھی آ گئے اور آ کر مجھے نئے سرے سے ساری تفصیل بتائی اور تسلی دینے لگے۔

''نازیہ تم نہیں جانتیں یہ مانگنے والے نئے نئے طریقے سوچتے ہیں' جس سے لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں ان پر ترس کھائیں' اور انہیں زیادہ سے زیادہ بھیک ملے' یہ تو ایسا کارِ خیر ہے کہ گلی محلے کے لوگ خود کفن دفن کا انتظام کر دیتے ہیں اور پھر کبھی تم نے سنا کہ فلاں شخص کی باڈی محض اس لیے سرد خانے میں رکھی ہے کہ اس کے کفن دفن کا انتظام نہیں ہو سکا؟'' وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

میری گردن خود بخود نفی میں گھوم گئی واقعی میری عقل بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی تھی اس عورت نے جیسے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب کر لی تھی' میں اس کی ہر بات مانتی چلی گئی لیکن میرا دل تھا کہ سنبھلنے میں ہی نہیں آ رہا تھا لیکن رضا کے

سامنے میں نے خود کو سنبھال لیا وہ میری وجہ سے کافی فکر مند ہو رہے تھے کیونکہ میں ڈپریشن کی مریضہ ہوں اور ہر بات کو سر پر سوار کر لیتی ہوں' یہ بات بھی جیسے میرے دماغ میں چپک کر رہ گئی تھی۔

''دوائی کھائی تم نے؟''

''نہیں.....'' میں نے جواب دیا تو وہ بولے۔

''رکو میں خود ہی کھلاتا ہوں تمہیں دوائی۔''

پھر رضا نے مجھے خود ہی دوائی کھلائی اور مجھے سونے کی تاکید کرتے کمرے سے چلے گئے تاکہ میں سو جاؤں' لیکن میں اس قدر ٹینشن میں تھی کہ دوا کھا کر بھی مجھے نیند نہیں آ سکی۔

رات ہوتے ہوتے میری طبیعت کافی خراب ہو گئی تو رضا مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے ڈاکٹر نے بھی پوچھا۔

''کس بات کا اسٹریس ہے کیا آپس میں جھگڑا ہوا ہے؟''

''ارے نہیں ڈاکٹر صاحب بس ہماری بیگم نے دنیا بھر کی ٹینشن لینے کا ذمہ لے رکھا ہے۔'' رضا ہنستے ہوئے بولے پھر ڈاکٹر کو مختصراً ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو ڈاکٹر صاحب بھی ہنستے ہوئے بولے تھے۔

''یہ سب پیشہ ور مانگنے والے ہوتے ہیں اور سب کا طریقہ الگ ہے' آپ تو بڑے آرام سے بیوقوف بن گئیں۔''

''بس ڈاکٹر صاحب میں تو انہیں سمجھا سمجھا کے تھک چکا ہوں لیکن یہ ہیں کہ ہر کسی کے لیے سیریس ہو کر اپنی طبیعت خراب کر لیتی ہیں۔''

''گھبرانے کی بات نہیں تھوڑا اسٹریس ہے میں ایک انجکشن لگوا دیتا ہوں اور یہ سکون کی دوا ہے یہ کھا کر سکون سے سو جائیں' سب ٹھیک ہے آئندہ کسی مانگنے والے کی اسٹوری کو سر پر سوار مت کیجیے گا او کے۔'' ڈاکٹر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا تھا تو میں جھینپ گئی تھی۔

☆......☆......☆

اس واقعے کے بعد سب نے میرا بہت مذاق اڑایا مجھے بے وقوف کہا لیکن میں نے ہنس کر ٹال دیا اور پھر اِس بات کو ہوئے بہت سارے دن گزر گئے' میں نے وہ کرائے کا گھر چھوڑ دیا اور دوسرے گھر میں شفٹ ہو گئی۔

ہمارا اپنا گھر تیار ہو رہا تھا تب تک ہمیں کرائے پر رہنا تھا اس بات کو تقریباً سات آٹھ ماہ گزر چکے تھے کہ ایک دن جیسے پھر وہ دن پلٹ کر آ گیا جب مجھے رضا کی اور سب کی باتیں سچ لگنے لگیں کہ یہ لوگ واقعی الگ الگ طریقے سے مانگ کر سب کو بے وقوف بناتے ہیں۔

ہوا یوں کہ ایک دن دوپہر کے وقت میں نماز سے فارغ ہو کر دعا مانگ رہی تھی کہ میری بیٹی آمنہ دوڑتی ہوئی آئی۔

''ماما جلدی چلیں دیکھیں وہی عورت ہمارے دروازے پر آئی ہے جس نے آپ کو بے وقوف بنایا تھا۔'' وہ بہت جلدی میں تھی میرا ہاتھ پکڑ کر دروازے تک لائی میں نے پوچھا۔

''کون عورت؟'' میں اُسے بالکل بھول چکی تھی۔

''آپ خود دیکھ لیں۔'' آمنہ نے کہا میں نے سوچا شاید میرے بچے مجھ سے زیادہ سمجھدار ہیں اور اس بات پر یقین بھی آ گیا' جب اسی عورت کو میں نے اپنے سامنے دیکھا اس چہرے کو میں بھلا کیسے بھول سکتی تھی۔

''تم.....؟'' الفاظ میرے منہ میں ہی تھے کہ

اس نے بولنا شروع کر دیا۔

''باجی خدارا میری مدد کر دو میری بیٹی بیمار ہے اور بھوکی بھی ہے۔''

میں نے کہا۔

''تم وہی ہو ناں جس کے بیٹے کا انتقال ہو گیا تھا' شایان نام تھا ناں تمہارے بیٹے کا جو ایدھی سینٹر میں تھا اور تم اس کی تدفین کے لیے پیسے مانگ رہی تھیں۔''

میں عام سے لہجے میں بول رہی تھی مجھے لگا وہ ابھی اقرار کر لے گی وہ بھی مجھے پہچان چکی تھی' میرے الفاظ سے اسے سب یاد آ گیا اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا شاید اُسے لگا ہو کہ میں اسے پکڑ لوں گی دھوکہ دہی کے چکر میں پولیس کو دے دوں گی فوراً گڑ بڑا کر بولی۔

''نہیں نہیں باجی' میرا تو کوئی بیٹا نہیں ہے میری تو ایک بیٹی ہے آپ کے پاس کوئی اور آیا ہو گا۔''

صاف لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے' میں سب جانتی تھی لیکن میں نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا خاموشی سے اس کے ہاتھ پر پیسے رکھے بس اتنا کہا۔

''جھوٹ مت بولا کرو میں جانتی ہوں تم وہی ہو۔''

وہ عورت آگے سے کچھ نہ بولی جلدی سے پیسے لیے اور گلی سے نکلتی چلی گئی کہیں نہیں رکی وہ بس بھاگنا چاہتی تھی کیونکہ اس کی پول کھل چکی تھی اور بچے مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''ماما یہ وہی عورت تھی۔''

''ہاں بیٹا میں جانتی ہوں۔''

''آپ نے اسے جانے کیوں دیا' اور پیسے بھی دے دیے' یہ عورتوں کو اور لوگوں کو بے وقوف بناتی ہے جھوٹ بول کر پیسے لیتی ہے اور......'' بچے جذباتی ہو رہے تھے کیونکہ بچوں کے سامنے اس کا جھوٹ پکڑا گیا تھا۔

''بیٹا میں نے اللہ کی رضا کے لیے اسے پیسے دیے ہیں اب یہ اس کا ایمان ہے کہ وہ اپنے بچوں کے بارے میں جھوٹ بول کر پیسے لیتی ہے یا کیا پتہ اسے واقعی ضرورت ہو' ہم کون ہوتے ہیں یہ طے کرنے والے کہ کون مستحق ہے اور کون نہیں' ہمیں بھی تو اللہ پاک نے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے کیا ہم اس کے مستحق ہیں؟''

میرے کہنے پر بچوں نے خاموشی سے سر جھکا لیے میں اپنے بچوں کی تربیت کر رہی تھی اس لیے مزید کہا۔

''اور بیٹا ہمیشہ یاد رکھنا اپنے دروازے سے کبھی کسی کو خالی نہ لوٹانا اللہ پاک جسے چنتا ہے اسی کے دروازے پر اپنی مخلوق کو بھیجتا ہے' شاید اللہ پاک ہمارے ذریعے سے اپنی مخلوق کی مدد کروانا چاہتا ہو اور پھر ہم کسی پر احسان تو نہیں کر رہے ناں جو کچھ دیتے ہیں اللہ کے عطا کردہ مال میں سے دیتے ہیں' اب یہ مانگنے والے پر منحصر ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے یا سچ ہمارا کام تو مخلوقِ خدا کی خدمت ہے جس طرح اہلِ بیت اطہار (علیہم السلام) نے اپنے دروازے سے کبھی کسی کو خالی نہیں لوٹایا تو ہم بھی انہی کے پیروکار ہیں' ہم کسی کو خالی کیسے لوٹا دیں پھر چاہے وہ سائل دھوکہ دینے والا ہی کیوں نہ ہو۔''

میری باتیں بچوں نے خاموشی سے سنیں ان کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ ان کی ماں بے وقوف نہیں ہے۔

''آپ کیا کہتے ہیں؟؟؟''

☆☆......☆☆



ابرار حسین اکبر کا خیال

> اِس سے بڑھ کر بھی قیامت کیا ہو گی
> اب تو ہر شخص کے تیور ہیں خداؤں والے

مہر پرویز احمد دولو

حلیمہ غریب والدین کی بیٹی تھی' پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن سب سے بڑی ہونے کے ناطے بھائیوں کی دیکھ بھال' کھانا پینا اور والدین کے ساتھ مل کر کمانا اُس کی ذمے داری تھی۔ یہ



خاندان شروع دن سے سخت محنت مزدوری کر کے گھر کا چولہا گرم رکھنے کی ناکام کوشش کرتا آ رہا تھا۔ حلیمہ جب شعور کی عمر کو پہنچی تو ماں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ اب حلیمہ ذمے داریوں کی سوجھ بوجھ حاصل کر چکی تھی۔ سردی کے موسم میں علی الصبح منہ اندھیرے ٹھٹھرتی بغیر ناشتہ کیے ماں کے ساتھ کپاس کی چنائی پر جاتی۔ سارا دن کی مزدوری ہزار پندرہ سو بن جاتی بہت اچھا گزارا ہونے لگا۔

گرمی کے موسم میں حلیمہ آلو کی چنائی کے لیے گاؤں کی مزدور عورتوں کے ساتھ جاتی۔ شام تک پانچ سو مل جاتے ابھی یہ مزدوری جاری ہوتی کہ مزدور خواتین مکئی کے بھٹے توڑنے کا ٹھیکہ لے لیتیں، اسی دوران دھان کی پنیری لگانے کا موسم آ جاتا، یوں خواتین دن رات روپے لینے کے لیے کھیتوں میں جاتیں۔

روپے کی ریل پیل ہونے پر گاؤں کی مزدوری کی دھوپ میں سلگنے والی بانکی ناریوں نے بھی پر پُرزے نکالنے شروع کر دیے۔ نازونعم میں پلی حسین دوشیزاؤں کی طرح رنگ و روپ نکالنا شروع کر دیا۔ جن گھروں میں ٹیلی ویژن تھے انہوں نے کریموں کے اشتہار دیکھے تو خوبصورت بننے کے لیے ان کا استعمال شروع کر دیا۔ رنگ برنگے کپڑے پہن کر صبح جب کام پر جانے کے لیے زمیندار کی طرف سے بھیجی گئی ٹرالی میں بیٹھتیں تو یوں لگتا جیسے بہار کا موسم آ گیا ہو اور سارے موسم کی رعنائیاں ٹرالی میں اتر آئی ہوں۔

ہاتھوں میں سونے کی انگوٹھیاں، ناک میں کوکے، پاؤں میں پازیب کی چھنکار، ہاتھ میں موبائل یوں لگتا مزدوری کی بجائے فضائی میزبانی کے لیے جہاز پر ڈیوٹی کرنے جا رہی ہوں، کچھ غیور والدین بچیوں کو تنہا مزدوری پر جانے سے منع کرتے، لیکن غربت کے ہاتھوں شرمندہ ہو کر اور کچھ بغاوت کے ڈر سے خاموش ہو کر شام کو ملنے والی مزدوری وصول کر کے شکر ادا کرتے۔ ان بچیوں میں حلیمہ بھی شامل تھی، جس کے ہاتھ بھی محنت کے کیچڑ میں لتھڑ چکے تھے، مگر اس نے ہار نہ مانی تھی لیکن جوانی کی عمر والدین کی غیرت کو للکار رہی تھی، پانچ بھائی بہن کی کمائی پر کب تک عیش کرتے، والدین کو اس کے بیاہ کا خیال آ ہی گیا تھا۔

حلیمہ کا ایک دور پار کا رشتے دار خادم سوتیلی ماں کے شر سے بچنے کے لیے دوست احباب کے پاس رہ کر زندگی کی گھڑیاں گزار رہا تھا، باپ بیوی کے خوف سے اس کے بارے میں کچھ نہ سوچ سکا، ماموں کو بھانجے کا خیال آیا، گھر بلایا کچھ بھیڑ بکریاں خرید کر دیں، خادم در در کے دھکے کھا کر تنگ آ چکا تھا، دل لگا کر کام کرنے لگا، صبح ریوڑ لے کر نکلتا، سارا دن چراتا، دن چھپے واپس آتا، اس کی محنت رنگ لائی کچھ بکریوں کو بیچ کر خوبصورت گھر بنایا، چند ٹکڑے زمین خریدی اور اب اچھی زندگی گزارنے لگا، مگر جب بھی رشتے کے لیے کہیں بات چلتی تو سوتیلی ماں کے خوف کی وجہ سے کوئی رشتہ نہ دیتا، خوشحال نوجوان کو دیکھ کر حلیمہ کے والدین کے منہ میں پانی بھر آیا۔ سو کچھ رقم اور چند بکریوں کے عوض حلیمہ کا رشتہ خادم سے طے کر دیا گیا۔

☆......☆......☆

زندگی کی دھوپ چھاؤں میں حلیمہ اور خادم دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے والدین بن گئے، تینوں بچوں کو اسکول کی تعلیم دلوائی گئی، حلیمہ غربت کی گود میں پل کر جوان ہوئی تھی اب نہ صرف تین بچوں

کی ماں بلکہ خوشحال گھرانے کی سربراہ تھی، یوں دولت کے آ جانے سے آنکھیں ماتھے پر نکل آئیں۔ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتی، کسی کو خاطر میں نہ لاتی، دولت پر غرور کرتی ہمسائے اور رشتے داروں سے روزانہ لڑائی کرتی، میکے والوں کی مدد کرتی رہتی، سسرالی رشتے داروں میں سے کوئی بھی ایک آنکھ نہ بھاتا، اس کے شر سے بچنے کے لیے لوگوں نے راستہ بدل لیا، مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا......! مگر آنکھیں اُس وقت کھلیں جب جوان اولاد کے لیے رشتوں کی بھاگ دوڑ شروع ہوئی، اس کی بدزبانی، تکبر اور بلاوجہ لڑائی جھگڑا رنگ دکھانے لگا۔

اُن کے ہاں وٹے سٹے کا رواج تھا، مگر اس کی بیٹی کو مفت بھی لینے سے قریبی برادری نے انکار کر دیا۔ جب کہیں بھی بات نہ بنی تو حلیمہ ایک پیر صاحب کے حضور پہنچ گئی اور رشتے کے لیے نذرانے کے عوض التجا کرنے لگی، پیر صاحب کا ایک کلاس فیلو دوست تھا۔ اچھے دور میں میٹرک کرنے کے بعد سرکاری ملازم ہو گیا، والدین کا سر فخر سے بلند ہو گیا کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ جب شادی کی عمر کو پہنچا تو اُس کے معیار کی کوئی لڑکی برادری میں نہ تھی، کیونکہ اس برادری میں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج نہ تھا، اَن پڑھ لڑکی سے باؤ جی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یوں جوانی سے بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھا اور آخر کار دوست پیر صاحب کی منت سماجت کی جب حلیمہ بیٹی کے رشتے کے لیے تعویذ لینے آئی تو پیر صاحب کی چاندی ہو گئی، انہوں نے دونوں گھرانوں سے منہ مانگی قیمت وصول کر کے رشتہ کروا دیا۔

کچھ دن گزرے تھے کہ حلیمہ نے داماد سے مطالبہ کیا۔

''میری بیٹی کے نام دس مرلے کا پلاٹ شہر سے لگواؤ، وگرنہ میں بیٹی کو تمہارے پاس نہیں رہنے دوں گی۔'' داماد نے بیوی کو اس کی ماں کا مطالبہ سنایا۔ بیٹی نے ماں کو بلوایا تھا۔

''امی جان! تمہاری بدزبانی، لڑائی جھگڑے اور نخوت کی وجہ سے میری کسی رشتے دار سے شادی نہیں ہو سکی، آپ کی مرضی اور خواہش پر یہ شادی ہوئی ہے، یہ اچھے ہیں یا برے، جوان ہیں یا بوڑھے، مجھے ہر حال میں قبول ہیں، میرا اُن سے کوئی مطالبہ نہیں، خدا کے لیے اب مجھے سکون سے زندگی گزارنے دو، میں اِن کے ساتھ بہت خوش ہوں، آپ آئندہ ہمارے معاملات میں دخل نہ دیں۔'' بیٹی کے جواب نے ماں کو دن میں تارے دکھا دیے تھے۔

اب تو حلیمہ فوراً ہی رشتہ کروانے والے پیر صاحب کے پاس پہنچی اُس نے دوست کو بلوایا۔ صلح صفائی کے لیے نذرانہ طلب کیا اور ساس کی طرف سے بہت سی دھمکیاں دیں۔ دوست نے کہا۔

''پیر صاحب! میں تم کو اچھی طرح جانتا ہوں تم اسکول جانے کی بجائے سارا دن کبوتر اڑاتے تھے روپے پیسے کی ریل پیل ہونے کے ناطے تم نے لڑکیوں پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے پھر آئے دن بھنورا بن کر پھولوں کا رس چوسنے لگے، اب تم نے پیری مریدی کا ڈھونگ رچا رکھا ہے اور اب بھی خوبصورت عورتوں سے رنگ رلیاں مناتے ہو اور پیسے لے کر دوستوں کو بھی اس گناہ میں شامل کرتے ہو۔ میں اور میری بیوی خوش ہیں تمہارے جی میں جو مرضی آئے کرو میری طرف سے ایک دھیلہ بھی نہیں ملے گا۔ جہاں تک میری

ساس کا تعلق ہے تو وہ اگر اتنی ہی اچھی ہوتی تو اپنی برادری میں رشتہ کر لیتی میری منت اس نے ضرور کرنی تھی۔ اس کو بولو اگر بیٹی اس کا کہا مانتی ہے تو بے شک لے جائے میں اور شادی کرلوں گا۔“ اِس منہ توڑ جواب نے پیر جی اور حلیمہ کی بولتی بند کر دی تھی۔

اب حلیمہ بیٹوں کے رشتے کے لیے بیقرار ہوگئی' بڑے بیٹے کو اس لیے رشتہ نہ مل سکا کہ وہ بے روزگار تھا' چھوٹا بیٹا سرکاری ملازم ہوگیا تھا۔ لیکن حلیمہ کی بدزبانی نے کہیں بھی رشتہ نہ ہونے دیا۔ وہ ایک بار پھر پیر صاحب کے حضور پہنچ گئی۔

اب کی بار پیر صاحب نے ایک ایسی لڑکی کا انتخاب کیا جو پیر صاحب کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچ گئی تھی اور جہاں اس کی شادی ہوئی تھی اس کے خاوند کو تلاش کر کے پیر صاحب نے جھوٹی کرامات دکھا کر اپنا گرویدہ بنالیا' بیوی کو ایک رات اپنے پاس چھوڑنے کو کہا۔

”تم کو بیٹا ہوگا عمل کے لیے تمہیں بیوی ایک رات میرے حوالے کرنی ہوگی۔“

اُس نے جب یہ بات بیوی کو بتائی تو وہ ساتھ چل پڑی۔ جب پیر صاحب کے حضور پہنچی تو دیگر مریدنیوں کے سامنے کہا۔

”یہ پیر صاحب! جن نکالنے کے بہانے مجھے ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میری شادی ہوگئی ہے اب ایک بار پھر یہ منحوس مجھے ہوس کا شکار کرنا چاہتا ہے بدلے میں مجھے بیٹا ملے گا' اولاد اور رزق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے' میں اس کے منہ پر تھوکتی ہوں۔“ اور پھر دونوں ہاتھوں سے پیر صاحب کو تابڑ توڑ مارنا شروع کر دیا۔

پیر صاحب' مرید' مریدنیاں سخت غصے میں آ گئے اور پیر کے مرید نے اسے وہیں طلاق دے دی تھی اِس واقعے کے بعد اُس لڑکی کی ماں کئی بار معافی مانگ چکی تھی اور رشتے کے لیے منت سماجت کر چکی تھی۔ سو پیر صاحب اسی لڑکی کو انتقام کا نشانہ بنانے کے لیے حلیمہ جیسی لڑاکا کرخت ساس کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ دونوں گھرانوں کی ہاں سے جلد ہی رشتہ طے ہوگیا تھا۔

شادی کے ایک ہفتے بعد ہی حلیمہ کی جبلی نفرت عود کر آئی' بہو کو سابقہ شادی' پیر صاحب اور جانے انجانے نوجوانوں کے طعنے دینے لگی' پہلی شادی میں تین چار بچے کھاتے میں ڈال دیے' غرض اس کا جینا حرام کر دیا' اس نے تنگ آ کر تمام صورتِ حال خاوند کو بتائی۔ بیٹے نے جب ماں سے بات کی تو وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

”یہ کلموہی بہت بدکردار ہے' اس کے میکے سے نوجوان اسے ملنے آتے ہیں' گاؤں کے کئی لڑکے ہماری گلی کے چکر لگاتے ہیں' یہ بہت بدکردار ہے' اگر عزت درکار ہے تو اس کو طلاق دے دو۔“ بیٹا ماں کی باتوں میں آ گیا اور بیوی کو طلاق دے دی۔

طلاق ہونے کی دیر تھی کہ پورا گاؤں حلیمہ کا مخالف ہوگیا' کئی لوگوں نے تو گھر آنے سے منع کر دیا' نئی صورتِ حال سے حلیمہ بہت پریشان ہوگئی' وہ امید کے سہارے ناؤ کنارے لگانے کے لیے ایک بار پھر پیر صاحب کے حضور پیش ہوئی' اپنی کارروائی اور گاؤں والوں کی نفرت سے آگاہ کیا۔ نذرانہ وصول کرتے ہی پیر صاحب نے فتویٰ جاری کر دیا۔ مطلقہ ایک بار پھر حلیمہ کی بہو بن کر گھر آ گئی۔ حلیمہ نے چند دن تو برداشت کیا مگر پھر حسد کی آگ میں جلنے لگی۔ بہت سے الزامات' بہتان' من گھڑت کہانیاں بہو کے

خلاف بیٹے کو سنائیں' مگر اب کی بار بیٹے نے اس روز روز کے جھنجٹ سے جان چھڑانے کے لیے دوسرے شہر تبادلہ کروالیا اور بیوی کو بھی ساتھ لے گیا' اب وہ پانچ نوجوانوں کا باپ ہے لیکن جس دن گیا تھا اس دن کے بعد پلٹ کر گاؤں نہیں آیا۔

بڑا بیٹا پڑھا لکھا تھا اس کو بھی سرکاری ملازمت مل گئی۔ بہو کی تلاش میں حلیمہ سرگرداں پھرنے لگی' مگر لوگ تو اس کے سائے سے بھی توبہ توبہ کر کے دور بھاگتے تھے رشتہ کون دیتا' بیٹے کے ایک قریبی دوست کو ترس آیا اور اس نے اپنی سالی کا رشتہ لے کر دیا۔

گھر میں دلہن آتے ہی حلیمہ تو پھر بپھر گئی۔ دلہن کبھی میکے کبھی سسرال' دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ اس دوران ایک بیٹے کی ماں بن گئی' پوتے کی پیدائش کی خبر سنتے ہی حلیمہ پر غشی طاری ہوگئی' ہوش میں آتی تو منہ پر پلو ڈال کر بین کر کے رونے لگتی۔

مبارکباد دینے والی خواتین نے وجہ پوچھی تو بولی۔

”میری بہو بہت بدکردار ہے آوارہ پھرتی ہے' بدتمیز اور بے حیا ہے اب بیٹا ہوگیا ہے تو اس کو میرا بیٹا طلاق نہیں دے گا' اسی وجہ سے رو رہی ہوں۔“

پھر تو حلیمہ نے گھر کو جہنم بنا دیا۔ بہو بیچاری بیٹے کے ساتھ کبھی میکے کبھی سسرال' لیکن ایک بار پھر حلیمہ جیت گئی اور بہو کو طلاق دلوانے میں کامیاب ہوگئی۔ طلاق ہوتے ہی پھر رشتے کی تلاش شروع ہوگئی اور اس بار سگی بھتیجی کا انتخاب کیا تھا۔

شادی کے کچھ روز بعد جب بہو مکلاوے گئی ہوئی تھی بھائی کو پیغام بھیجا بیٹی کو ادھر نہ بھیجنا۔ یہ تو بہت ہی بدکردار' آوارہ اور عیاش لڑکی ہے' میں ایسی لڑکی کو اپنے گھر برداشت نہیں کر سکتی۔“

بہن بھائی کا جھگڑا پورا سال چلتا رہا' سال بعد ایک بار پھر بہو کو طلاق دلوانے میں کامیاب ہوگئی۔ مگر چند دن بعد ہی سخت پریشان ہوگئی رونا دھونا وطیرہ بنالیا' دن رات آہیں بھرتی' ڈکراتی' سینے پر دوہتڑ مارتی' رو رو کر بے ہوش ہو جاتی۔

”بیٹا میں مر گئی تو میرے بعد تم کو کھانا کون پکا کر دے گا تمہارے کپڑے کون دھوئے گا بروقت تیار کر کے ڈیوٹی پر کون بھیجے گا' اب کی بار تو کوئی لولی لنگڑی' اندھی' بہری لڑکی مل جائے اسے ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھوں گی کسی قسم کا دکھ' پریشانی نہیں آنے دوں گی۔“

ایک بار پھر اُس کی سنی گئی اور طلاق یافتہ لڑکی کا رشتہ مل گیا مگر رشتہ ملنے کی دیر تھی کہ حلیمہ کی پرانی رعونت عود کر آئی۔ لڑکی کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیا گیا۔ لڑکی نے صورتِ حال خاوند کو بتائی تو اس نے ماں کو سمجھایا۔

”امی جان! بھائی بیوی کو آپ کے کہنے پر طلاق دے چکا ہے' میں آپ کی خوشنودی کے لیے دو بیویوں کو بلاوجہ طلاق دے چکا ہوں' خدارا اب جانے دیں اور میرا گھر مت اجاڑیں۔“

یہ بات سنتے ہی ماں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

”اِس کا مطلب ہے تم اس کو طلاق نہیں دینا چاہتے' میں تم کو اپنا دودھ نہیں بخشوں گی' میرے پاؤں تلے جنت ہے وہ جنت تم کو نہیں دوں گی پوری برادری میں تم کو بے عزت کروں گی تمہارے دوستوں کو بتاؤں گی کہ یہ میرا گستاخ ہے' میرا کہنا نہیں مانتا اور جو ماں کا کہنا نہیں مانتا وہ

مسلمان نہیں۔‘‘

’’ماں تم جو مرضی کرو اب اس بیوی کو طلاق نہیں دوں گا۔‘‘ بیٹے نے جواب دیا۔ حلیمہ نے الزامات اور بہتانوں کی موسلا دھار بارش بہو پر کر دی‘ مگر بیٹے نے کچھ بھی ماننے سے انکار کر دیا۔ جب کسی صورت طلاق ہوتے نظر نہ آئی تو ایک بار پھر حلیمہ پیر صاحب کے حضور پہنچ گئی۔

’’حضور! آپ کے طفیل میں تین بہوؤں کو طلاق دلوا چکی ہوں‘ لیکن چوتھی بہو نے مجھے للکارا ہے کہ مجھے گھر سے نکال کر دیکھو جان تو چلی جائے گی۔ مگر طلاق لوں گی نہ ہی گھر سے جاؤں گی‘ جتنا زور لگتا ہے لگا لو۔‘‘

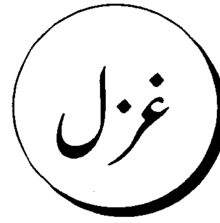
’’میں بھی جان سے تو گزر جاؤں گی مگر اس کو طلاق لازمی دلواؤں گی‘ آپ جتنا مرضی ہدیہ لیں لیکن میرا یہ کام لازمی کریں۔‘‘ حلیمہ نے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی تھی۔

پیر صاحب جوش میں آ گئے۔

’’اب کی بار ایسا عمل کروں گا تیرے بیٹے اور بہو کو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا‘ میرے عمل اور چلے کے ساتھ ساتھ کچھ تم کو بھی کرنا پڑے گا۔ جب بیٹا گھر میں موجود نہ ہو تو بہو کی چٹیا پکڑ کر مارنا‘ اتنا مارنا کہ لہولہان ہو جائے‘ اِس دوران وہ تمہارے آگے ہاتھ نہیں اٹھائے گی‘ اُس کی آنکھوں کی روشنی ختم ہو جائے گی‘ زبان گونگی ہو جائے گی اُس کی آواز ختم ہو جائے گی‘ تم جی بھر کر اسے مارنا وہ خود ہی گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گی۔‘‘

اُس روز بیٹا شہر گیا ہوا تھا‘ بہو صحن میں جھاڑو لگا رہی تھی حلیمہ کی آنکھوں سے نفرت کی آگ کے شرارے نکلنے لگے‘ اُس نے دوپٹہ اُتار کر دور پھینکا‘ بہو کو چٹیا سے پکڑا اور اُٹھا کر دیوار پر دے

غزل



دھوپ میں سایہ بنے تنہا کھڑے ہوئے ہیں
بڑے لوگوں کے خسارے بھی بڑے ہوتے ہیں

ایک ہی وقت میں پیاسے بھی ہیں‘ سیراب بھی ہے
ہم جو صحراؤں کی مٹی کے گھڑے ہوئے ہیں

یہ جو رہتے ہیں بہت موج میں شب بھر ہم لوگ
صبح ہوتے ہی کنارے پہ پڑے ہوتے ہیں

ہجر دیوار کا آزاد تو ہے ہی لیکن
اس کے اوپر بھی کئی کانچ جڑے ہوئے ہیں

آنکھ کھلتے ہی جبیں چومنے آجاتے ہیں
ہم اگر خواب میں بھی تم سے لڑتے ہوتے ہیں

اظہر فراغ

مارا‘ اُس کے ہاتھوں میں سانڈ کی سی طاقت آ گئی‘ چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی‘ بہو ہاتھ اٹھاتی تو بے جان ہو کر گر جاتے‘ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا‘ بولنا چاہا تو زبان گنگ ہو گئی‘ صرف حلیمہ کے مارنے کی آواز آ رہی تھی لگتا یوں تھا ڈنڈے کپڑوں پر برسا رہی ہے۔ بہو کا سر پھٹ گیا۔ منہ سے خون‘ آنکھیں خون آلود‘ چلنے پھرنے سے معذور‘ صحن کے درمیان خون آلود گٹھڑی بنی پڑی تھی۔

بیٹا جو شہر میں تھا اچانک ہی اس کا من جلنے لگا‘ آنکھیں دہکنے لگیں‘ سر چکرانے لگا‘ دل سینہ پھاڑ کر باہر نکلنے لگا۔ فوراً گھر لوٹا‘ جب دروازے کے اندر داخل ہوا تو بیوی خون آلود گٹھڑی بنی پڑی تھی‘ بھاگ کر اوپر گیا بولنا چاہا تو زبان گنگ ہو گئی‘ واپس مڑا تو پاؤں زمین میں دھنسنے لگے۔ آنکھوں کی بینائی ختم ہو گئی‘ حلیمہ اپنے کمرے میں بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ کر بہت محظوظ ہو رہی تھی ساتھ ہی پیر صاحب کو بھی دعائیں دے رہی تھی۔

بس یہ اللہ کا کرم اور رحم ہی تھا کہ عین اُسی وقت بیٹے کا ایک دوست اُس کے گھر میں آیا اسے کوئی ضروری کام تھا۔ اُس نے جب دوست اور اُس کی بیوی کو یوں زمین میں خون سے تر دھنسے پایا تو فوراً بھاگ کر گاؤں گیا اور ایک نیک دل ہستی بابا دتن شاہ کو لایا۔ بابا جی نے آتے ہی مقدس کلام پڑھنا شروع کیا تو میاں بیوی کے جسموں میں حرکت شروع ہو گئی کچھ دیر بعد ہی وہ چلنے پھرنے اور بولنے کے قابل ہو گئے‘ بہو کے زخم خود بخود مندمل ہونا شروع ہو گئے۔ کافی دیر پڑھنے کے بعد بابا جی نے دونوں میاں بیوی کو کہا۔

’’عمل بہت سخت کیا گیا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے مقدس کلام کے سامنے اِس کی کوئی حیثیت نہیں‘ اب تم نے صرف یہ کرنا ہے کہ پانچ وقت نماز پڑھنی ہے قرآن مجید کی تلاوت معمول بنا لو‘ درود شریف کثرت سے پڑھنا اور کبھی بھی کسی چھوٹے بڑے پر زیادتی نہ کرنا ان باتوں پر عمل کرو گے تو پوری دنیا مل کر بھی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ اور جتنی جلدی ہو سکے اس جگہ کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔ اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔‘‘

اگلے دن بیٹے نے اپنا تمام سامان اکٹھا کیا ایک ڈالے کا انتظام کیا گیا‘ حلیمہ صبح سویرے ہی گھر سے یہ سوچ کر چلی گئی کہ بیٹے کے گھر چھوڑنے کے وقت کوئی یہ نہ کہہ دے کہ بیٹے کو نہ جانے دو۔

بیٹا اب دوسرے شہر مکان کرائے پر لے کر اپنی بیوی کے ساتھ رہنے لگا۔

اُسی دوران میں وہ ایک دن دوسرے شہر سے ڈیوٹی پر آ رہا تھا کہ موٹر سائیکل سامنے سے آنے والی گاڑی سے ٹکرا گئی۔ جبکہ ایک ہیوی گاڑی جو اس کے پیچھے آ رہی تھی وہ اللہ کے کرم سے عین اُس کے سر کے اوپر آ کر رک گئی تھی۔ اُسے بہت معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ پھر ایک روز اچانک ہی اُس کی نوکری ختم ہو گئی تھی اُس نے زندگی کی گزر بسر کے لیے کاروبار کیا تو کام ٹھپ ہو گیا۔ کوئی بھی خریدار نہ آتا لیکن بیٹے نے ہمت نہ ہاری۔ میاں بیوی ہر حال میں بابا دتن شاہ کی بتائی باتوں پر عمل کرتے رہے۔ اللہ نے اپنا کرم اور رحم یوں کیا کہ اب اس کا لاکھوں کا کاروبار ہے۔ اس نے محنت اور ایمانداری کو اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ ہر نماز کے بعد اپنی ماں کے حق میں اللہ تعالیٰ کے حضور صحت اور لمبی عمر کی دعائیں کرتا ہے۔

☆☆......☆☆

گھر کی بات

پروین شاکر کا خیال

جس جا مکین بننے کے دیکھے تھے میں نے خواب
اُس گھر میں ایک شام کی مہمان بھی نہ تھی

عظمٰی شکور

صبر سے گندھی میری زندگی، صبر کرتے کرتے ہی چپکے سے گزرتی گئی۔ گزرتا وقت بالوں میں سفیدی دے گیا اچھے دنوں کے انتظار میں آنکھیں برس برس کے جیسے خشک ہی ہوگئی تھیں۔



ابا جی کے فیصلے پر میں سر جھکا کر علی احمد کی دلہن بن گئی تھی۔ نہ شکوہ تھا لب پر نہ شکایت تھی، علی ایک ٹانگ سے معذور تھے۔ مگر میں نے اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کیا تھا۔ علی پڑھے لکھے تھے اور میں اَن پڑھ تھی، وہ میری اِس قدر عزت کرتے تھے کہ میں حیران حیران رہ جاتی اور سوچتی ابا جی نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔

علی ایک آفس میں معمولی کلرک تھے میرے کہنے پر انہوں نے تعلیم کا سلسلہ پھر سے جاری کیا تھا، میں انہیں کسی بڑے آفیسر کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی، اور ایسا ہونا تعلیم سے ہی ممکن تھا۔ اسی دوران اللہ پاک نے ہمیں اولاد سے بھی نوازا تھا اور گڑیا ہمارے گھر میں رحمت بن کر آئی تھی، ہماری بیٹی اتنی خوبصورت تھی کہ اُس پر نظر نہیں ٹکتی تھی، بس میرے لبوں سے ایک ہی دعا نکلا کرتی۔

''یا اللہ بیٹی کی صورت سا نصیب بھی دینا اِس کو آمین۔''

میرے شوہر کی جب ترقی ہوئی تو میں نے محلے کے بچوں میں ٹافیاں بانٹیں تھیں، میں بہت خوش تھی اور ابا جی تو جیسے میری فکر سے آزاد ہوگئے تھے وہ میری طرف سے ایسے مطمئن ہوئے کہ منوں مٹی تلے جا سوئے تھے۔ میری اماں تو پہلے ہی فوت ہو چکی تھیں۔ علی نے مجھے اِس غم میں بہت سہارا دیا تھا۔ میری ساس اور تین نندیں بہت روایتی سی تھیں۔ مگر میں نے بس صبر اور شکر ہی کیا تھا۔ کیونکہ علی میرا بہت خیال رکھتے تھے، میرے دو شادی شدہ دیور کراچی میں رہتے تھے، جبکہ سسر جی سے مجھے کوئی شکایت نہیں تھی وہ اپنے آپ میں مگن رہنے والے تھے۔

ابھی ہماری گڑیا تین سال کی تھی کہ دوسری بیٹی ثومی دنیا میں آئی تھی، ساس صاحبہ نے دوسری بیٹی کی پیدائش پر وہ طعنے دیے تھے کہ خدا کی پناہ...... میں نے تو بس چپ رہنے ہی میں عافیت سمجھی تھی جبکہ علی پڑھے لکھے تھے وہ ایسی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ میں اب پہلے سے زیادہ مصروف ہوگئی تھی۔ علی آفس کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم بھی جاری رکھے ہوئے تھے، گھر میں غربت نہیں، لیکن کچھ تنگی ضرور تھی، مگر بہت سکون تھا۔ تین وقت کی روٹی آسانی سے مل جاتی تھی اور کیا چاہیے تھا۔

علی نے پرائیویٹ پہلے بی اے کیا پھر ایم اے انگلش کیا اور پھر اُن کی ترقی ہوگئی وہ مزید بڑے عہدے پر آگئے، اُن دنوں ہم لاہور میں تھے، میں اللہ کے سامنے پانچ وقت سجدہ ریز ہوتی تھی کہ اچھے دن آگئے، انہی دنوں اللہ پاک نے مجھے تیسری بیٹی کومل دی، وہ اپنے نام جیسی نازک سی تھی میری ساس نے اب تو وہ واویلا مچایا تھا کہ خدا کی پناہ......

''تیسرا پتھر لگا ہے میرے علی کے گھر۔'' اُن کی یہ بات سن کر میری روح کانپ گئی تھی اور میں بہت روئی تھی، مگر علی نے مجھے دلاسہ دیا تھا۔

''بھلی لوک کیوں اُداس ہوتی ہو، امی تو ویسے ہی غصہ کرتی ہیں وہ دل کی بہت اچھی ہیں۔'' میں بہل گئی تھی۔ مگر اب میں چپکے چپکے اپنے اللہ سے بیٹے کی پیدائش کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔ اور مجھے یقین تھا کہ اللہ پاک میری سنے گا ضرور......

زندگی رواں دواں تھی، میری دو نندوں کی شادیاں بھی ہوگئی تھیں، بس ایک چھوٹی نند رہ گئی تھی۔ اور اس کا بس ایک ہی کام تھا علی اور اپنی والدہ کو میرے خلاف کرنا اور شاید وہ کامیاب ہو جاتی علی کو میرے خلاف کرنے میں مگر علی کے دل میں رحم تھا عزت تھی میرے لیے، وہ بہت اچھے

تھے' کیونکہ میں نے اچھا برا وقت اُن کے ساتھ کاٹا تھا۔ پیاز چٹنی کے ساتھ روٹی کھائی تھی اور قدم بہ قدم اُن کے ساتھ چلی تھی۔ اُن کا ہر طرح خیال رکھا تھا' وہ مانتے تھے کہ اُن کو اِس مقام تک پہنچانے والی میں ہوں' میں ہر قدم پر اُن کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہوں۔

ساس سے ملنے والے دن رات کے طعنوں کے دوران میں ہی' میں ایک بار پھر امید سے ہوئی' اللہ پاک نے میری دعا سن لی تھی۔ اِس بار بڑی دعاؤں کے بعد میرے گلشن میں مصطفیٰ کی پیدائش ہوئی تھی۔ ہر طرف موجود مبارکباد کی آوازوں نے مجھے گزرے وقت کی سب تلخیاں بھلا دی تھیں۔ اب تو جیسے میں سب کے لیے بہت اہم ہوگئی تھی۔

ساس واری صدقے جارہی تھیں' علی کی آنکھوں میں چمک بتاتی تھی کہ شاید وہ بھی ان لمحات کو ترسے ہوئے تھے' بیٹے کے باپ بن کر جیسے اُن کے جسم میں نئی جان آگئی تھی۔

''اچھا بیٹا اتنا اہم ہوتا ہے؟'' میں سادگی میں خود سے سوال کررہی تھی' ساس کے قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے' سسر صاحب مصطفیٰ کو بابو کہتے تھے پیار سے......

''مصطفیٰ بابو میرا......!'' اللہ نے میری جھولی میں اتنی خوشیاں ڈال دی تھیں کہ شاید میں اِس کے قابل بھی نہیں تھی۔

بیٹے کی پیدائش کے فوراً بعد علی کا پے اسکیل بڑھ گیا تھا' مطلب تنخواہ بڑھ گئی تھی۔ سچ ہے کہ اللہ جو روح بھیجتا ہے' ساتھ میں اُس کا رزق بھی دیتا ہے۔ میرا بیٹا مصطفیٰ اپنی بہنوں کا راجہ تھا' میری بیٹیاں ہر وقت اُس کے ساتھ چپکی رہتی تھیں' ابھی مصطفیٰ سال بھر کا تھا کہ اُس کا بھائی آگیا تھا اور میری زندگی خوشیوں سے بھر گئی تھی۔ اب گڑیا اور ثومی اسکول جاتی تھیں اور کومل میرے پاس گھر میں ہوتی تھی اور پھر اللہ پاک نے مجھے تیسرا بیٹا بھی دے دیا تھا۔ اب ساس کو مجتبیٰ کی پیدائش کے بعد پوتوں کی خواہش کے حوالے سے مکمل ٹھنڈ پڑی تھی اور انہی دنوں علی کی مزید ترقی اور ٹرانسفر اسلام آباد میں ہوگیا تھا' لوگوں کی مبارکبادیں اور مٹھائیاں ہر طرف خوشی کا سماں تھا میرے ساس سسر میرے دیوروں کے پاس کراچی شفٹ ہوگئے تھے اور ہم اسلام آباد آگئے تھے۔

زندگی اتنی خوبصورت ہوجائے گی میں نے کبھی سوچا نہ تھا' سب میری قسمت پر حیران تھے کہ میں ایک بڑے آفیسر کی بیگم بن گئی تھی۔ اور پھر علی کو گورنمنٹ کی طرف سے آسان اقساط کے ساتھ ایک پلاٹ ملا تھا' لو جی قسمت ہم پر اِس قدر مہربان ہوگئی تھی کہ اب ہم اپنا گھر بنا سکتے تھے۔ اور یہ خواہش تو بہت پہلے سے میرے دل میں سرگوشیاں کیا کرتی تھی کہ اپنا گھر ہوگا جہاں کی دھوپ چھاؤں میری ہوگی' میرے گھر میں لان ہوگا میری پسند کے پھول ہوں اور جانے کیا کیا ہوگا۔ میرا یہ خواب اب پورا ہونے جارہا تھا۔ انہی دنوں گڑیا کی شادی کی تیاریاں ہونے لگی تھیں باجی نے کہا تھا۔ بس اب رخصتی دو' بہت پڑھ لیا بچی نے' جبکہ گڑیا نے ابھی میٹرک ہی پاس کیا تھا۔

☆......☆......☆

گڑیا کے فرض کے بعد اب ثومی کی فکر تھی' مگر وہ بہت الگ سی تھی' اپنے آپ میں مست' خود کے ساتھ خوش رہتی' علی کی لاڈلی' باجی کی نظر اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے ثومی پر بھی تھی۔

کیونکہ ثومی فراز جیسی لمبے قد کی تھی' خیر باجی نے بات چلائی' اِدھر ثومی کو فراز کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی۔ اُدھر ہمارے گھر کی بنیادیں پڑیں' قرآن خوانی کرائی گئی تھی۔

میرا خواب پورا ہونے جارہا تھا میرے تو پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے' خوشیاں میری دہلیز پر رقصاں تھیں' میں حیران تھیں اپنے نصیب پر' دو بیٹیاں تو اپنے گھر کی ہوگئی تھیں' چھوٹی ابھی پڑھ رہی تھی' گھر میں علی کے بعد مصطفیٰ ہی اس وقت بڑا تھا وہی سب فرائض نباہ رہا تھا۔ پڑھ رہا تھا اور گھر کو بنوانے میں مدد بھی کررہا تھا۔ مصطفیٰ کی ابھی اتنی عمر نہیں تھی مگر اپنے باپ کی طرح سمجھدار اور ذہین تھا۔ جبکہ ارسلان سیدھا سا بچہ تھا وہ اتنا ہوشیار نہ تھا۔

☆......☆......☆

کومل ڈاکٹر بن رہی تھی' مگر مجھے اُس کی شادی کی فکر تھی اور اللہ کے کرم سے ایک انجینئر کا رشتہ آیا تھا اور ہم اس فرض سے بھی سبکدوش ہوگئے تھے۔

اپنی تینوں بیٹیوں کی شادی کے بعد میں نے اور علی نے اپنے بڑے بیٹے مصطفیٰ کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی تھی۔ ماشاءاللہ وہ شہزادہ لگ رہا تھا۔ بہنیں بھائی کی نظریں اتار رہی تھیں۔ بہو آنے کے بعد بجائے کم ہونے کے میرے کام مزید بڑھ گئے تھے' چھوئی موئی سی بہو اپنے کمرے میں آرام فرماتیں اور میں کام میں جُتی رہتی' اور پھر اپنے پوتے اذان کی پیدائش کے بعد تو میں مزید دوہری ہوگئی تھی۔ پوتے صاحب کو بھی سارا دن میں سنبھالتی تھی' مگر خدا گواہ ہے میں نے یہ سب کام اپنی محبت میں خلوص میں کیے' میرے ماتھے پر کبھی بل نہیں پڑا تھا کہ شاید ابا ٹھیک ہی کہتے تھے کہ محبت مجھ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے

غزل

بہتے پانی پہ نمازیں پڑھا کرتی ہیں
کشتیاں جب کسی دریا میں بہا کرتی ہیں

خیر ہو میرے کراچی کی جہاں عصر کے وقت
مائیں بیٹوں کے لیے روز دعا کرتی ہیں

سر ہو یا پھول انہیں اس کی خبر ہوتی نہیں
سولیاں کاٹھ کی نابینا ہوا کرتی ہیں

انگلیاں موم کی سورج کے شبستانوں سے
زندگی تیرے لیے پھول چُنا کرتی ہیں

بیچ کر خوں کہاں چولہے جلا کرتے ہیں
زہر پینے سے کہاں سانسیں چلا کرتی ہیں

میں نے اِک شہر متین ایسا بھی سن رکھا ہے
عورتیں جس کی محبت میں وفا کرتی ہیں

یونس متین۔ عارف والا

اور یہی محبتیں میں اپنے نواسے نواسیوں پوتوں پر لٹاتی رہی تھی، علی کا گلشن آباد اور شاد تھا پھر ہم نے ارسلان کو بھی بیاہ دیا تھا۔ ہمارا گھر خوشیوں کا گہوارہ تھا مگر اب وہ گھر ہمیں تنگ پڑ رہا تھا۔

☆......☆☆

میرے اپنے گھر کا ایک پورشن اب تیار ہو چکا تھا جبکہ دوسرا پورشن تیار ہو رہا تھا۔

ارسلان نے بھی اپنے والد اور بھائی کی طرح گورنمنٹ جاب کر لی تھی جبکہ علی ریٹائرڈ ہو کر اپنے کسی دوست کی فرم میں کام کر رہے تھے۔ وہ گھر بیٹھنا نہیں چاہتے تھے زندگی میں مصروف ہی رہنا چاہتے تھے۔ سو باقاعدہ کام پر جاتے، مجتبیٰ پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک سدھار گیا تھا، میں اُداس تو ہوئی تھی مگر پوتے پوتیوں کے ساتھ دل بہلا رہتا تھا۔ دونوں بہوؤں نے اب سمجھداری سے گھر سنبھال لیا تھا شاید جب کندھوں پر بوجھ پڑے تو سب کام آ جاتا ہے، میں خود کو بہت خوش نصیب سمجھتی تھی کہ بہوئیں بھی اچھی مل گئیں تھیں۔ اور بیٹیاں بھی اپنے گھروں میں بہت خوش تھیں، زندگی نے مجھے سب کچھ دے دیا تھا مگر...... اپنے گھر کا خواب اب تک ادھورا تھا۔

وقت نے میرے چہرے پر لائنوں کی صورت جال بن دیا تھا، بیمار بھی رہنے لگی تھی۔ مگر گھر کی خواہش......! دل میں پھانس سی چبھتی......

آخر کب تک مجھے صبر کرنا ہوگا، علی بھی اس معاملے میں چپ تھے۔ اُن کا تو بس ایک ہی کام رہ گیا تھا۔ آفس جاتے اور پھر واپسی پر چپ چاپ اپنے کمرے میں نیوز چینلز دیکھتے رہتے، میں ہاتھ میں تسبیح لیے بیٹھی رہتی اور چڑ سی جاتی کہ علی مجھ سے کوئی بات کیوں نہیں کرتے۔

آخر میں نے اپنے بیٹے مصطفیٰ سے ایک دن خود ہی پوچھ لیا تھا۔

''بیٹا جان ہم اپنے گھر میں کب شفٹ ہوں گے۔'' اور اس کا جواب سنتے ہی میں جیسے سکتے میں آ گئی تھی۔

''اِس گھر کو بنانے میں، میں نے دن رات ایک کر دیا ہے اور اپنا خاصہ پیسہ بھی لگایا ہے، ابو سے کہیں یہ گھر میرے نام کریں، پھر آپ سب وہاں جا سکتے ہیں۔'' مصطفیٰ نے بہت سپاٹ لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا تھا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے علی کو یہ ساری بات بتائی تھی وہ تو سخت غصے میں آ گئے تھے۔ میں نے علی کو زندگی میں پہلی بار اتنے غصے میں دیکھا تھا ’اُس کے بعد تو ہمارے گھر میں آئے دن فساد ہونے لگا تھا وہ گھر نہیں عذاب بن گیا تھا ہمارے لیے، سکون تباہ ہو گیا تھا......

میں نے اپنے گھر کی بات گھر میں رکھی تھی اور بس صبر کر لیا تھا۔

صبر...... ہاں میں نے ایک بار پھر صبر کر لیا تھا۔ پہلے اپنی ماں کی موت پر صبر کیا پھر شوہر کے معذور ہونے پر صبر کیا پھر ابا کی موت پر صبر کے آنسو بہائے اور پھر ساس اور نند کی باتوں پر صبر کرتی رہی اُن کے رویے سہتی رہی......

اور اب اپنی ہی اولاد جسے میں نے بڑی منتوں مرادوں بعد پایا تھا اُس کے دیے ہوئے زخم پر صبر کر لیا تھا۔

میں نے گھر کے خواب کو دل سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ دل و دماغ سے یہ خواہش بھی کھرچ دی تھی۔

ہاں مجھے نہیں چاہیے کوئی بھی گھر...... اللہ پاک میرے شریک زندگی علی کو سلامت رکھے، میرا سر ڈھکا رہے اور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔

☆☆......☆☆

کراچی سے پانچویں چشم کُشا کہانی

یادوں کے چراغ

بشیر بیتاب کا خیال

برسوں میری حیات کے لمحوں میں ڈھل گئے
جھپکی ذرا سی آنکھ تو موسم بدل گئے

شاہدہ ذاکر

عدنان بھائی میرے شوہر کے بے حد قریبی دوست تھے۔ نہایت سچے، ہمدرد، بے لوث اور مخلص مگر دنیا نے اُن کے ساتھ بالکل ویسا ہی برتاؤ کیا جو فی زمانہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، نتیجتاً وہ



ایسے حال میں تھے کہ سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنا بھی مشکل ہورہا تھا۔ اُن کی اور ہماری رہائش ایک ہی ایریا میں دس پندرہ منٹ کی پیدل مسافت پر تھی‘ اس لیے کبھی وہ اور بھی مبشر (میرے شوہر) شام کو ایک دوسرے کی طرف چلے جاتے۔ وہ اگرچہ مجھے بھابی کہتے تھے لیکن ہمیشہ انہوں نے مجھے بہنوں والا مان اوراحترام دیا تھا۔

پہلوٹی کی اولاد ہونے کے باعث عدنان بھائی سنِ شعور میں قدم رکھتے ہی دانستہ اور نادانستہ طور پر والدین کی ذمے داریوں میں حصہ دار بنتے چلے گئے۔ تین بھائی‘ دو بہنیں‘ والدین اور دادا‘ دادی پر مشتمل اِس نو افراد کے کنبے کے واحد کفیل اُن کے والد تھے۔ صبح دفتر اور شام کو اوور ٹائم کرنے کے باوجود دال دلیہ پورا کرنا مشکل تھا‘ لہٰذا عدنان بھائی نے میٹرک میں ہی ٹیوشن شروع کرکے اپنے تعلیمی اخراجات کا بارخود اٹھالیا۔ کالج کی تعلیم مکمل ہونے تک ایک دوست کی وساطت سے بیرون ملک دوبئ جانے کا موقع مل گیا جس سے انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ کام‘ کام اور صرف کام انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا اور اس میں وہ روز و شب کی تفریق کیے بغیر جُت گئے۔ اُن کی انتھک محنت سے رفتہ رفتہ گھر میں خوشحالی آنے لگی۔ معاشی آسودگی آتے ہی والدین نے سب سے پہلے دونوں بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہونے کی ٹھانی ءاور مناسب رشتے دیکھ کر اُن کو اپنے گھر کا کردیا۔ تب تک اُن کے دونوں بھائی بھی تعلیم مکمل کرکے برسرروزگار ہوچکے تھے۔

بیٹوں کے سر پر سہرا سجانے سے پہلے گھر کی توسیع اور تعمیر کا پروگرام بنایا گیا تھا تاکہ بعد میں رہائش میں دقت نہ ہو۔ چھت پر جدید طرز تعمیر پر مشتمل چار کمروں کا ایک خوبصورت پورشن بنایا گیا‘ اور باہر سے بھی گھر کی تزئین اور آرائش کرکے اسے ایک خوبصورت دو منزلہ عمارت کی شکل دے دی گئی۔ کچھ عرصے بعد قریبی عزیزوں سے خوبصورت اور تعلیم یافتہ لڑکیاں منتخب کرکے یکے بعد دیگرے تینوں بھائیوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کردیا گیا۔

شادی کے بعد عدنان بھائی بھابی کو بھی بیرون ملک لے گئے تھے۔ سال میں ایک مرتبہ جب وہ چھٹی پر پاکستان آتے تو اُن سے ملاقات ہوتی۔ وہ اپنے بہن بھائیوں اوراُن کی اولادوں کے لیے ڈھیروں بیش قیمت تحائف لاتے اور ہر جگہ انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا‘ یوں دیکھتے ہی دیکھتے پندرہ سال کا عرصہ بیت گیا اور وہ تین بچوں کے والدین بن گئے۔

اچانک ایک اندوہناک خبر نے زندگی کی پُرسکون ندی میں طلاطم برپا کردیا تھا۔ عدنان بھائی ایک کار ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہوگئے تھے‘ بازو اور پیر میں فریکچر اور سر میں بھی شدید چوٹیں آئی تھیں۔ مہینہ بھر اسپتال میں رہ کر وہ گھر آئے تو بازو اور پیر پر پلستر چڑھا ہوا تھا اور چلنے پھرنے سے قاصر تھے۔ ڈاکٹروں نے صحت کی مکمل بحالی کے لیے چھ ماہ کا عرصہ دیا تھا‘ اُن کے بیوی بچے دل و جان سے اُن کی خدمت اور دیکھ بھال میں لگ گئے تھے۔ لیکن وہ جسمانی تکلیف سے زیادہ مستقبل کے اندیشوں سے نڈھال تھے۔ اُن کی کمپنی نے دو ماہ بعد واجبات کی ادائیگی کرکے اُن کو فارغ کردیا تھا‘ اتنے مہنگے ملک میں رہائش‘ گھریلو اخراجات اور بچوں کی تعلیم کے بارے میں سوچ سوچ کر اُن کی نیندیں اڑ چکی

تھیں۔ اپنی خون پسینے کی کمائی تو وہ پہلے ہی اپنے بہن بھائیوں کی تعلیم‘ شادیوں اور گھر کی تعمیر پر خرچ کرچکے تھے۔ اپنے بارے میں تو انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے انہیں جس آزمائش میں ڈالا تھا اُس سے گزرنے کے لیے تو اُن کی کوئی تیاری ہی نہ تھی‘ کافی سوچ و بچار کے بعد آخر کار انہوں نے اپنے وطن اور عزیزوں میں واپس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

جب وہ انتہائی دکھی اور پریشان حال اپنے گھر لوٹے تو گھر میں اُن کا استقبال ایک بن بلائے مہمان کی طرح ہوا۔ دونوں بھائی اوپر نیچے الگ الگ رہائش پذیر تھے۔ والدین کو اوپر کی منزل پر ایک کمرہ ملا ہوا تھا۔ عدنان بھائی کے لیے نچلی منزل پر بمشکل ایک کمرے کی گنجائش نکالی گئی‘ بظاہر تو سب بہن بھائی مروت اور رواداری کا مظاہرہ کررہے تھے لیکن چندروز میں ہی یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ وہ بہن بھائی جو پروانہ وار اُن پر نثار ہوتے تھے‘ بدلتے وقت کے ساتھ آنکھیں بدل چکے تھے۔ والدین بیچارے خود ضعیف‘ بیمار اور بیٹوں کے محتاج تھے۔ تب عدنان بھائی کو یہ احساس ہوا کہ جن رشتوں کے لیے انہوں نے اپنی زندگی کے سنہری دن کڑی مشقت کی چکی میں پستے ہوئے گزار دیے تھے وہ تو صرف مفاد کے رشتے تھے۔ وہ تو بچپن سے اِن سے صرف لیتے ہی آئے تھے دینا تو انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ ذرا سی پریشانی کی آندھی کیا چلی سب کے چہروں سے نقاب ہی اڑ گئے۔

بہرحال عدنان بھائی نے ہمت نہ ہاری اور مردانہ وار حالات کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ اپنی معمولی سی جمع پونجی سے انہوں نے زندگی کی گاڑی کو دوبارہ رواں دواں کیا۔ بچوں کو قریبی اسکول میں داخل کروایا اور اپنے لیے نوکری کی تلاش شروع کردی اور جیسے ہی صحتیاب ہوئے فوراً ملازمت شروع کردی۔ کافی عرصہ ملک سے باہر رہنے کے باعث انہیں یہاں کے سسٹم کو سمجھنے اور اس میں ایڈجسٹ ہونے میں دقت کا سامنا تھا اور یہی حال اُن کے بچوں کا تھا وہ تو زندگی میں پہلی مرتبہ ایک نئے کلچر اور طرزِ زندگی سے روشناس ہورہے تھے۔ لیکن سب نے مل جل کر دھیرے دھیرے ان مسائل پر قابو پالیا۔ عدنان بھائی کی جاب گھر سے کافی دور تھی جس کے لیے انہیں دو دو بسیں بدل کر آنا جانا پڑتا تھا۔ ان کے پیر میں ابھی تک معمولی تکلیف باقی تھی جو دن بھر کی محنت و مشقت سے رات تک شدید ہوجاتی‘ اب اُن کی یہی خواہش تھی کہ وہ اپنے لیے کسی سواری کا بندوبست کرلیں۔ اگرچہ دبئ میں تو وہ کار کے مالک تھے‘ لیکن یہاں تو موٹر سائیکل کا حصول بھی مشکل لگ رہا تھا۔

انہی دنوں بھابی نے ایک کمیٹی ڈالی جو خوش قسمتی سے انہیں جلد ہی مل گئی جس سے عدنان بھائی نے قسطوں پر موٹر سائیکل لینے کا پروگرام بنالیا۔ ان پیسوں سے انہوں نے ایڈوانس پیمنٹ کردی اور باقی رقم کی ادائیگی دو سال تک ماہانہ کرنی تھی۔ جب وہ موٹر سائیکل پر پہلی مرتبہ ہماری طرف آئے تو مٹھائی بھی ہمراہ تھی۔ مبشر بھی بے حد خوش ہوئے اور نہایت گرمجوشی سے مبارکباد دی۔ انہیں اپنے دوست کی پریشانیوں اور تکلیفوں کا بخوبی اندازہ تھا اور اب اُن کو خوش دیکھ کر دلی اطمینان محسوس کررہے تھے۔

میری والدہ جو دوسرے شہر میں رہائش پذیر تھیں اچانک ہی شدید علیل ہوگئیں۔ میں تو یہ خبر سنتے ہی انہیں دیکھنے کے لیے بے چین ہوگئی۔

اتفاق سے بچوں کی بھی اسکول سے چھٹیاں تھیں۔ مبشر نے پندرہ دن کی چھٹی لی اور ہم اُن سے ملنے کے لیے روانہ ہوگئے۔ ہمارے جانے کے تین چار روز بعد میری والدہ اسپتال سے گھر آ گئیں اور ہماری واپسی تک اُن کی طبیعت کافی حد تک سنبھل چکی تھی لہٰذا ہم کافی مطمئن ہوکر لوٹے تھے۔

واپسی کے بعد جب عدنان بھائی سے ملاقات ہوئی تو ایک نہایت اعصاب شکن خبر سننے کو ملی۔ وہ موٹر سائیکل جو انہوں نے سینکڑوں جتن کر کے حاصل کی تھی وہ اُس سے محروم ہو چکے تھے۔ دو چار روز قبل رات کی تاریکی میں ایک ویران سڑک پر دو نوجوانوں نے پستول کے زور پر اُن سے موبائل فون، بٹوہ اور بائیک چھین لی تھی۔ یہ سن کر میری تو آنکھوں سے اشک رواں ہوگئے اور سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ کن الفاظ میں افسوس کا اظہار کروں، جبکہ مبشر تو اس ناگہانی آفت پر غم و غصے سے بھڑک اٹھے۔ پہلے تو انہوں نے لوٹنے والوں کو جی بھر کر برا بھلا کہہ کر دل کی بھڑاس نکالی پھر عدنان بھائی پر بھی خفا ہوئے کہ انہوں نے بنا مزاحمت کیے فوراً بائیک کیوں اُن کے حوالے کردی اس پر انہوں نے دل شکستہ انداز میں جو جواب دیا وہ میرے دل میں تیر کی طرح پیوست ہوگیا اور آج بھی سوچ کر تکلیف ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا۔

"یار......! میں نے سوچا اپنی مرضی سے یا جبراً بائیک تو ہر حال میں مجھے دینی ہی ہوگی اگر آرام سے دے دوں تو اپنی جان بچا کر یہاں سے نکل جاؤں گا، بصورت دیگر یہ مجھے گولی مار کر بائیک لے جائیں گے اور پوری رات میری لاش سڑک پر پڑی رہے گی جو یا تو کتے بلیوں کی خوراک بن جائے گی یا گاڑیاں اُسے روندتے ہوئے گزرتی رہیں گی' یہی سوچ کر میں نے خاموشی سے چابی اُن کے حوالے کردی اور چلا آیا۔"

یہ سن کر مبشر بھی گنگ ہوگئے کیونکہ یہی تلخ حقیقت تھی جسے تسلیم کیے بنا چارہ نہ تھا۔ اس کے بعد عدنان بھائی دو سال تک اُس بائیک کی قسطیں بھرتے رہے جسے انہوں نے مہینہ بھر استعمال نہ کیا تھا۔

زندگی کے اُس کٹھن دور میں دو سال تک انہیں مجبوراً یہ جرمانہ بھرنا پڑا' کبھی کبھی وہ ایک دکھی مسکراہٹ کے ساتھ کہتے۔

"یار میرا تو وہی حال ہوگیا' کھایا نہ پیا گلاس توڑا بارہ آنے۔" تو مبشر کو بھی اُن سے اتفاق کرنا پڑتا۔

اِس کے بعد اُن کے حالات نے کروٹ لی اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی سن لی اپنے پچھلے تجربے کی بنا پر اُن کو ایک بہترین جاب مل گئی۔ گھر میں دوبارہ خوشحالی کا دور دورہ ہوگیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بچے بھی تعلیم مکمل کر کے عملی میدان میں آ گئے۔ وہ بیٹی کے فرض سے بھی سبکدوش ہوگئے۔ لیکن پچھلے سال ایک شدید ہارٹ اٹیک نے انہیں پل بھر میں ہم سے چھین لیا۔ کئی دنوں تک اس جدائی کا یقین ہی نہیں آتا تھا کیونکہ مبشر کے لیے تو وہ دوست سے بڑھ کر بھائی بن چکے تھے' لیکن بالآخر اللہ کی رضا کے سامنے سر جھکانا پڑا اور دکھی دل کے ساتھ صبر کا دامن تھام لیا۔ اب اگرچہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ہمارے دل میں اُن کی یادوں کے چراغ ہمیشہ روشن رہیں گے۔ اللہ اُن کی مغفرت کرے آمین۔

☆☆......☆☆

کراچی سے چھٹی چشم کُشا تحریر

آسمانی جوڑا

عبداللہ جاوید کا خیال

> ہمیں پہچان ہوتی ہے خدا کی
> ارادے جب ہمارے ٹوٹتے ہیں

ارم ناز

یہ واقعہ بالکل سچ پر مبنی ہے کیونکہ اس کے چشم دید گواہ ہم خود ہیں' یہ واقعہ ہمارے اپنے گھر یعنی میرے سگے بھائی کے ساتھ پیش آیا۔ گزشتہ تین مہینے پہلے کی بات ہے میرے سب سے چھوٹے



بھائی کی شادی طے پائی‘ پہلے میں آپ کو یہ بتاتی چلوں کہ الحمدللہ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔

یعنی مجھ کو ملا کر تین بہنیں اور دو بھائی‘ ہم تینوں بہنیں شادی شدہ ہیں اور ایک بھائی کی شادی ہوچکی ہے اس طرح میرے سب سے چھوٹے بھائی کی شادی رہ گئی تھی۔ سو اب امی ابو کو فکر ہوئی کہ چھوٹے بیٹے کی جلد از جلد شادی کر دی جائے تاکہ وہ اپنی زندگی میں اس فرض سے فارغ ہو جائیں۔

میری دونوں بہنیں شادی ہو کر ملک سے باہر گئی ہیں ایک امریکہ میں اور دوسری کینیڈا میں‘ میں یہاں کراچی میں رہتی ہوں‘ لہٰذا لڑکی دیکھنا شروع کیا گیا اور جلد ہی ایک جاننے والی کے توسط سے لڑکی دیکھی گئی اور ہم لوگوں نے فوراً پسند کرلی کیونکہ ہمیں کوئی ’حسن‘ کی تلاش نہ تھی۔

بس قبول صورت ہو اور شریف لوگ ہوں۔

بظاہر فیملی اچھی نظر آ رہی تھی‘ شریف لوگ تھے‘ انہوں نے بھی بھائی کو دیکھا اور فوراً پسند کرلیا کیونکہ ہمارا بھائی ماشاء اللہ خوب صورت تھا اور اس کا اپنا کاروبار تھا‘ کم عمر ہونے کے ساتھ ساتھ اُس پر کوئی خاص ذمے داریاں بھی نہ تھیں۔

میرے بھائی کی شروع سے خواہش تھی کہ پہلے میں اپنا ذاتی مکان بناؤں گا پھر شادی کروں گا۔ اللہ نے اس کا یہ کام بھی پورا کروادیا۔ بڑے بھائی اور بھابی الگ گھر میں رہتے تھے‘ ہم تو چاہ رہے تھے کہ چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوجائے لیکن ان لوگوں نے سال کا ٹائم مانگا وہ بھی اپنی سب لڑکیوں کی شادی کر کے فارغ ہوگئے تھے‘ یہ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔

لڑکے والے چاہ رہے تھے کہ بہن کی شادی کے ساتھ بھائی کی شادی ہوجائے‘ یعنی بہن کی رخصتی میں بھائی کا ولیمہ اُن کے ہاں بھی دو بچے ملک سے باہر تھے اور ان کو بھی شادی میں آنا تھا‘ میری دونوں بہنیں بھی بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے بہت بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں کیونکہ وہ بڑے بھائی کی شادی میں بھی نہیں آسکی تھیں‘ لہٰذا یہ گھر کی آخری شادی تھی اور وہ لوگ اس وقت کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ لوگ شادی میں شرکت کے لیے پاکستان آئیں۔

اللہ اللہ کر کے وہ دن آ گیا جب آگے پیچھے دونوں بہنیں اپنی اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان آئیں‘ اُن کے بچے بھی بہت زیادہ خوش تھے اور وہ شادی کی بھرپور تیاریاں کر رہے تھے۔

طے یہ پایا تھا کہ شادی میں مہندی اور مایوں کی رسم نہیں ہوگی‘ بس بارات اور ولیمے کی تقریب ہوگی‘ لیکن لڑکی والے مہندی کا فنکشن کرنے پر زور دے رہے تھے لہٰذا بہت دھوم دھڑلے کے ساتھ بری گئی اور لڑکی کو ہلدی اور مہندی لگائی گئی۔

لڑکی مایوں والے دن پارلر سے تیار ہوئی تھی اور غضب کی لگ رہی تھی اور اُس کی خوشی کی انتہا یہ تھی کہ اُس نے خود اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ ڈانس کیا تھا‘ ہم تو خود یہ دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

غرض کہ تقریب بہت اچھی رہی تھی۔

ایک دن کا گیپ کر کے بارات جانی تھی‘ سو گھر میں صبح ہی سے افراتفری مچی ہوئی تھی‘ جہیز وغیرہ بھی آنا تھا‘ ہماری امی نے دلہن کو اُس کے اپنے الگ فلیٹ میں اتارنے کا فیصلہ کیا تھا‘ امی ابو الگ فلیٹ میں شفٹ ہوگئے تھے لیکن بلڈنگ ایک ہی تھی تاکہ دلہن کو کوئی تکلیف نہ ہو‘ لڑکی کے گھر والے پھولے نہیں سما رہے تھے‘ انہوں نے اپنی حد

سے بڑھ کر اپنی بیٹی کو جہیز دیا تھا‘ لڑکی کی بہنوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی بہن کا گھر سیٹ کیا تھا۔

شام کو دلہن کا بیڈروم تازہ پھولوں سے سجایا گیا تھا اور بھائی کا گھر نظر لگنے کی حد تک پیارا لگ رہا تھا کیونکہ ہر چیز در و دیوار سب کچھ نیا تھا بس انتظار تھا تو دلہن کا......

لڑکی والوں نے بارات کا بہت زبردست انتظام کیا تھا‘ کھانا انتہائی شاندار تھا۔ بہت عزت اور پیار دیا اُس دن لڑکی کے بھائی کا ولیمہ بھی تھا سب لوگ بھائی بھابی کو چاند سورج کی جوڑی کہہ رہے تھے۔

آخر کار رخصتی کا وقت آ گیا اور لڑکی سب کی دعاؤں میں رخصت ہو کر ہمارے گھر آ گئی تمام رسموں سے فارغ ہو کر ہم سب دلہا دلہن کو شرارتوں اور قہقہوں کے ساتھ اللہ حافظ خدا حافظ کہہ کر کہ اب صبح ملاقات ہوگی امی کے فلور پر آ گئے۔ اب بھائی کے گھر بس دلہا دلہن تھے۔

اب سنیے بھائی کی‘ دو ڈھائی گھنٹے بعد بھائی کا پریشانی میں فون آیا کہ بہت برا ہوگیا ہم سب ڈر گئے خدا خیر کرے‘ وہ بولا۔

”میں اوپر آ رہا ہوں۔“ اور پھر خاموشی سے ہم تینوں بہنوں اور بڑے بھائی کو راز داری سے بتایا۔

”دلہن کہہ رہی ہے کہ میں کسی کی امانت ہوں‘ خدا کے لیے مجھے ہاتھ نہ لگانا اور مجھے صرف ہفتہ دس دن کا موقع دے دو میں یہاں سے بھاگ جاؤں گی۔“

میرے بھائی نے اُس وقت بہت برداشت سے کام لیا تھا ورنہ کوئی اور آدمی ہوتا تو اُسی وقت دو تین تھپڑ مارتا‘ لیکن میرے بھائی نے بہت ہمت سے کام لیا اور پیار سے بات کی کہ اصل بات بتاؤ۔“ تو اس نے کہا۔

”میں کسی اور سے پیار کرتی ہوں لیکن میرے ماں باپ نے میری ایک نہیں سنی‘ میرے بھائی نے کہا کہ پورا سال ہمارا رشتہ رہا‘ تم اگر راضی نہ تھیں تو ایک فون کر کے مجھے یا میرے گھر والوں کو بتا دیتیں تو ہم خود ہی منع کر دیتے اور تم پر آنچ بھی نہیں آتی‘ رشتہ طے ہونے کے بعد کئی موقع آئے‘ لیکن کہیں پر بھی تم نے ایسا اظہار نہیں کیا بلکہ بہت خوش خوش نظر آئیں اور آج شادی کی اتنی بڑی تقریب تمہارے ماں باپ کی عزت اور ہماری عزت یہ سب کیا ہے تو اُس نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

”یہ سب ڈرامہ تھا۔“

میرے بھائی نے کہا۔ ”میری بہنیں آئی ہوئی ہیں پورے خاندان کے سامنے تم ہماری عزت دو کوڑی کی کر رہی ہو‘ تم نے میرے ساتھ ہی ایسا کیوں کیا میرا کیا قصور تھا۔“ تو وہ کہنے لگی۔

”اس کے سوا کوئی چارا نہ تھا اب ہر حال میں میرے ماں باپ مجھے اُس کے حوالے کر دیں گے۔“

آخر کار سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ ابھی اور اسی وقت اِس کے گھر والوں کو بلایا جائے پھر رات ہی کو جب صبح ہونے کے قریب تھی ان لوگوں کو فون کیا گیا اور آنے کا کہا تو وہ بھی پریشان ہوگئے اور کہا کہ ہم آ رہے ہیں جب تک وہ لڑکی یعنی نئی دلہن خاموش بیٹھ کر اپنے آشنا کو فون اور میسج کرتی رہی یہاں یہ میں بتا دوں کہ وہ اپنے ساتھ موبائل لائی تھی اور کہا تھا کہ یہ فون میری امی نے دیا ہے بات کرنے کے لیے‘ غرض کہ تھوڑی دیر میں لڑکی کے گھر والے بھی آ گئے ہم لوگ اُن سے بہت عزت اور احترام سے ملے

جب اُس کے والدین اور گھر والے آئے تو اُس نے اُن سب کے سامنے بھی اس بات کا اعتراف کیا اور کہا۔

''سارے معاملے کی ذمہ دار میری ماں ہے۔'' اُس کے بھائی اور ابو نے اُسے دو تھپڑ مارے' لیکن ہم لوگوں نے اُن کو سمجھایا کہ ہمارے گھر یہ سب نہ کیا جائے اور عزت سے اس کو اپنے ساتھ لے جائیں لڑکی خود بھی رہنا نہیں چاہتی تھی' سو چند گھنٹے کی دلہن جو دعاؤں اور سجی گاڑی میں عزت کے ساتھ اپنے سسرال آئی تھی واپسی میں ڈانٹ پھٹکار اور تھپڑوں کے ساتھ اپنے والدین کے ساتھ واپس چلی گئی تھی اللہ ایسی اولاد کسی دشمن کو نہ دے جس نے جیتے جی اپنے والدین کو مار ڈالا اُن کے والدین کی حالت دیکھی نہیں جارہی تھی وہ لوگ بار بار ہم لوگوں سے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ رہے تھے۔

''ہم بے قصور ہیں' ہماری بیٹی ایسا کرے گی ہمیں معلوم نہ تھا۔''

دوسرے دن ولیمے کی تقریب ہونی تھی' لہٰذا صبح ہوتے ہی سب سے پہلے جس جس کو ولیمے کی دعوت دی تھی' ولیمہ کینسل کا پیغام پہنچایا' پھر بھاگم دوڑی شروع ہوئی' باورچی کے پاس جاکر کھانے کا آرڈر کینسل کروانا' پھر ہال والے کے پاس جاکر ہال کینسل کروایا ہر بندہ وجہ پوچھ رہا تھا اور جو سچ تھا وہی سب کو بتایا گیا' لوگ کانوں کو ہاتھ لگا رہے تھے کہ قیامت قریب ہے۔

شادیاں بنتے بگڑتے خوب دیکھیں لیکن ایسا کبھی نہیں دیکھا اور سنا' لیکن یہ ایک حقیقت تھی پھر ہم نے لڑکی والوں کو کہا کہ آپ اپنے جہیز کا ایک ایک سامان لے جائیں' وہ بہت شرمندہ تھے اور خلاء مانگ رہے تھے جب وہ سامان لینے آئے

غزل

بے سہاروں کو قضا ساتھ لیے پھرتی ہے
خشک پتوں کو ہوا ساتھ لیے پھرتی ہے

یہ بھی خوش فہمی ہے جو مانگو گے مل جائے گا
کیا اجابت کو دعا ساتھ لیے پھرتی ہے

آپ کی یاد میرا درد بھی ہے درماں بھی
دھوپ ہے اور ردا ساتھ لیے پھرتی ہے

بادِ صرصر نے چراغوں کو سلایا پہلے
اور اب ایک دیا ساتھ لیے پھرتی ہے

اُس کی پھوٹی ہوئی تقدیر سرِ راہ ملی
بے وفاؤں کی وفا ساتھ لیے پھرتی ہے

پھول بوئے تو رضا پھول ہی آخر پائے
عمر عملوں کی جزا ساتھ لیے پھرتی ہے

رضا اللہ حیدر۔ اوکاڑہ

تو دیکھا نہیں جارہا تھا کہ ابھی جہیز آیا اور اب کس بے دردی سے واپس جارہا ہے' اُن کی ماں اور بہنیں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں اور ہم لوگ دلاسہ دے رہے تھے اِس کے سوا ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔

وہ لوگ کہہ رہے تھے۔

''ہماری بیٹی ہی بدنصیب ہے جو اتنے بھرے گھر کو لات مار گئی اور اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی۔'' باخدا ہماری ساری ہمدردیاں لڑکی کے والدین کے ساتھ تھیں کہ اللہ اُن کے حال پر رحم کرے۔

اس افسوسناک واقعے کے تین دن بعد بڑی بہن اپنی فیملی کے ساتھ کینیڈا چلی گئی' کیونکہ ان دونوں بہنوں کی واپسی کی ٹکٹیں بک تھیں' اور چھوٹی بہن کو چھ دن بعد امریکہ جانا تھا' ہمارے گھر میں اُداسی چھا گئی تھی۔

کسی چیز میں دل نہیں لگ رہا تھا' بھائی الگ اداس تھا کہ ناحق بے قصور مجھے پریشانی اور شرمندگی اٹھانی پڑی اب چھوٹی بہن کے جانے کا ٹائم ہو رہا تھا اور دکھ اِس بات کا تھا کہ یہ بے چاریاں شادی میں شرکت کے لیے پانچ سال بعد آئی تھیں اتنی تیاریوں کے ساتھ' اور اب پتا نہیں کب دوبارہ آمد ہو اب قدرت کا کھیل دیکھیں کہ اللہ نے میرے بھائی کے لیے آسانی کا انتظام کیا۔

امی کے فلیٹ کے سامنے ایک فیملی رہتی تھی دونوں فیملی ایک دوسروں کو چودہ پندرہ سال سے جانتی تھیں لیکن آپس میں کوئی خاص تعلقات نہ تھے بس دعا سلام تھی اور پوری بلڈنگ کو یہ بات پتہ تھی کہ کس طرح شادی ہوئی اور دلہن واپس چلی گئی اور سب لوگ ہمارے گھر اور خاص طور پر لڑکے کی شرافت کے گواہ تھے' غرض کہ فلیٹ کے سامنے جو فیملی تھی انہوں نے بڑی راز داری سے امی اور بہن کو بلایا اور کہا کہ آج میری بھانجی کا عصر میں نکاح ہونا تھا اور پرسوں رخصتی کا انتظام ہے۔

لیکن عین نکاح کے وقت لڑکے والوں سے کچھ اختلافات ہو گئے اور رشتہ ختم ہو گیا' آپ میری بھانجی کو اپنی بہو بنالیں' کیونکہ میری بھانجی بالکل بے قصور ہے وہ لڑکے والے لالچی نکلے تو ہم نے رشتہ ختم کر دیا۔

لڑکی کی پرسوں شادی ہے' ہال وغیرہ سب بک ہے خدا کے لیے اس خاندان کی لاج رکھ لیں' گھر آکر اس رشتے پر مل کر سب نے غور کیا' چھوٹی بہن کے جانے میں تین دن باقی تھے لہٰذا ایک ہی دن کے اندر اندر لڑکی دیکھی وہیں ہاں کی اور پھر اُسی تاریخ پر جو لڑکی والوں نے ہال بک کروایا تھا شادی ہوئی اب ایک دن میں کس طرح تیاری ہوئی اس کی الگ کہانی ہے خوب بھاگم دوڑ مچی تھی۔

لڑکی ماشاء اللہ گمان سے زیادہ پیاری پڑھی لکھی بائیس سال کی انٹر پاس تھی۔ اس کے والدین بھی بہت شریف اور اعلیٰ خاندان سے ہیں' آج ماشاء اللہ بھائی کی شادی کو تین مہینے ہو چکے ہیں' اور وہ خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔

وہ دونوں جب آپس میں اپنی اپنی کہانی پر بات کرتے ہیں تو بے ساختہ ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو بالکل فلمی سین ہوا۔

لیکن کسی نے سچ کہا کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں۔ اللہ میرے بھائی بھابی کو سدا خوش رکھے آمین۔

☆☆......☆☆

ایسی کہانیاں جو انسانی عقل اور سوچ سے ماورا ہیں

جنات کا استاد

کاشف بٹ کا خیال

گماں پرست یقیں کا پتا بتاتے ہیں
یہ سادہ لوگ ہوا میں گرہ لگاتے ہیں

غزالہ نزہت فاطمہ

نیم کے پیڑ تلے مسجد کے کچے صحن میں بیٹھے ہوئے بچے با آواز بلند اپنا آموختہ دہرا رہے تھے۔ مولوی صاحب حسب معمول اونگھ رہے تھے مگر اتنے بھی نہیں کہ کہیں کوئی شاگرد زیر' زبر یا



پیش کی غلطی کرے اور وہ اسے شڑاپ سے چھڑی مار کر درست نہ کروادیں۔

الف زبر آ' الف زیر اے' الف پیش اؤ' پہلا کلمہ طیب جیسی ملی جلی آوازوں کے شور میں اچانک ایک گھمبیر سی آواز پر ملا جی ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔

''میاں جی! السلام علیکم!''

خلاف معمول نووارد کے سلام کا جواب دینے کی بجائے انہوں نے اسے گھور کر دیکھا اور چند ثانیے تک ساکت و جامد کھڑے رہ گئے۔ بچوں کی آوازوں کا انہیں اتنا تجربہ ہو چکا تھا کہ آوازوں کے اس ملغوبے میں وہ ہر شاگرد کی آواز الگ پہچان لیتے تھے۔ جبھی تو وہ اس اجنبی سی گرجدار آواز پر سوتے سے جاگ پڑے اور بمشکل تمام بول سکے۔

''وعلیکم السلام......!''

ان کے سامنے ایک موہنی سی صورت والا سات آٹھ سال کا لڑکا سر جھکائے کھڑا تھا اور اندر آجانے کی اجازت کا طلبگار تھا۔ سرتاپا سفید براق شلوار قمیض میں ملبوس اس ننھے اجنبی کو وہ انکار نہ کر سکے۔

''آجاؤ میاں! اندر آجاؤ' اکیلے آئے ہو کیا؟ کوئی اماں باوا نہیں آئے تمہارے ساتھ؟''

لڑکا کیا چاہے دو آنکھیں کے مصداق ایک ہی جست میں ڈیوڑھی پھلانگتا منبر مسجد کے قریب آ کر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی نظریں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے مولوی صاحب کے سوالات کا کوئی جواب نہ دیا۔ شاید وہ کسی اگلے ممکنہ استفسار کا منتظر تھا۔ مولوی صاحب کو خود ہی پوچھنا پڑا۔

''کیوں میاں! کون ہو تم اور کہاں سے آئے ہو؟ کیا کچھ پڑھنا وڑھنا چاہتے ہو؟''

''جی' جی مولوی صاحب آپ مجھے اپنی شاگردی میں لے لیجیے۔''

مولوی صاحب جو اس کے معصوم سراپے میں کھوسے گئے تھے اُس کی اس قدر شستہ بات چیت پر ایک بار پھر گڑبڑا گئے اور فوری ہامی بھرنے کے بجائے اسے گھورتے ہوئے بولے۔

''کیا تمہارا تعلق اسی گاؤں سے ہے؟ یہاں تو لوگ پنجابی بھی ٹھیک سے نہیں بولتے اور تم ہو کہ اردو بول رہے ہو۔''

لڑکا ذرا نہ گھبرایا اور تڑ سے بولا۔

''وہ......مولوی صاحب! دراصل میں اس سامنے والے جنگل کے پیچھے واقع گاؤں سے آیا ہوں جہاں ندی بہتی ہے۔ آپ کو تو پتا ہی ہے پچھلے ماہ موسلا دھار بارشوں کی وجہ سے وہاں سیلاب آگیا تھا اور اس سے بہت سارے درخت بھی اکھڑ گئے تھے' گھر بہہ گئے تھے ہمارا گھر بھی اسی میں ڈوب گیا تھا۔ اس طرح میں اپنے والدین سے بچھڑ گیا اور اب میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس رہوں کیونکہ اس گاؤں کے تمام بچے آپ سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں' اسی نیم کے درخت تلے اس کی بڑی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں ہے' میں یہیں رہا کروں گا۔''

مولوی صاحب نے اس قدر مدلل گفتگو سنی تو حیرت سے بولے۔

''لڑکے! تمہاری عمر کیا ہے قد کاٹھ سے تو تم سات آٹھ سال کے لگتے ہو مگر گفتگو بڑوں جیسی کرتے ہو۔''

''میں جی پورے بارہ برس کا ہوں۔ بیماری کی وجہ سے میرا قد چھوٹا رہ گیا ہے۔'' وہ بڑے

اعتماد سے بولا۔
اس کی یہ بات سن کر تمام بچے کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔
''ہی ہی ہاہاہا......'' ملا جی نے وہیں بیٹھے بیٹھے سب کو ایک ایک چھڑی ٹکا دی اور پھر لڑکے سے مخاطب ہوئے۔
''اچھا پتر! تم آج سے خود کو ہماری شاگردی میں سمجھو اور ہاں میاں! نام کیا ہے تمہارا؟''
''معراج الدین ولد سراج الدین جی۔''
اس کی ٹھیٹھ اردو پر دیہاتی بچے ایک بار پھر ہی ہی کرنے لگے۔ اب کے مولوی صاحب بھی ہنس پڑے۔ سب بچوں کو چھٹی دے دی اور طالبان (طلباء یہاں طالبان کہلاتے تھے) کو حسب معمول ہدایت جاری کر دی کہ اگر کہیں سے کوئی اچھا سا سالن مل جائے تو اسے الگ کٹورے میں ڈال لینا میرے واسطے۔ دال ساگ ہمیں ہضم نہیں ہوتے۔''
نووارد لڑکا یہ بات سن رہا تھا اسی لیے جلدی سے بولا۔
''میاں جی! آج میں لاؤں کھانا آپ کے لیے؟ میری بہن اس سے اگلے گاؤں میں رہتی ہے اور بڑا اچھا کھانا بناتی ہے۔''
ملا جی کے منہ میں تو پانی ہی بھر آیا پھر بھی دکھاوا کرتے ہوئے بولے۔
''تم کہاں اتنی رات کو اگلے گاؤں جاؤ گے' آج ویسے بھی چوہدری جی کے ہاں سے اچھا کھانا آ جائے گا' جمعرات ہے ناں! جاؤ اب اور خلیفہ سے کہہ دینا مجھے ملا جی نے بھیجا ہے' وہ تم کو تمہارے سونے اور پڑھنے کی جگہ دکھا دے گا۔''
اسے ایک کچے مگر بڑے سے حجرے میں جہاں باقی سارے طالبان رہتے تھے' پہنچا دیا گیا اور وہ سب کے ساتھ کھجور کی چٹائی پر سو گیا۔

☆......☆......☆

معراج الدین ولد سراج الدین مولوی علم دین کا باقاعدہ شاگرد بن گیا۔ اس کا حافظہ تو بلا کا تھا۔ اس نے ایک ہفتے میں ہی بغدادی قاعدہ ختم کر لیا اور صرف تین ماہ میں پورا قران پاک ختم کر لیا اور اب تو وہ اسے حفظ بھی کرنے لگا تھا۔ مولوی صاحب بڑے حیران تھے کہ آج تک ہزاروں شاگردوں کو پڑھا چکے تھے مگر ایسا حافظہ ایسی روانی اور خوش الحانی کبھی دیکھنے سننے میں نہیں آئی تھی۔ جب بھی اس کا آموختہ سنتے تو کچھ گڑبڑا سے جاتے کہ یہ لڑکا انسان بھی ہے یا کوئی ماورائی مخلوق؟ وہ ایسا سوچتے ضرور تھے مگر اپنا یہ خیال ظاہر کبھی بھی ہونے دیا کہ کہیں بددل ہو کر بھاگ ہی نہ جائے۔ وہ اب حافظ قرآن بھی بن چکا تھا مگر اب انہیں اس سے پیار سا ہو گیا تھا اس لیے اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔ مولوی صاحب نے عمر بھر شادی نہ کی بس درس و تدریس ہی اُن کی زندگی کا حاصل رہے۔
ایک رات مولوی جی جب کسی کا نکاح پڑھوا کر لوٹے تو زیادہ مرغن کھانا کھانے کی وجہ سے پیٹ میں تکلیف سی محسوس ہوئی۔ بسیار خوری کے ایسے مواقع پر وہ صرف ہینگ کوٹ کر پھانک لیتے تھے اور بھلے چنگے ہو جاتے تھے مگر آج وہ ہینگ بھی ختم ہو چکی تھی اور دوبارہ منگوانے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ دراصل بسیار خوری کا یہ موقع کوئی چھ ماہ بعد بڑے صاحب کے بیٹے کی شادی کے موقع پر آیا تھا ورنہ تو دال ساگ والی روٹی تو وہ صرف ضرورتاً اور تھوڑی سی ہی کھایا کرتے تھے' محض پیٹ کا دوزخ بھرنے کو۔

☆......☆......☆

سارے لڑکے سو چکے تھے کیونکہ رات بھیگ چکی تھی مگر معراج الدین معمول جاگ رہا تھا اور عبادت الٰہی میں مشغول تھا۔ مولوی صاحب درد سے کراہ رہے تھے۔
''ارے کوئی ہے جو مجھے کہیں سے ذرا سی ہینگ لا دے' کوئی سنتا ہی نہیں۔ ہائے' ہائے' ہائے اللہ!''
معراج نے سوچا استاد صاحب تکلیف میں ہیں اور اگر ان کی بروقت مدد نہ کی تو شاید اللہ تعالیٰ میری عبادت ہی قبول نہ فرمائے۔ ادھر سارے شاگرد مصلحتاً سوئے رہے۔ اتنی رات گئے کون اپنی نیند خراب کرے اتنی ٹھنڈ میں مگر معراج الدین ہمیشہ کی طرح خدمت کے لیے تیار' جائے نماز لپیٹ کر طاق میں دھری اور ملا جی کے سر پر جا کھڑا ہوا۔
''میاں جی' میں لا دوں آپ کو ہینگ مجھے پتا ہے ہینگ کہاں ملتی ہے؟''
''تم؟ تم کیسے لاؤ گے؟ اتنے ذرا سے تو ہو تم' کیا تمہیں اندھیرے میں ڈر نہیں لگتا۔''
''نہیں جی! میں تو اپنے سارے کام جب چاہوں کر لیتا ہوں اور مجھے اندھیرے سے بھی ڈر نہیں لگتا۔''
مولوی جی پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے کیونکہ رات کا دوسرا پہر تھا اور یہ ننھا سا لڑکا باہر جانے کو تیار تھا۔
''اچھا! اگر تم بضد ہی ہو تو پھر دور نہ جائیو' یہ نکڑ والے بنیے سے ذرا سی ہینگ مانگ لائیو' کہہ دیجیو ملا جی منگوا رہے ہیں۔''
لڑکا تو جیسے اجازت کا منتظر ہی تھا۔ یوں بھاگ کھڑا ہوا گویا ہوا ہو گیا ہو محاورتاً نہیں حقیقتاً اس کے باہر نکلتے ہی اچانک باہر تند و تیز ہوائیں چلنے لگیں اور موسلا دھار بارش بھی ہونے لگی۔ یکا یک بہت سے کتے اور بلیاں رونے لگیں۔ مولوی صاحب کا تو دل ہی دہل گیا کیونکہ کمرے میں روشن مٹی کا دیا بھی ہوا کے جھونکے سے ٹمٹما کر یکدم گل ہو گیا۔ حجرے کے در و بام لرز اٹھے۔ ملا جی حیران تھے کہ تاروں بھری پُرسکون رات میں طوفان باد و باراں کہاں سے آ گیا۔ وہ دل ہی دل میں پشیمان سے ہوئے کہ بن ماں باپ کے بچے کو رات کے وقت باہر کیوں بھیج دیا؟ اگر اسے کچھ ہو گیا تو؟ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ چکے کیونکہ دھڑ سے دروازہ کھلا...... وہ...... وہ واپس آ گیا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ باہر طوفان کا نام و نشان تک نہ رہا تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ ساکت و جامد ہو گئی تھی جیسے بقول فیض

جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

مولوی صاحب کا درد اسی دم ہرن ہو گیا جب انہوں نے دیکھا کہ معراج کے کپڑے بالکل خشک تھے حالانکہ وہ کوئی چھاتا یا برساتی بھی اوڑھ کر نہ گیا اور واپس بھی چند منٹوں میں ہی آ گیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ہاتھ میں ہینگ کی ایک گٹھی بھی نہ تھی۔
''کیوں بیٹا لے آئے ہینگ؟'' ملا جی نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے پوچھا۔
''جی میاں جی! لے آیا ہوں۔'' وہ خاصا پُراعتماد تھا۔
''تو پھر دیتے کیوں نہیں؟ لاؤ ادھر پکڑاؤ' کھڑے میرا چوکھٹا کیوں دیکھ رہے ہو؟''
''وہ جی باہر صحن میں لا کے رکھ دی ہے میں نے' آپ چل کر دیکھ لیں اور جتنی چاہے لے لیں۔'' وہ بدستور پُراعتماد تھا۔ مولوی جی تو بھنا ہی اٹھے۔

''اب میں باہر جا کر صحن سے خود ہینگ کی گٹھی اُٹھا کر لاؤں' جب بازار سے لے آئے ہو تو میرے ہاتھ میں پکڑانے میں کیا قباحت ہے؟''

''آپ آئیں تو سہی۔'' وہ انہیں بازو سے پکڑ کر باہر صحن میں لے گیا۔

میاں جی کی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ صحن ہینگ کی بوریوں سے بھرا پڑا تھا' شاید منوں کے حساب سے ہینگ لا کر استاد کی خدمت میں حاضر کر دی گئی تھی۔ انہوں نے ایک نظر ہینگ کے انبار کو دیکھا اور پھر معراج کے چہرے کی جانب اس کا سر حسب معمول استاد صاحب کے سامنے جھکا ہوا تھا۔

''اِدھر آؤ' اور ذرا میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھو۔'' انہیں پہلی بار اتنے باسعادت شاگرد پر غصہ آ رہا تھا۔ ان کا پیٹ کا درد کافور ہو چکا تھا۔ انہوں نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولے۔

''سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟ کیا تمہارا تعلق جنات سے ہے؟''

''جی میاں جی' آپ کا خیال درست ہے۔ میں واقعی ایک جن زادہ ہوں۔''

اس کا سر استاد کے قدموں پر تھا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا اور برابر معافی کی درخواست کر رہا تھا۔ مولوی صاحب نے پیار سے اس کا سر اپنے قدموں سے ہٹایا اور اسے گلے سے لگا لیا' جب اسے کچھ ڈھارس ہوئی تو اس نے بتایا۔

''اسی نیم کے پیڑ پر جس کے نیچے سارے بچے بیٹھ کر قرآن پاک پڑھا کرتے ہیں میرا بسیرا ہے۔ میں روزانہ قرآن پاک کی تلاوت سنا کرتا تھا' تب میرا دل بھی چاہا کہ آپ کی شاگردی میں آ جاؤں۔''

مولوی صاحب جو بغور اس کی بات سن رہے تھے' یکا یک جیسے ہوش میں آ گئے۔

''اچھا! اب تمہارا مقصد پورا ہو چکا ہے اور تم قرآن پاک حفظ بھی کر چکے ہو' بے شک تم نے آج تک مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا مگر مجھے خدشہ ہے کہ اگر کسی دن تمہیں کسی بات پر غصہ آ گیا اور انجانے میں تم نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کر دیا تب کیا ہوگا؟ بہتر ہے کہ اب تم چھٹی کرو اور اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ' کبھی نہ آنے کے لیے اور اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں تمہیں بوتل میں بند کر کے زمین میں گاڑ دوں گا سمجھے تم۔''

ملاجی کی ڈانٹ سن کر وہ باقاعدہ ہچکیاں لے کر رونے لگا اور بولا کہ جس استاد صاحب نے اسے علم سکھایا' وہ ان کی جی بھر کر خدمت بھی نہ کر سکے گا اس بات کے لیے وہ زندگی بھر شرمسار رہے گا۔

مولوی صاحب نے اسے تسلی وتشفی دی اور کہا کہ انہوں نے اپنا حق اس پر معاف کیا اس لیے اب وہ سیدھا اپنی دنیا میں لوٹ جائے۔ وہ بادل نخواستہ مولوی صاحب کو 'اللہ حافظ' کہہ کر کسی ننھے سے بچے کی طرح دروازہ کھول کر کوٹھڑی سے باہر چلا گیا۔ مولوی صاحب کو اس کی آنسو بھری آنکھیں رات بھر رُلاتی رہیں۔ مولوی صاحب کی ہدایت پر ہمیشہ کے لیے لوٹ جانے سے پہلے اس نے ہینگ بھی واپس گودام میں پہنچا دی۔

☆......☆☆......☆☆

اس قصے کو ایک لمبا عرصہ ہو گیا اور میاں جی سمیت سب لوگ اسے بھول بھال گئے کیونکہ وہ جن زادہ دوبارہ لوٹ کر نہ آیا تھا۔

مولوی صاحب تعویذ گنڈے کے بھی ماہر

تھے۔ اکثر گاؤں کی نوجوان لڑکیوں پر جب کبھی ہسٹیریا کا دورہ وغیرہ پڑتا اور ماں باپ اسے جن بھوت وغیرہ کی کارستانی سمجھتے تو وہ میاں جی سے ہی رجوع کرتے اور وہ بھلی چنگی ہو جایا کرتیں۔

اُس شام بھی ایک ایسی ہی لڑکی کو ان کے پاس لایا گیا۔ وہ بن جل کی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی اور بار بار سر پٹخ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ بال بکھرے گئے تھے وہ انہیں عام لڑکیوں سے مختلف نظر آئی۔ انہوں نے اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور اپنا عمل جاری رکھا۔ کچھ دیر تک بڑبڑاتے ہوئے آنکھیں بند پھر یکا یک وہ چیخ ہی پڑے۔

''معراج الدین تم! تو تم اپنی دنیا میں واپس نہیں گئے؟ کیا تم نے اپنا وعدہ بھلا دیا اور یہ بھی بھول گئے کہ استاد کی نافرمانی کتنا بڑا گناہ ہے؟ میں یقیناً تمہیں اس کی سخت سزا دوں گا۔ تم اس لڑکی کو فوراً چھوڑ دو اور ابھی میں تمہارا علاج کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے مجھے تمہیں بوتل میں بند کرنا ہی پڑے گا۔''

''نہیں میاں جی' ایسا نہ کرنا رسولؐ کے واسطے' میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب آپ کی اس دنیا میں کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا مگر صرف ایک بار اور آخری بار اپنی دنیا میں لوٹ جانے سے پہلے آپ کی قدم بوسی کرنا چاہتا تھا۔ آپ کا آخری دیدار کرنا چاہتا تھا۔ میں ہرگز ایسی حرکت نہ کرتا اگر اپنی اس سے پہلے والی کوشش میں کامیاب ہو جاتا۔

شاید آپ کو معلوم ہو کہ گاؤں کے زمیندار کی ٹھیک اسی رات کسی نے چارپائی الٹ دی تھی جب میں نے آپ کو 'اللہ حافظ' کہا تھا' میرا پروگرام یہ تھا کہ یوں اس بندے کے علاج کے لیے آپ کو بلایا جائے گا اور میں اپنے محترم استاد کا دیدار ایک بار پھر کر سکوں گا مگر مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا کیونکہ مجھے بھگانے کے لیے کسی جادوگر کو بلا لیا گیا۔ اس سے مجھے سخت تکلیف پہنچی کیونکہ اس نے مجھے واقعی ایک بوتل میں بند کر کے کھیت میں دبا دیا تھا۔

وہ تو میری لگن سچی تھی کہ زمین پر ٹریکٹر پھیرا اور اب پورے بیس سال بعد مجھے رہائی ملی تو میں نے سوچا کہ استاد کے دیدار کے شوق میں' میں نے بڑی کڑی سزا پائی ہے۔

اب تو میں ضرور آپ کی زیارت کر کے رہوں گا چاہے آپ ایک بار پھر کیوں نہ مجھے کسی بوتل میں بند کر دیں۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا مگر آج میری خواہش تو پوری ہو گئی ہے۔ اب بس مجھے آخری بار قدم بوسی کا موقع دیں۔ میں اپنے استاد کے قدموں کی خاک پلکوں پر لگانا چاہتا ہوں۔''

مولوی صاحب نے اسے لڑکی کو چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ اسے گلے سے لگا کر خوب پیار کیا اور دروازہ کھول دیا۔ لڑکی یکدم ہوش میں آ گئی مگر مولوی صاحب کی چشم نم نے دیکھا وہ ننھا جن زاد چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا باہر چلا گیا۔ اپنے استاد صاحب کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے وہ باد صبا کے نرم جھونکے کی طرح دھواں دھواں ہو کر فضاؤں میں تحلیل ہو گیا۔ نہ کوئی ہوا چلی نہ کوئی طوفان آیا مگر جب ملاجی واپس مسجد لوٹے تو نیم کا برسوں پرانا درخت جڑ سے اکھڑ کر ان کی قدم بوسی کر رہا تھا۔

☆☆......☆☆

دل کی آواز

حمیرا راحت کا شعر

گفتگو کو مری تاثیر عطا کی اُس نے
جو بھی ہے میری دعاؤں میں اثر اس نے دیا

شیما عبدالقیوم

عشق لفظ جیسے ہی زبان پر آتا ہے، ذہن میں لاتعداد عشقیہ داستانیں گھومنے لگ جاتی ہیں، ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی مہیوال، لیلیٰ مجنوں، مگر عشق میں بھی اسرار کے کئی رنگ ہیں، آج میں



آپ کو عشق میں اسرار کے تین رنگ دکھانا بلکہ بتانا چاہوں گی، جن میں ایک شخصیت ہے اور اُس کے گرد گھومتے، اس کے اپنے نرالے خوب صورت اسرار والے رنگ ہیں۔ میں خود بھی اِن میں سے ایک داستان کا حصہ ہوں مگر اپنا سلسلہ سب سے آخر میں دکھانا اور بتانا چاہوں گی۔ میری اِس اسرار سے بھری داستانِ عشق میں محبوب ماں ہے۔ عاشق اولاد ہے اور کہیں عاشق ماں ہے اور محبوب اولاد......

میری امی اللہ انہیں زندگی دے صحت دے میری نانی سے بہت محبت کیا کرتی تھیں اور یہی حال میری نانی کا بھی تھا کہنے کو اُن کی چار اولادیں تھیں مگر سب سے زیادہ محبت انہیں اپنی دوسری نمبر کی بیٹی یعنی میری امی سے رہی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک نانی حیات رہیں ہم نے بھی اُن کا جھکاؤ امی کی طرف ہی دیکھا۔ امی بتاتی ہیں کہ انہوں نے کبھی نانی کی حکم عدولی یا دل آزاری نہیں کی، جو کہا فوراً مان لیا جو فیصلہ کیا یا حکم دیا سر جھکا دیا۔

آخری دنوں میں نانی زیادہ تر ہاسپٹل میں رہیں، ہم نے امی کو کبھی بھی نہ چڑتے دیکھا اور نہ ہی اُلجھتے، وہ گھر کے سارے کام نمٹاتیں، ہمیں اسکول سے واپسی پر کھانا کھلاتیں، شام کا کھانا تیار کرتیں اور پھر ہاسپٹل روانہ ہوجایا کرتیں، یہ کام یہ ذمہ داری انہوں نے نانی کے انتقال تک نبھائی۔

نانی امی سے بہت راضی اور خوش رہتیں، آخری دنوں میں جب ان کی یادداشت بوجہ بیماری اور ضعیفی کمزور ہوچکی تھی وہ صرف امی کو پہچانتیں اور نام پکارا کرتیں۔

وہ جمعہ کا روز تھا امی کا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا وہ بار بار دوپٹہ سے آنکھیں صاف کرتیں اور روز مرہ کے کاموں میں مصروف ہوجاتیں، اچانک فون کی گھنٹی بجی تو وہ بے اختیار بول اٹھیں۔

''امی نہیں رہیں'' اور یہی خبر ماموں نے بذریعہ فون کال دی۔ خیر ہم سب ماموں کے گھر پہنچ گئے، خالہ کا رو رو کر برا حال تھا، جبکہ امی کی حالت بھی بہت خراب تھی۔ نہلاتے وقت امی نے بھی نانی کو غسل دیا، نانی کی تدفین کے بعد نماز مغرب ہوئی۔ امی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کتنے بڑے غم کا سامنا کر رہی ہیں۔ ان کی واحد دوست، راز دار نانی تھیں، جن سے وہ تمام باتیں تمام معاملات شیئر کیا کرتی تھیں اور اب یہ رشتہ بھی تمام ہوا۔

اگلے دن امی کافی مطمئن اور خاموش تھیں۔ سوئم کے بعد ہم لوگ گھر آ گئے۔ بڑی بہن نے امی سے پوچھا۔

''امی آپ کو نانی امی بہت یاد آئیں گی ناں، اب تو ہم انہیں کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔'' تو امی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ دھیمے سے مسکرا کر بولیں۔

''جانتی ہو بیٹا تمہاری نانی مجھ سے اور میں اُن سے محبت نہیں بلکہ عشق کرتے تھے۔ میں نے امی کو خواب میں دیکھا انہوں نے مجھے خوب پیار کیا اور کہا۔

''بیٹی تم نے مجھے نہلایا مجھے اچھا لگا، مگر مجھے کروٹ دی تو سہارا نہیں دیا، مجھے بہت تکلیف ہوئی، تم غم مت کرنا میں تمہارے ساتھ ہوں اور رہوں گی۔'' یہ بتاتے بتاتے ہوئے امی رو پڑی تھیں، اور آج تک جب جب امی کسی غم یا پریشانی میں مبتلا ہوجاتی ہیں تو انہوں نے نانی کو ہمیشہ خود سے قریب پایا ہے۔

دوسرا واقع میری ساس کا ہے وہ اپنی امی کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی رہیں، چار بہنیں ہیں مگر جو مقام ان کا اپنی والدہ کے دل میں رہا کوئی

دوسری بیٹی نہ حاصل کر پائی۔ ساس محترمہ بتایا کرتی ہیں کہ اِن کی امی ان کو ہمیشہ یہ گانا سنایا کرتیں۔

’’تو جہاں کہیں بھی جائے میرا سایہ ساتھ ہوگا۔‘‘ بہت کم عمری میں اُن کی شادی ہوگئی شومئی قسمت جہاں وہ بیاہ کر آئیں' انہوں نے اِن پر ظلم و ستم کا جو جو طریقہ آتا سب آزمایا' ماں یہ سب دیکھ دیکھ کر تڑپ جایا کرتیں' مگر شادی شدہ بیٹیوں کے لیے سوائے دعا کے مجبور ماں باپ اور کیا کر سکتے ہیں' سو وہ بھی ہر ممکن ان کو آسانی پہنچانے کی کوشش میں سرگرداں رہتیں۔ ساس نے جب دیکھا کہ ان کی تکلیفیں ماں کی اذیت کا سبب بنتی ہیں تو انہوں نے میکہ جانا کم کر دیا' کچھ اپنے بھی ایسے وقتوں میں اپنی آسانیاں ڈھونڈنے میں جت جاتے ہیں' لہٰذا یہ کنارہ کش ہوگئیں' یہاں تک کہ والدہ کا انتقال ہوگیا' کچھ عرصے بعد انہوں نے خواب میں والدہ کو دیکھا کہ وہ تاکید کر رہی ہیں۔

’’تمہارے پیسے فریج پر رکھے ہیں اٹھالو۔‘‘ انہوں نے اُن کے ایصالِ ثواب کے لیے پڑھائی کی مگر یہ خواب وہ وقتاً فوقتاً دیکھتی رہیں کچھ عرصے بعد پتہ چلا کہ جائیداد میں اُن کا حصہ انہیں نہیں دیا گیا تو والدہ پریشان ہو ہو کر خواب میں آتی رہیں۔ ایسے ہی میری شادی کے بعد ساس کی حالت کافی خراب ہوئی' آپریشن ہوا تو اسپتال سے لے کر گھر تک والدہ کی موجودگی برابر رہی۔ یہ وہ چاہتیں وہ محبتیں ہیں جو دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی پلٹ پلٹ کر آپ تک آتی ہیں۔ یہ وہ پاکیزہ عشق ہیں' جو کریں تو نیکیاں ہی نیکیاں ثواب ہی ثواب' حدیث میں ہے کہ ماں کے چہرے کو محبت سے دیکھنے کا اجر حج کے برابر ہے۔

اب جاتے جاتے میں' میرے ساتھ ہونے والا ایک واقعہ آپ کو سنانا چاہوں گی۔ مجھے اپنے ماں باپ سے بہت بہت محبت رہی اور ابھی بھی ہے۔ والد حیات نہیں رہے مگر اُن سے جڑی لاتعداد یادیں ہیں جو کبھی نہ کبھی ضرور شیئر کروں گی۔ میری امی ہمیشہ مجھے کہا کرتی کہ تم میرا طوطا ہو' میری جان تم میں بند ہے اور یہ بات ببانگ دہل کہا کرتیں اور میرے بہن بھائی بعض دفعہ اس بات پر اُن سے جھگڑا بھی کرتے۔ وہ مجھے اب بھی یہی کہتیں ہیں اللہ انہیں زندگی اور صحت کاملہ عطا کرے کہ تم میرا عشق ہو مجھے تمام اولاد سے پیاری ہو۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں کالج میں زیرِ تعلیم تھی' اچانک امی کو فوڈ پوائزن ہوگیا اور ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرنا پڑا' اُن کی حالت دن بدن غیر ہوتی جا رہی تھی لہٰذا انہیں دوسرے ہاسپٹل شفٹ کر دیا گیا' میں وہ وقت کبھی نہیں بھول سکتی۔ امی کا بلڈ پریشر' شوگر سب بہت بڑھ چکا تھا Unconsion تھیں بالکل' دوسرے ہاسپٹل میں انہیں فوری طور پر ٹریٹمنٹ اسٹارٹ کی گئی۔ ڈاکٹرز نے صاف اور واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اُن کا ایک گردہ ناکارہ ہو چکا ہے بلڈ میں بوریا بڑھ گیا ہے' غرض کہ انہوں نے ہمیں ہر طرح کی سچویشن کے لیے تیار رہنے کا نوٹس دے دیا۔ ہم سب کا رو رو کر برا حال تھا۔ وہ رات قیامت کی رات تھی۔ میں نے دیگر بہنوں اور بھائی کو گھر روانہ کر دیا' ابو کو بھی کہا کہ گھر چلے جائیں کہ اُن کی اپنی حالت ٹھیک نہیں تھی' میرے ساتھ میری خالہ زاد اور ماموں زاد بہن بھائی تھے۔ امی کو آئی سی یو میں رکھا ہوا تھا اور ہم ویٹنگ ایریا میں تھے۔ آئی سی یو کافی فاصلے پر تھا۔ میں پریشان بیٹھی دعاؤں میں مشغول تھی رات کے تقریباً دو یا ڈھائی کا ٹائم ہوا کہ مجھے امی کی آواز سنائی دی' جیسے انہوں نے مجھے میرا نام لے کر پکارا ہو' میں اپنا وہم سمجھ کر دوبارہ دعاؤں میں مشغول ہوگئی کہ اچانک مجھے صاف آواز آئی وہ مجھے پکار رہی تھیں' میں نے خالہ زاد کو کہا آپی مجھے امی نے آواز دی ہے۔ انہوں نے کہا پاگل ہو خالہ بے ہوش ہیں' انہیں اپنا ہوش نہیں دوسرا آئی سی یو یہاں سے بہت فاصلے پر ہے۔ تم کو وہم ہو رہا ہے' مگر میں تیزی سے اٹھی اور تقریباً دوڑتی وہ طویل کوریڈور کراس کرتی آئی سی یو تک پہنچی ہی تھی کہ آئی سی یو کا دروازہ کھول کر ایک نرس باہر نکلی میں نے اُسے اپنی والدہ کا نام بتا کر ریکوئسٹ کی کہ مجھے ان سے ملنا ہے وہ مجھے پکار رہی ہیں' اُس نرس نے میرا نام دہرایا میں نے اثبات میں سر ہلایا وہ حیران و پریشان مجھے لیے اندر داخل ہوگئی۔ ڈیوٹی ڈاکٹرز سے کچھ کہا وہ مجھے پلٹ کر دیکھنے لگے۔ میں امی کے بیڈ کے پاس آ گئی وہ نیم بے ہوشی میں میرا نام پکار رہی تھیں' میں نے اُن کے ماتھے پر پیار کیا۔ ہاتھ چومے اور رونے لگی۔ ڈاکٹر حیران حیران میرے پاس آئی اور پوچھنے لگی کہ کیا واقعی آپ کو اپنی امی کی آواز آ رہی تھی' میں نے روتے روتے سر ہلا دیا۔

’’Strange Very Strange۔‘‘ یہ کہتی وہ واپس چلی گئی۔ دوسرے ڈاکٹر جو کہ پیچھے تھے انھوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے۔

’’بیٹا یہ واقعہ بہت حیران کر دینے والا ہے' ہمیں یقین نہ آتا اگر ہم یہ سب اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتے۔ آپ اِدھر ہی رہیں اپنی والدہ کے ساتھ یہ دل اور روح کے رشتے ہیں' وہ ساری رات میں نے اپنی امی کے ساتھ رہی' بفضلِ خدا ہم امی کو مکمل صحت یاب ہونے پر گھر لے آئے۔ میں آج بھی جب یہ سب یاد کرتی ہوں اور جب دوسرے لوگوں سے ماؤں اور والدین کی محبت کی ایسی باتیں یا واقعات سنتی ہوں تو اسرارِ عشق پر میرا یقین مزید کامل ہوتا جاتا ہے۔

☆☆......☆☆

غزل

قسمت مرے مکان کی آ کر بدل بھی دے
ویرانیاں بہار میں دلبر بدل بھی دے

پارس کی خوبیوں سے سُنا' مالا مال ہے
بے کار شے ہوں' مجھ کو تو چھو کر بدل بھی دے

اُکتا گیا ہے ایک ہی منظر سے آدمی
اے رب تو اب جہاں کا منظر بدل بھی دے

سوتا رہے گا ' صبر کے بستر پہ کب تلک
ناداں تو اٹھ کے اپنا مقدر بدل بھی دے

سالوں سے کُند خنجر ہی کرتا ہے استعمال
قصاب مرے دوست یہ خنجر بدل بھی دے

کرتا ہے آہ و زاریاں لُٹنے کے بعد تُو
رہبر یہ چالباز ہے رہبر بدل بھی دے

رہتا ہے بے قرار تُو اس گھر میں ہر گھڑی
یادوں کے اِس مزار کو ساگر بدل بھی دے

محمد صالحین ساگر

ایک نہایت ہی منفرد دلچسپ پُراسرار سلسلہ جسے آپ عرصہ دراز تک یاد رکھیں گے

املتاس

علامہ سید مجتبیٰ حسین رضوی کا خیال

اس دل کا تحیر تھا آئینہ' اس سر کا تصور تھا مو قلم
تمثال پہ نقطے لگا کیے' تصویر بدلتی چلی گئی

(دوسری قسط)

شازلی سعید مغل

زرد پھولوں کے ترتیب وار باندھے گئے چھوٹے چھوٹے گچھے' املتاس کے پھول تھے وہ......اورنگزیب کمرے کا دروازہ بند کر چکا تھا اور بند دروازے سے چپکا کھڑا تھا۔ نظریں جیسے املتاس کے پھولوں پر گڑسی گئیں تھیں۔ کچھ دیر جیسے وقت ٹھہر سا گیا تھا۔ ہوا نے بھی سانس روک لی تھی جیسے...... اورنگزیب بھی دم سادھے ایک ٹک املتاس کے پھولوں کو دیکھے جا رہا تھا سحر طاری تھا مکمل طور پر اس پر' اور یہ سحر ٹوٹا جب اس کی جیب میں پڑا موبائل مدھرتا سے بج اٹھا۔ ہوا کی ساکن سانس چل پڑی ہو جیسے اورنگزیب اس تنویمی کیفیت سے باہر آ گیا۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا نظریں ابھی بھی پھولوں پر جمی تھیں' ایک لمحے بس وہ ایک لمحہ تھا۔ جب اس نے موبائل فون کی اسکرین پر چمکتے نمبر کو دیکھا۔ نظر جیسے ہی پھولوں سے ہٹی دوسرے لمحے ڈریسنگ ٹیبل خالی ہو گئی۔ ایسے جیسے یہاں کبھی کچھ رکھا ہی نہیں گیا ہو' اورنگزیب پتھر کا ہی ہو گیا تھا اُس لمحہ' سیل فون وقفے وقفے سے بج رہا تھا۔ دوسری طرف جو کوئی بھی تھا۔ بڑا ہی مستقل مزاج تھا' جیسے اسے یقین ہی تھا کہ فون ریسیو کیا ہی جائے گا۔ نمبر اورنگزیب کے لیے تو اجنبی تھا مگر اس کے دوست احباب تو اکثر نمبر بدلتے ہی رہتے تھے چنانچہ ریسیو کرنا ضروری تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے کال ریسیو کر لی۔

''ہیلو......'' اُسے اپنی ہی آواز اجنبی لگ رہی تھی' ہلکی سی لرزش والی متوحش کیفیت کیوں نہ ہوتی؟ جو واقعات اس کے ساتھ اُس رات پیش آئے اور اب ڈریسنگ پر موجود زرد پھولوں کے گچھے کا آناً فاناً غائب ہو جانا مضبوط سے مضبوط اعصاب کو انتہائی درجے پر کشیدہ کر سکتا تھا۔ اورنگزیب نے اب تک جس طرح یہ سب برداشت کیا تھا۔ اس پر خود اس کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

اس کے ہیلو کی آواز کے جواب میں دوسری طرف سے اسے ایک کھنکتی سی آواز سنائی دی۔ آواز کیا تھی؟ دنیا کے سارے ترنم گویا ایک جگہ جمع ہو گئے ہوں۔

''اورنگزیب صاحب میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔'' وہ ایک لڑکی تھی جس نے یہاں وہاں کی بات

کے بجائے سیدھے سیدھے کام کی بات کی۔

''کک کک کون ہیں آپ؟'' اورنگزیب نے مرتعش لہجے میں کہا۔

''ارے آپ تو ہکلے ہیں۔'' پھر ایک ہوشربا ہنسی اس کے کانوں میں رس گھولتی چلی گئی۔ وہ بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔ پھر جیسے اُسے کچھ خیال ہوا۔

''اوہ......! سوری سوری پلیز ڈونٹ مائنڈ۔'' وہ جو بھی تھی سنبھل گئی۔

''میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''مگر کیوں کون ہیں آپ؟'' اورنگزیب نے اس کے ہکلے کہنے پر مکمل طور پر خود پر قابو پالیا تھا۔

''میں نو آموز پینٹرز کی حوصلہ افزائی کرتی ہوں' ابھی کے لیے اتنا کافی ہے میرے خیال میں...... آپ ملیں باقی باتیں مل کر ہوں گی۔ اوکے......'' اورنگزیب کے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوئی۔

''ایڈریس ابھی سینڈ کرتی ہوں۔'' اُس نے اورنگزیب کا اگلا سوال پڑھ لیا وہ ایڈریس مانگنے ہی جارہا تھا۔

''اوکے...... بائے...... اللہ حافظ۔''

اورنگزیب نے فون رکھ دیا۔ ارے میں نے تو اس کا نام ہی نہیں پوچھا۔ ابھی وہ سوچ رہا تھا کہ سیل فون پر میسج کی بپ بج اٹھی۔ سنہرا...... نام اسکرین پر چمک رہا تھا اور نیچے وہ ایڈریس تھا جہاں سنہرا نے بلایا تھا۔ وہ کوئی آرٹ گیلری تھی۔ جہاں اسے بلایا گیا تھا۔ اُس نے فون ایک طرف رکھ دیا اس سارے وقفے میں اُس کی نظریں گاہے گاہے ڈریسنگ ٹیبل پر اٹھتی رہی تھیں' بات وہ اُس اجنبی لڑکی سے کررہا تھا مگر اُس کا سارا دھیان املتاس کے پھولوں کے گرد تھا' جو اس کے سامنے سے اچانک غائب ہوگئے تھے جیسے کہ وہ کبھی ڈریسنگ ٹیبل پر تھے ہی نہیں۔

وہ فون ایک طرف رکھ کے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کے پاس آچکا تھا' اس کا دماغ ماؤف سا ہورہا تھا۔ وہ ٹیبل کے اردگرد گھوم کر اور ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی اپنی بے ترتیب اشیاء کو الٹ پلٹ کر نہیں تقریباً جھاڑ جھاڑ کر دیکھ رہا تھا' اس کی ٹیبل پر تھا ہی کیا...... پرفیومز' ہیئر برش' ٹوتھ پیسٹ' شیمپو' ٹشو پیپرز کے خالی اور بھرے ہوئے ڈبے اور اس کی کتابیں پینٹنگز کے کلر اور برش' ڈریسنگ ٹیبل اچھی خاصی بڑی تھی مگر اورنگزیب کے پھوہڑپن کا مکمل شاہکار تھی۔ وہ اپنی ضرورت کی ہر چیز صرف اور صرف ڈریسنگ ٹیبل پر ہی رکھتا تھا۔ یہ تو اس کی ماں اور امل دس پندرہ دن کے بعد اس پر پڑا کاٹھ کباڑ اُٹھا کر اُس کی اصل شکل بحال کرتی تھیں۔ دادی تو اس کی ڈریسنگ ٹیبل کو پرچون کی دکان کہتی تھیں۔ کیونکہ جو چیز گھر میں کہیں دستیاب نہ ہو' کبھی تو وہ اورنگزیب کی ڈریسنگ ٹیبل پر مل ہی جاتی تھی۔ عموماً...... دیا سلائی اور موم بتیاں تک' ایسے میں وہ دیوانہ وار ایک ایک چیز تقریباً جھاڑ جھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں نے دھوکہ کھایا تھا کیا...... وہ شام سے املتاس کو لے کر ہی پریشان تھا۔ پھر فیصل کے بھائی کے ولیمے کے وقت کا سارا منظر اُس کی نظروں کے سامنے' صحن سے گزرتے زرد پھولوں کا گچھا اس پر گرنا' بلکہ پھینکے جانا سب اس منظر میں شامل تھا۔

''تو کیا ڈریسنگ ٹیبل پر کچھ نہیں تھا' میرے اپنے دماغ کا فتور تھا' دھوکہ تھا۔'' اس نے خود سے کئی مرتبہ یہ سوال کر ڈالا اس پر جیسے ایک جنون سا سوار ہونے لگا' وہ اپنا چکراتا سر تھام کے بیڈ پر بیٹھ گیا' سر چکرارہا

تھا اور گلہ سوکھ رہا تھا۔ اس نے سائیڈ ٹیبل سے پانی کی بوتل اٹھا کر منہ سے لگالی اور ایک ہی سانس میں حلق میں انڈیل لی۔

اورنگزیب ایک لاپرواسا لڑکا ضرور تھا مگر بزدل نہیں تھا' مضبوط اعصاب بھی رکھتا تھا' مگر یہ سب جو شام سے ہورہا تھا اتنا واضح...... اس کے اعصاب بری طرح شل ہوچکے تھے۔ چکراتا سر تھوڑا سا سکون میں آیا تو اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بیدار ہورہی تھیں' نظریں اب بھی بار بار ڈریسنگ ٹیبل پر اٹھ رہی تھیں وہ خود کو سمجھا رہا تھا کہ آنگن میں املتاس کے نیچے تک تو حقیقت میں پھول اس پر پھینکے گئے تھے مگر کمرے میں سارا منظر اشتباہ نظر تھا۔ خود کو سمجھاتے سمجھاتے وہ بے دم سا ہونے لگا تھا۔ نیند آنکھوں سے بچھڑ کر کہیں گم ہوگئی تھی' بیٹھنے کی سکت نہیں تھی تو وہ لیٹ گیا' اُس نے ہزار ہا کوششیں کرلیں مگر دماغ ایک جگہ جامد ہوگیا تھا۔ کبھی تمام مناظر کی فلم چلنے لگتی۔ وہ کروٹیں لے لے کر تھک گیا تھا' اس کے گمان میں بھی کبھی ایسی رات نہیں تھی جو اسے آج گزارنا پڑ رہی تھی' ایک ہی نکتہ پر سوچتے سوچتے اس کا دماغ شل ہورہا تھا۔ بے اختیار اُس کی نظریں دیوار گیر گھڑی پر پڑیں' چار بجنے والے تھے اور پھر نیند کی دیوی کب اُس پر مہربان ہوئی معلوم نہ ہوا۔

معلوم نہیں وہ نیند تھی یا کچھ اور تھا...... ابھی وہ نیم غنودگی کے عالم میں تھا کہ اچانک اُسے اپنے اوپر ایک دباؤ محسوس ہوا جیسے کوئی وزنی سل اس پر رکھ دی گئی ہو اس کے حواس بیدار ہوگئے اس نے نادیدہ بھاری وزن پرے دھکیلنا چاہا مگر اس کے ہاتھ بے جان تھے وہ چیخنا چاہ رہا تھا مگر ہزار جتن کے باوجود اس کے گلے سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ پھر اچانک اس کی کوشش کامیاب ہوئی اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اور اس کی آنکھ کھل گئی' تب اسے احساس ہوا وہ ایک خواب دیکھ رہا تھا ایک خوفناک خواب......

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا' دیوار گیر گھڑی اس کے سونے کا دورانیہ محض ایک گھنٹہ بتارہی تھی۔ کمرے میں بے حد حبس اور گھٹن تھی بلکہ اسے یوں لگا جیسے درجہ حرارت بڑھ رہا ہو...... حالانکہ یہ نومبر کے وسطی دن تھے جن کو عام زبان میں گلابی جاڑوں کے دن بھی کہا جاتا تھا مگر اس کے کمرے کا درجہ حرارت مئی جون کے گرم ترین دنوں کی یاد دلارہا تھا' اس بار وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل آیا لاؤنج میں آکر آٹومیٹک لاک ریلیز کر کے اگلے پل وہ صحن میں تھا۔ اُس نے بے صبری سے گہرے گہرے سانس لینے شروع کردیے جس سے اس کا ذہنی خلفشار کم ضرور ہوا تھا وہ اتنی صبح ہرگز اٹھنے کا عادی نہ تھا' اگر گھر میں سے کوئی دیکھ لیتا تو حیران کم پریشان زیادہ ہوجاتا۔

لاتعداد سوالات کیے جاتے اور اس سے پہلے یہ نوبت آئے اس نے ماں کے کمرے کے دروازے پر خود دستک دے دی' ویسے بھی محسن شیرازی گھر پر نہیں تھے وہ قدرے بے خوف تھا۔ فائزہ تقریباً اسی وقت اٹھتی تھیں کمرے کے دروازے پر دستک نے انہیں چونکا دیا تھا۔

''ارے تم کیا ہوا......؟'' وہ دروازہ کھولتے ہی اورنگزیب کو چھو چھو کر دیکھنے لگیں کہیں وہ بیمار تو نہیں ہوگیا۔

''ارے امی کچھ نہیں ہوا مجھے اصل میں فیصل کی طرف جانا ہے' میں رات رُکا نہیں تو صبح ناشتے پر بلالیا ہے اُس نے۔'' وہیں کھڑے کھڑے اُس نے بہانہ گھڑ لیا۔

''تم سوئے نہیں ہو رات بھر کیا بات ہے؟'' فائزہ بیٹے کے چہرے کا بغور مطالعہ کر رہی تھیں' اور اورنگزیب کی نظریں ماں کے عقب سے اندر کمرے میں جس کو تلاش کر رہی تھیں اُس پر ٹکی ہوئی تھیں سامنے بیڈ پر امل سو رہی تھی۔ اتنی گہری نیند کہ اُسے دونوں کی گفتگو کی قدرے تیز آواز بھی ڈسٹرب کرنے سے قاصر تھی۔ املتاس کو دیکھ کر اورنگزیب کے چہرے پر ملے جلے تاثرات ابھرے' فائزہ اس کی پریشانی کو بھانپ کر مسکرا پڑیں۔

''مجھے پتہ ہے تم سے امل کی ناراضگی برداشت نہیں ہو رہی' تم دوستی کرنے کے لیے بے چین ہو' اس لیے سو بھی نہیں پا رہے تم' صحیح کہہ رہی ہوں نا۔'' وہ خوشی سے بولیں۔ اورنگزیب کا املتاس کے لیے ایسے بے چین ہونا چھپا نہ تھا مگر یہ ضرور چھپا ہوا تھا کہ اس کے پیچھے وجہ وہ نہیں جو وہ سمجھ رہی تھیں اور خوش ہو رہی ہیں...... اورنگزیب کچھ کہے بغیر مسکرا دیا اور فریش ہونے چلا گیا۔ فجر کی اذانوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

صولت بیگم کے کمرے کا دروازہ بھی کھل چکا تھا' وہ بھی نماز کی تیاریوں میں مصروف تھیں اورنگزیب کافی دیر بعد کمرے سے نکلا' ناشتہ لگ چکا تھا۔ امل بھی کالج جانے کے لیے تیار تھی' اورنگزیب نے جونہی املتاس کی جانب دیکھا اس نے منہ پھلا کے دوسری طرف کر لیا۔ سب ناشتہ کر رہے تھے اورنگزیب نے اپنی ماں کے کہنے پر صرف چائے پی تھی۔

آج صولت بیگم بھی کچھ متفکر نظر آ رہی تھیں' ناشتہ بھی ٹھیک سے نہیں کیا تھا ابھی تک فائزہ کی پوری توجہ صولت بیگم کی جانب گئی نہیں تھی کیونکہ صبح سے ہی اورنگزیب کی باتوں میں اُلجھی ہوئی تھی' پھر ناشتہ بنانا اور دیگر کام انہوں نے ساس کے گہرے تفکر میں ڈوبے چہرے کی جانب خاص توجہ دی ہی نہیں تھی ورنہ سب چھوڑ کر سبب ضرور جاننا چاہتیں' ابھی بھی وہ اورنگزیب کو چائے پینے پر اصرار کر رہی تھیں' اُس نے خاموشی سے چائے پی...... اپنی بائیک اٹھائی اور گھر سے باہر نکل آیا اورنگزیب نے ماں سے تو فیصل کے گھر کا کہا تھا کہ ناشتے پر بلایا ہے' فیصل اس کا سب سے گہرا دوست تھا دونوں ایک دوسرے کے محرم راز تھے وہ رات ہی طے کر چکا تھا کہ وہ فیصل کو ایک ایک بات بتا کے مدد کی درخواست کرے گا۔ جیسی رات اس نے گزاری تھی وہ دوبارہ گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اتنی صبح فیصل کے گھر جانا کیا ٹھیک رہے گا؟'' اس نے خود سے سوال کیا' گو وہ گہرا اور بے تکلف دوست تھا مگر شادی کا گھر تھا' بہت سے مہمان اُس کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ اسے پتہ تھا کہ اگر وہ آدھی رات کو بھی فیصل کو پکارے گا تو وہ سب چھوڑ کر اُس کی بات سننے آئے گا۔ مگر کل اس کے بڑے بھائی کا ولیمہ تھا اورنگزیب اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ سیل فن کی رنگ بجنے لگی' بائیک سڑک کے ایک کنارے کھڑی کر کے اس نے جیب سے فون نکالا سامنے اسکرین پر 'سنہرا' جگمگا رہا تھا۔

''اوہ......!'' اس نے نا چاہتے ہوئے بھی اس وقت فون ریسیو کر لیا۔

''ہائے۔'' وہ اس کے ہیلو سے پہلے ہی بول پڑی۔

''سوری ٹو ڈسٹرب یو۔ مگر پروگرام تھوڑا چینج ہو گیا ہے۔ اگر آپ مصروف نہیں ہیں تو ہم ابھی مل سکتے ہیں۔''

''ابھی......'' اورنگزیب اس نئی افتاد سے پریشان ہو گیا تھا' رات بھی اس نے ایسے وقت فون کیا تھا

جب وہ اپنی زندگی کے بھیانک ترین تجربے سے گزر رہا تھا اور اب جب وہ اپنے ساتھ ہونے والے اُن پُراسرار واقعات کو کسی اپنے کے گوش گزار کرنے جلد از جلد پہنچنا چاہ رہا تھا تو پھر اس سنہرا نے بکھیڑا ڈال دیا تھا۔ وہ سوچ کر ہی رہ گیا کونسی طاقت تھی جس نے اس کے اس وقت کے بھرپور انکار کو اقرار میں بدل دیا۔ اُس وقت سنہرا نے اُسے آرٹ گیلری کے بجائے سی سائیڈ آنے کا کہا تھا۔

اورنگزیب نے اپنی بائیک اسٹارٹ کی اب اُس کا رخ فیصل کے گھر کے بجائے ساحل سمندر کی جانب تھا۔ بائیک کو تقریباً اڑاتے ہوئے وہ ساحل سمندر پر پہنچ گیا۔ ورکنگ ڈے تھا اور صبح کا وقت اور وہ بھی سردیوں کی صبح' ساحل پر برائے نام لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ اِکا دُکا اونٹ والے بھی ساحل پر دکھائی دے رہے تھے۔ اورنگزیب نے بائیک کھڑی کر دی تھی وہ ساحل پر کھڑا تھا اور سمندر کی لہریں اس کے پیروں کو بھگو رہی تھیں جب لہریں اس کے پیروں سے لپٹ کر واپس مڑتیں تو اس کے اندر عجیب سا سکون در آتا' سامنے تا حد نگاہ سمندر تھا ایک جانب نیلا صاف آسمان سمندر سے گویا گلے مل رہا تھا' جو اشتباہ نظر تھا مگر نہایت حسین' اچانک ایک بڑی لہر آئی اور لاتعداد سیپیاں ساحل پر بکھرا گئی۔ اورنگزیب کی توجہ تھوڑی دیر کے لیے سب سے ہٹ کر اُن مناظر کی طرف ہو گئی تھی' وہ سمندری لہرں اور سیپیوں کے اِن مناظر میں اتنا مگن ہوا کہ اُسے یاد ہی نہیں رہا کہ وہ یہاں کس لیے آیا ہے۔ ہوش آیا تو تب جب ایک اونٹ والا اپنے اونٹ کی رسی تھامے اس سے وقت معلوم کر رہا تھا۔ اس کو ٹائم بتا کر وہ خود پریشان ہو گیا' اُسے یہاں آئے تقریباً آدھا گھنٹہ ہو رہا تھا۔ اور سنہرا کا کہیں کوئی پتہ نہ تھا۔ جب اورنگزیب نے اُس سے پوچھا تھا۔

''میں تمہیں پہچانوں گا کیسے؟''

''میں تمہیں پہچان لوں گی تم پریشان نہ ہونا۔'' یہ اُس اجنبی لڑکی کا جواب تھا' سنہرا کا خیال آتے ہی وہ ساحل پر متلاشی نظروں سے دیکھنے لگا وہ جن حالات میں اُسے فون پر ملی تھی اُسے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ وہ کیسی ہو گی۔ سنہرا سے متعلق سارے خیالات اُسے یہاں سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر آ رہے تھے کون تھی کیا تھی؟ یہ ساری باتیں بس اب کھلنا ہی چاہتی تھیں۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ سیل فون بج اٹھا۔ کال سنہرا نے کی تھی۔ اُس نے ریسیو کی۔

''کہاں ہیں آپ سنہرا صاحبہ......'' اورنگزیب زچ ہوتی بے تابی سے بولا۔

''میں بس آ رہی ہوں' اپنے پیچھے دیکھو۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

اورنگزیب نے مڑ کر دیکھا تو تھوڑی دور فون کان پر لگائے کالی ساڑھی میں سرو قد اسمارٹ سی لڑکی چلی آ رہی تھی۔ سورج کی نرم شعاعیں اس کے چہرے کو منور کر رہی تھیں جن سے بچنے کے لیے وہ ایک ہاتھ کا چھجا بنائے ایک ہاتھ سے فون کان پر لگائے اورنگزیب سے آن ملی۔

''ہیلو نائس ٹو میٹ یو۔'' اُس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اورنگزیب نے ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

''میں اورنگزیب......'' اورنگزیب کو اپنی آواز دور کہیں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''اور میں سنہرا۔'' وہ ہنس پڑی عجب اسرار تھا اس کی ہنسی میں جیسے کہیں دور کسی نے چاندی کی گھنٹیاں چھیڑ دی ہوں۔ لہجہ ایسا دل میں سما جانے والا جیسے دور روہی کے سرد ٹیلوں پر رات کے وقت کسی نے بانسری

چھیڑ دی ہو۔ بانسری کی مدھرتا تھی اس کے لہجے میں' چہرہ گو میک اپ سے عاری تھا۔ البتہ اس کی گہری سیاہ آنکھیں' جن کو اس نے بڑے اہتمام سے کاجل کے گہرے گہرے حاشیوں سے مزید فسوں کار بنایا ہوا تھا' اورنگزیب ٹکٹی باندھے اس کی جانب دیکھے جا رہا تھا۔

''اوہ ہیلو مسٹر اورنگزیب...... کیا ہوا آپ کو ٹھیک تو ہیں نا؟'' اس نے اورنگزیب کی آنکھوں میں تقریباً جھانکتے ہوئے کہا تھا۔

''اوہ سوری......!'' اورنگزیب نے اس کا ہاتھ یک لخت چھوڑ دیا تھا وہ بری طرح جھینپ گیا تھا۔

سنہرا اُس کی کیفیت سے محظوظ ہو رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں...... ایسا ہوتا ہے...... آپ کا قصور نہیں ہے' مجھ سے ملنے والے اکثر کھو جاتے ہیں۔'' اس کی کیفیت اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ بھید بھرا سرسراتا ہوا لہجہ' یہ کہتے ہوئے سنہرا نے اچانک کچھ ایسی نظروں سے اورنگزیب کی طرف دیکھا کہ اس کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ اس نے سنہرا کی آنکھوں میں شعلے سے لپکتے دیکھے تھے۔ اورنگزیب نے گھبرا کر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا' خوف کی ایک لہر اسے اپنے جسم میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

تب وہ ایک دم ہنس دی تھی۔

''ارے تم تو ڈر ہی گئے۔'' اورنگزیب کو تو پے در پے ایسے حالات سے سابقہ پڑ رہا تھا کہ وہ ایک لمحے کے لیے تو واقعی ڈر گیا تھا۔ لیکن اس نے اعصاب کنٹرول کیے اور چہرے پر نمائشی مسکراہٹ سجائی۔

''آؤ وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' سنہرا نے کچھ دور ایک سنسان سی جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اس کے ساتھ چلنے لگا۔ جابجا اونچے نیچے پتھر پڑے تھے سنہرا ایک پتھر پر ٹک گئی اور اورنگزیب بھی اس کے ساتھ پڑے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا۔

سورج کا نقرئی تھال نیلے آسمان پر کافی ابھر آیا تھا۔ سمندر کی لہریں ان تک آ کر واپس پلٹ رہی تھیں' آگے پیچھے آتی لہروں اور واپس پلٹنے والی لہروں نے عجیب سا ردھم پیدا کر دیا تھا۔ عجیب اسرار بھرا ردھم......

لہروں کے ملنے جدا ہونے کا ردھم نقرئی تھال کی طرح ابھرتا سورج جس کی کرنیں سمندر کے نیلے پانی پر اس طرح منعکس ہو رہی تھیں کہ دور تک جیسے چاندی بکھری پڑی ہو' ساحل کی ریت کے ذرے بھی نقرئی چمک دے رہے تھے۔ عجیب منظر تھا۔

''تمہیں سمندر کیسا لگتا ہے؟'' سنہرا نے اورنگزیب کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''اچھا لگتا ہے۔'' اورنگزیب نے جواب دیا۔

''اور تمہیں......'' اورنگزیب نے واپس سوال کیا۔

''مجھے......!'' سنہرا نے ایک گہرا سانس لیا اور دھیرے سے خارج کیا۔

''بہت گہرا پُراسرار' اتھاہ گہرائی تک حد نگاہ سے...... بڑے بڑے رازوں کا امین...... رکھوالا...... گہرا...... گہرا...... اور گہرا......'' وہ سمندر کی طرف دیکھتے دیکھتے جیسے اُس کی گہرائیوں میں چلی گئی ہو۔

موسم خنک تھا...... سمندری ٹھنڈی ہوائیں بھی تھیں' مگر سنہرا کے چہرے پر خصوصاً پیشانی پر ننھی ننھی پانی

کی بوندیں نظر آنے لگیں' اورنگزیب دم بخود اس کی طرف دیکھ رہا تھا بے اختیار اس نے اپنی پیشانی پونچھی جہاں خشکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اب پانی کی بوندیں سنہرا کے چہرے پر پھسل رہی تھیں۔

''تم کون ہو؟'' اورنگزیب نے اپنے اعصاب جمع کرتے ہوئے پوری قوت سے پوچھا تھا۔ آواز اِس کوشش میں قدرے بلند ہو گئی تھی۔ سنہرا سے فون کی گفتگو سے اب تک اس نے جتنی باتیں کی تھیں نہایت دھیمے لہجے میں کی تھیں' یہ اب تک پہلی بار ایک واضح اور کوئی دوٹوک سا لہجہ تھا۔

''کون ہو تم؟'' اورنگزیب نے اس کے چہرے پر نظریں جمائی ہوئی تھیں۔

سنہرا نے بڑے اطمینان سے اس کی طرف دیکھا' اور ایک دم کھلکھلا کر ہنس دی۔

''کون ہوں میں؟ سورج کی کوئی پہلی کرن' کوئی گیت' بنجاروں کا گیت' پتھروں کا گیت' صحرا کا گیت' کوئی حسین رقص' ہاں یہ جو سمندر ہے نا اُس کی کوئی اونچی لہر۔'' سنہرا نے سمندر کو پھر والہانہ انداز میں دیکھا۔ پھر وہ ایک لمحے کو رُکی...... اورنگزیب کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے تم تو پتھر کے بن گئے۔'' وہ پھر ہنس پڑی۔

''اچھا چلو تم بتاؤ میں کون ہو سکتی ہوں' تمہیں کیا لگی میں اور ہاں دیکھو بے تکلفانہ بتا سکتے ہو میں تمہاری بات کا برا نہیں مانوں گی' ورنہ ایسی بے تکلفی کی اجازت میں کسی کو دیتی نہیں ہوں۔'' وہ شانِ بے نیازی سے بولی تھی۔

''تم لڑکی تو نہیں......''

''واٹ لڑکی نہیں...... دیکھو میں بہت برا مان سکتی ہوں۔'' سنہرا نے کہا

''اوہ سوری...... معاف کرنا۔'' اورنگزیب ہوش میں آ گیا۔

''میرا مطلب ہے تم مجھے ایک کہانی سی لگتی ہو۔ پُرتجسس' حیرت ناک' حیرت ناک بین حیرت انگیز...... دبیز پُراسرار کہانی لگی ہو...... یا......'' اورنگزیب رک گیا۔

''ہاں بولو یا کیا......'' وہ پُرشوق انداز میں گویا ہوئی۔

''یا کوئی حسین مورتی' حسین پینٹنگ' کسی مصور کا حسین ترین شاہکار...... مجھے لگتا ہے یہ مکمل تعارف ہے تمہارا...... اوہ نو سوری آپ کا......'' اورنگزیب گڑبڑا گیا۔

''اوہ سوئٹ نہیں نہیں' تم مجھے تم کہہ سکتے ہو...... کیا ہوا جو میں تم سے دو تین سال بڑی ہوں......''

''کیا...... بڑی ہو مجھ سے؟'' اورنگزیب نے حیرانگی سے کہا۔

''مگر کیسے مجھے تو برابر کی لگی ہو...... ویسے بھی لڑکیاں عمر چھپاتی ہیں مگر تم...... تم عجیب ہو۔'' اورنگزیب مسکرا دیا۔ اسے اب سنہرا سے باتیں کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

پہلے کی ساری کیفیت جیسے کہیں گم ہو گئی تھی' وہ ایک دم خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔

''مجھے پتہ ہے مگر میں نہیں چھپاتی' مجھے اس کی ضرورت نہیں...... مجھے پتہ ہے میں بڑی ہوں تو ہوں۔''

''درست کہا تم عام لڑکی تھوڑی ہو...... تم تو دبیز اسرار بھری کہانی ہو...... گیت ہو' سمندر کا پھولوں کا پتھروں کا' خوشبو کا صحرا کا...... ہواؤں پر لکھا گیت......''

''ارے واہ واہ...... کیا بات ہے میں تو تمہیں ایک مصور سمجھتی آئی تھی تم تو چھپے رستم نکلے شاعر لگتے ہو نہیں بلکہ افسانہ نگار کتنی خوبصورت تشبیہ دی مجھے ہواؤں پر لکھا کوئی گیت' واہ...... ہاں میں ہواؤں کا گیت ہوں' ہوا کے دوش پر ہر جگہ ملوں گی تمہیں۔'' اس نے پھر عجیب سے لہجے میں کہا اور پھر ہنس دی۔

اورنگزیب کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی' اب اسے سنہرا کے ساتھ باتیں کرنا اچھا تو لگ رہا تھا۔ مگر اُسے وقت کا احساس یک لخت ستانے لگا۔ کیونکہ ساحل پر گہما گہمی ہونے لگی تھی' سورج پوری آب و تاب سے اپنی شعاعیں بکھیرنے لگا تھا کئی اونٹ والے اور گھوڑے والے بھی ساحل پر نظر آنے لگے تھے۔ اُس نے اپنی ریسٹ واچ پر نظر ڈالی' دو گھنٹے ہو رہے تھے۔

''اُف وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے اس کے گزرنے کا پتہ نہیں چلا۔ اورنگزیب نے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے اچھا چلو ہم اب اُس کام کی بات کریں جس کے لیے میں نے تمہیں فون کیا......'' سنہرا بولی۔

''میں بھی یہی چاہتا ہوں آپ نے مجھے...... سوری تم نے مجھے آرٹ گیلری بلایا تھا۔''

آپ کہنے پر جس طرح سنہرا نے اُسے دیکھا تھا اورنگزیب کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

''ہاں میں نے ایک آرٹ گیلری بنائی ہے' مجھے آرٹ سے بے حد لگاؤ ہے اور اس میں میں تم جیسے ٹیلنٹڈ مگر نئے مصوروں کو روشناس کرانا چاہتی ہوں۔''

''مگر میں نے کبھی اپنی اس صلاحیت کو سنجیدگی سے نہیں لیا' تم تک یہ خبر کیسے پہنچی؟'' اورنگزیب نے پوچھا۔

''میگزین سے' تمہارے کالج میگزین کے ٹائٹل سے' وہ اپنی ایک دوست کے گھر دیکھا تھا۔'' وہ مسکرائی۔

''بس...... یا کچھ اور......''

''نہیں بس......'' اورنگزیب کے دماغ میں پے در پے سوالات آ رہے تھے' مگر وہ رک گیا۔

''اچھا ایسا کرتے ہیں' یہاں قریب ہی گھر ہے میرا' چلو میرے ساتھ' میں تمہیں کچھ نادر و انوکھی پینٹنگز دکھاتی ہوں۔ تم سے کیا بنوانا ہے' وہ بھی ڈسکس کرتے ہیں' کیا خیال ہے؟'' کہتے ہوئے سنہرا نے اورنگزیب کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑھ دیں۔

وہ تذبذب کا شکار تھا اس لیے نہیں کہ وہ جانا نہیں چاہتا تھا بلکہ اس لیے کہ اُسے فیصل سے ملنا تھا اور اب وقت ہو چلا تھا کہ وہ فیصل کے گھر جا سکتا تھا۔

''تم چل رہے ہو میرے ساتھ؟'' سنہرا نے عجیب طرح یہ جملہ ادا کیا تھا۔ اورنگزیب کے لیے انکار ناممکن ہو گیا تھا۔

''وہاں میری گاڑی کھڑی ہے آؤ...... تمہاری بائیک میرا ڈرائیور لے آئے گا۔''

وہ گاڑی تک پہنچ گئے تھے یہ ایک بلیک کلر کی اسکورپیو تھی' ایک لمبے تڑنگے باوردی ڈرائیور نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا تھا کیونکہ سنہرا اُسے بتا چکی تھی کہ وہ گاڑی لے کے جائے گی اور اورنگزیب کی بائیک ڈرائیور لائے گا' سنہرا کے بعد اُس کی گاڑی اور ڈرائیور کو دیکھ کر اورنگزیب دل میں داد دیے بغیر

نہ رہ سکا۔ سنہرا خود تو تھی ایک دلکش شاہکار' ایسی خوبصورتی کی مالک جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا' مگر اس کا ڈرائیور وہ کوئی ڈرائیور نہ لگتا تھا یونانی دیوتاؤں والا حسن تھا اس کے چہرے پر' بہت تمکنت تھی وہ کہیں سے بھی ڈرائیور نہ لگتا تھا اور سب سے اہم بات ابھی تک وہ ایک لفظ نہیں بولا تھا۔ سنہرا کے ہر بات کا جواب وہ سر کی جنبش سے ہی دے رہا تھا۔

اورنگزیب سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا' سنہرا نے بھی دورانِ سفر خاموشی اختیار کیے رکھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک گھر کے سامنے گاڑی رُکی تو وہ بولی۔

''چلیے جناب اورنگزیب صاحب...... میرا غریب خانہ آ چکا ہے۔''

اورنگزیب نے گاڑی سے باہر آ کر سنہرا کے غریب خانے کو سر اٹھا کر دیکھا' وہ ایک نہایت پُرشکوہ بنگلے کے سامنے کھڑے تھے' جس کو چاروں جانب سے پام کے درختوں نے گھیرا ہوا تھا' یہ ایک سفید رنگ کا بنگلہ تھا جس کی ہر کھڑکی ہر دریچہ پھولدار بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا' سنہرا کے ہمراہ گیٹ سے اندر جاتی سرخ اینٹوں کی روش پر چلتے ہوئے دونوں اطراف پھیلے لالے کی خوبصورتی پر وہ مبہوت ہی رہ گیا۔ عجیب انوکھی سی خوشبو چاروں جانب چکرائی پھر رہی تھی۔ اُس نے گہری سانس لی اور مہک اپنے اندر اتار لی۔ گھر میں داخل ہوئے تو اورنگزیب کو یوں لگا جیسے وہ کسی قدیم دور میں داخل ہو گیا ہو...... خوبصورت مرمریں فرش' بلوری آئینوں اور حسین منقش صندل کی لکڑی سے بنے فرنیچر سے مزین تھا' ہر چیز سفید تھی' سنہرا اُسے بٹھا کر اندر چلی گئی اور جب باہر آئی تو وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ کالی ساڑھی چینج ہو چکی تھی اس وقت وہ سفید ساڑھی میں ملبوس اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''گھر کیسا لگا تمہیں؟'' اُس نے اورنگزیب کی توجہ ہٹائی۔

''بہت خوبصورت بہت ہی خوبصورت۔'' اورنگزیب نے سچائی سے کہا۔

''اوہ میں نے پوچھا ہی نہیں' تمہیں تو بھوک لگی ہو گی نا۔'' سنہرا کے ٹوکنے پر اورنگزیب کو واقعی شدت سے بھوک کا احساس ہوا۔ وہ تو بھوک پیاس بھول ہی چکا تھا۔

''وقت کیسا بے رحم ہے نا...... دیکھو ایک لمحے میں بدل جاتا ہے' خود بدلتا ہے انسان کو اندر تک بدل دیتا ہے نا؟'' سنہرا نے اپنی کالی مسحور کن آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''کیا مطلب تمہارا؟'' اورنگزیب نے اُلجھن سے کہا۔

''مطلب تم بھوک و پیاس تک بھول گئے جبکہ کل تک یہ وقت تم پر نہیں آیا تھا تم بھوک کے کتنے کچے تھے؟'' سنہرا نے معنی خیز انداز میں اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' اورنگزیب کے احساسات جاگ سے پڑے۔

''تم تم...... تم کو کیسے معلوم؟''

''ارے ارے...... پریشان کیوں ہوتے ہو...... ریلیکس کرو پانی پیو' میں فیس ریڈر ہوں' ہر چہرہ دیکھ کر ٹھیک ٹھیک بتا دیتی ہوں۔'' وہ معصومیت سے بولی تھی۔

''اوہ......'' اورنگزیب نے کچھ کہے بغیر پانی کا گلاس اپنے گلے میں انڈیل لیا۔

''ایک منٹ رکو میں ابھی آئی۔'' پانچ سے سات منٹ کے اندر وہ چائے کے ساتھ کباب اور نہ جانے

کیا کیا اٹھا لائی۔ ٹرے میز پر رکھ کر اس نے خود ہی پلیٹ میں کباب نکالا اور اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''دیکھو' میں نے سوچا...... تم بہت تکلف کرو گے اس لیے خود ہی نکال کر دے دیا ہے کھا کر دیکھو' مجھے لگتا ہے تمہیں پسند آئے گا۔''

''یہ سب چائے کباب آپ نے خود بنائے ہیں؟'' اورنگزیب نے حیرانگی سے پوچھا۔ اس کی اُس حیرانگی پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ہاں کیوں میں نہیں بنا سکتی؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

''مجھے سب آتا ہے' سب بن سکتی ہوں میں سب کچھ۔'' اس کا لہجہ سرسرا رہا تھا۔

اورنگزیب نے اس بار اُسے محسوس نہ کیا' شاید جب سے ملی ہے اُسے سسپنس پھیلانے کی عادت ہی رہی ہے یہ سوچ کر وہ اس کے اس پل پل رنگ بدلتے لہجے کا عادی ہو رہا تھا' یا کھانے کی میز پر اتنے لذیذ کباب دیکھ کر کھانے کی طرف اس کا فطری میلان جاگ گیا تھا۔ وہ اب بڑے مزے سے چھری سے کاٹ کاٹ کر کانٹے سے اُٹھا اُٹھا کر ایک کے بعد ایک کباب کا ٹکڑا منہ میں ڈال رہا تھا۔

''ایک بات بتائیں؟'' اُس نے سنہرا کو دیکھے بغیر کہا۔

''کیا آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں؟'' اورنگزیب اس کے گھر کے سناٹے کے بارے میں کافی دیر سے سوچ رہا تھا' کوئی نوکر بھی نظر نہیں آیا تھا جب سے' بس وہ ایک ڈرائیور کے سوا اتنے بڑے گھر میں اکیلی تھی۔

''یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا؟'' وہ اُسے دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

''مجھے ابھی تک نہ کوئی آواز آئی نہ کوئی آتا جاتا نظر آیا۔'' اورنگزیب نے صاف گوئی سے کہا۔

''ضروری ہے کیا اگر تم کو کوئی نظر نہ آیا ہو تو' کوئی ہو ہی نہ میرا۔'' کہتے ہوئے اُس کا لہجہ نہایت عجیب سا ہو گیا۔ اتنا عجیب کہ اورنگزیب کے ہاتھ رک گئے۔

''سوری اگر برا لگا ہو تو۔''

''ارے نہیں سب گھر والے موجود ہیں' مگر میں اکیلی رہ رہی ہوں آج کل سب کہیں گئے ہوئے ہیں' جلد آ جائیں گے۔''

''آپ کو اکیلے میں ڈر نہیں لگتا؟'' اورنگزیب نے کہا۔

''نہیں......'' سنہرا نے کہا۔

''ڈر کس بات کا؟''

''مگر میں تو اتنے بڑے گھر میں اکیلے نہیں رہ سکتا' میں تو ڈر جاؤں۔'' اُس نے صاف گوئی سے کہا اور اُس کی بات سن کر سنہرا ہنس پڑی اور ہنستی چلی گئی۔ گھر کے پُراسرار سے سناٹے میں اُس کی ہنسی نہایت دلکش معلوم ہو رہی تھی بہت خوبصورت تھی اُس کی ہنسی' راگنی سی چھیڑ گئی ہو جیسے' اورنگزیب اُسے دیکھتا چلا گیا۔

''آپ میرا مذاق اڑا رہی ہیں؟''

''نہیں نہیں......'' اس نے اشارے سے کہا۔

''تم ڈرتے نہیں ہو' سنا اورنگزیب تم ہرگز ڈرپوک بزدل نہیں ہو' جیسے تمہیں اپنے مصور ہونے کا ادراک

نہ تھا' ایسے ہی تمہیں یہ نہیں پتہ کہ تم کیا ہو...... تم بہت بہادر ہو۔''

''ارے ارے مت کرو میری تعریفیں' جھوٹی ہیں سب۔'' اورنگزیب نے ٹوکا۔

''تعریف نہیں ہے حقیقت ہے...... میں نے دیکھا ہے تم بہت بہادر ہو۔'' کہتے کہتے سنہرا نے جو نگاہیں اٹھائیں اورنگزیب کے سارے بدن میں سرد لہریں شور مچانے لگیں' عجیب سی مہک اس کے اردگرد پھیلتی جا رہی تھی عجیب صندلی مہک' تیز ترین مہک جو سرشار سے زیادہ مدہوش کرتی تھی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر کرتی تھی' اسے محسوس ہوا اُس کی تمام حسیات منجمد ہوتی چلی جا رہی ہیں' عجیب سی تیز ترین ٹھنڈک کا احساس تھا اس کے گرد' جیسے وہ سرد طوفانی علاقے میں آ گیا ہو' اسے اپنے اعصاب جامد محسوس ہو رہے تھے' وجود میں سرد لہریں تھیں' سروزنی ہونے لگا تھا۔ وہ حرکت کرنا چاہتا تھا مگر جیسے پتھر کا نہیں برف کا بنا دیا گیا تھا۔ اس کے کانوں میں بس ایک آواز آ رہی تھی۔

''میں نے کل ساری رات تمہیں دیکھا ہے اورنگزیب' ساری رات میں تمہارے ساتھ تھی۔ تم کیسے کہہ سکتے ہو' کہ تم بزدل ہو' تم ہرگز بزدل نہیں ہو...... تم بہت بہادر ہو...... بہت۔''

اسے محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کی ایک ایک سوچ ایک ایک بات سنہرا جذب کرتی جا رہی ہے' سورج کی شعاعوں کی طرح منعکس ہو کر اس کی ساری سوچیں اس کا احوال سنہرا کے وجود میں اترتا جا رہا ہے...... وہ اس کے بارے میں وہ وہ باتیں بتا رہی تھی جو اس کی ماں کو ہی پتہ تھیں' اس کی ساری زندگی ایک ایک لمحہ وہ اورنگزیب کے سامنے یوں بیان کر رہی تھی جیسے کوئی کتاب کھلی رکھی ہو...... اورنگزیب نے بہت بار بولنا چاہا...... مگر اس کے اعصاب نے اس کا ساتھ نہ دیا سنہرا کے سارے ذکر میں املتاس کا ذکر نہیں تھا۔ وہ املتاس کی طرف آ نہیں رہی تھی۔ مگر جیسے ہی اورنگزیب کے ذہن میں املتاس کا نام آیا...... وہ ہنس پڑی ہنستی گئی۔

پھر پتھر جیسے بنے اورنگزیب نے دیکھا اُس کی مسحور کن آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ نکلے۔ آنسو جو بہہ رہے تھے اور پھر وہ جمتے گئے۔ اس کے چہرے پر ننھی ننھی برف کی بوندوں کی شکل میں' اس کے آنسو برف کے بن رہے تھے' وہ بے تحاشہ روئی کبھی سسکیاں لیتی اور کبھی دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیتی' کبھی اپنے منہ پر لگی برف کی بوندیں جھاڑتی' پھر وہ کھڑی ہوئی اپنی جھولی جھاڑنے لگی۔ اُف اتنی برف اتنے آنسو' اورنگزیب کی آنکھوں نے دیکھا۔ ایک برف کا ڈھیر لگ گیا اس کے سامنے...... یہ سب سنہرا کی آنکھوں سے نکلے آنسو تھے۔

کمرے کا درجہ حرارت کم سے کم تر ہوتا جا رہا تھا۔ اورنگزیب بے حس و حرکت موجود تھا وہ شاید اس ٹھنڈ سے نیلا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ریل سی چل رہی تھی سارے واقعات کی' سارے گھر والے دوست احباب سب یاد آ رہے تھے۔ وہ مر جائے گا تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا' یہ خیال آتے ہی اسے سب سے پہلے املتاس کا خیال آیا۔ اور املتاس کا خیال آتے ہی سنہرا رونے لگی تھی۔ املتاس سے کیا تعلق تھا سنہرا کا؟ وہ کیوں حد درجہ روئی...... اورنگزیب نے دیکھا وہ اب بھی رو رہی ہے آنسو آنکھوں سے نکلتے ہی برف بن جاتے' تھوڑی دیر میں جھولی بھر جاتی۔ سنہرا برف کی ننھی ننھی بوندیں اپنے دامن سے جھاڑ دیتی۔

اس نہایت ہی منفرد' دلچسپ پُراسرار ناول کی دوسری قسط کے لیے آئندہ ماہ نومبر کا انتظار کیجیے

یہ ہے آپ کی پسند، آپ کا انتخاب

مرتب: اشعر جواد

کلام بے زبان

ایک ہندو جو اپنے گروہ میں 'عابد' کہلاتا تھا' میرے پاس آیا اور یہ سوال کیا کہ آپ لوگ قرآنِ مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام کہتے ہیں حالانکہ کلام بے زبان کا ہو نہیں سکتا اور اللہ تعالیٰ کی زبان ہے نہیں پھر اس نے کلام کیسے کیا؟

میں نے جواب دیا۔ ''ہم کو کلام کے لیے زبان کی ضرورت ہے لیکن خود زبان کو کلام کرنے کے لیے زبان کی ضرورت نہیں' وہ خود اپنی ذات سے کلام کرتی ہے۔ اس طرح ہم کان سے سنتے ہیں لیکن خود کان اپنی ذات سے سنتا ہے' اس کو کسی اور آلے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو دیکھنے کے لیے آنکھ کی ضرورت نہیں' وہ خود اپنی ذات سے دیکھتی ہے۔ جب زبان اس پر قادر ہے کہ بے زبان کلام کرے تو اس طرح اللہ تعالیٰ کو کلام کے لیے کسی آلے کی ضرورت نہ ہو تو کیا تعجب ہے۔ صفتِ کلام خود اس کی ذات میں موجود ہے۔ قرآنِ مجید اس کی ذات سے بلا زبان صادر ہوا ہے۔''

مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تصنیف ''اشرف الجواب'' سے اقتباس۔

انتخاب: سید سرور ندیم۔ حیدر آباد

زندگی اور کامیابی

زندگی ایک امتحان ہے' یہ اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور اس حقیقت کو سمجھنے میں ہماری تمام کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے خواہ وہ دنیا کی کامیابی ہو یا آخرت کی کامیابی۔ آخرت کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو دنیا میں جو کچھ ملا ہے' وہ بطورِ آزمائش ہے نہ کہ بطورِ استحقاق۔ آدمی کو چاہیے کہ اس کو وہ اپنی ذاتی چیز نہ سمجھے بلکہ اس کو خدا کی چیز سمجھے۔

یہ چیزیں صرف اس وقت تک آدمی کے قبضے میں ہیں جب تک اس کے امتحان کی مدت پوری نہ ہو۔ مدت پوری ہوتے ہی سب کچھ اس سے چھین لیا جائے گا۔ اس کے بعد آدمی کے پاس جو کچھ بچے گا' وہ صرف اس کے اپنے اعمال ہوں گے نہ کہ وہ ساز و سامان جس کے درمیان آج وہ اپنے آپ کو پاتا ہے۔

دنیا کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں جس طرح ایک شخص کو آزادی حاصل ہے' اسی طرح یہاں دوسرے شخص کو بھی پوری آزادی حاصل ہے۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے یہ دنیا اس چیز کا ایک میدان بن گئی ہے جس کو مقابلہ (competition) کہا جاتا ہے۔ یہاں ہر آدمی آزاد ہے اس لیے یہاں ہر ایک شخص اور دوسرے شخص یا ہر ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان کھلا مقابلہ جاری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہر کامیابی دوسروں کے مقابل اپنے آپ کو کامیاب بنانے کا نام ہے۔

مولانا وحید الدین کی تصنیف سے انتخاب

انتخاب: عمران چھوٹانی۔ کراچی

علم اور جہالت

ہم سب اکثر و بیشتر یہ جملہ سنتے ہیں۔ ''علم روشنی اور جہالت تاریکی ہے۔'' حقیقت تو یہی ہے مگر اس روشنی سے فائدہ اٹھانا ہماری ذمے داری ہے۔ وہ کیا فائدہ ہے جو ہمیں حاصل کرنا ہے؟ اگر ہم اپنی زندگی کا مقصد پالیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے فائدہ حاصل کر لیا اور مقصدِ حیات ہی حاصل نہ کر سکے تو گھاٹے میں رہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں سیکڑوں جگہ کامیابی حاصل کرنے والوں اور خسارے میں رہنے والوں کا ذکر فرمایا ہے۔ زندگی کا مقصد کیا ہے' یہ مقصد ہے حقیقتیں قائم فرمانے والی ذاتِ حق کو پہچاننا۔ ہر حقیقت کی نسبت اسی ذاتِ حق کی طرف ہے مثلاً علمِ کیمیا کو لیں' جس نے علم پڑھا ہے' وہ اپنے علم کے دائرے میں اشیاء کے اجزاء اور خواص کے بارے میں جانتا ہے۔ آکسیجن اور ہائیڈروجن دو گیسیں ہیں' ایک کے بغیر آگ جل ہی نہیں سکتی' دوسری دھماکے سے جلتی ہے' دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن ملنے سے پانی بنتا ہے (H_2O) یہ ایک حقیقت ہے اور پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ یہ خاصیت خالقِ کائنات کی پیدا کردہ ہے۔ یہ علم رکھنے والا نسبت سے منسوب الیہ کی طرف جا سکتا ہے۔ یہ روشنی ہے جو منزلِ مقصود کی طرف راہ نمائی کرتی ہے۔ جو یہ علم نہیں جانتا' وہ اس علم کے حوالے سے تاریکی میں ہے' تاریکی میں منزلِ مقصود نظر نہیں آسکتی ہے چنانچہ ایسے شخص کی اشیاء کے بارے میں پہچان ویسی ہی ہے جیسے ایک حیوان چیزوں کو پہچانتا ہے۔ اس پہچان میں انسانی شرف و امتیاز شامل نہیں ہے۔ ہمیں چونکہ احسنِ تقویم پہ پیدا کیا گیا ہے اور احسنِ تقویم پہ قائم رہ کر ہی زندگی گزارنے کا حکم دیا گیا ہے اور اسی حال میں پہچاننے کے لیے بنایا گیا ہے اس لیے ہم پر قانونِ تکریمِ انسانی سیکھنا فرض قرار دے دیا گیا ہے۔ اسلام میں کسی ڈاکٹر' انجینئر' کیمیادان' استاد یا ریاضی داں بننے پہ کوئی بھی پابندی نہیں ہے اور ان میں سے کچھ نہ بننا چاہے تو بھی کوئی پابندی نہیں مگر مقامِ انسانیت جو اس کا تخلیقی شرف ہے' اس پہ قائم رہنا اس پہ فرض ہے۔

ڈاکٹر ابواعجاز رستم کی تصنیف ''پراسرار بندے'' سے اقتباس

انتخاب: رضوانہ کوثر۔ لاہور

چھوٹا کام

یہ ضرور یاد رکھیے کہ انبیاءؑ کی غلامی میں یا اُنؑ کی نوکری میں شامل ہونے کے لیے چھوٹے کام ضرور اختیار کریں اگر آپ اُنؑ کی نوکری چاہتے ہیں تو کیونکہ انہوں نے یہ کام کیے ہیں۔ میرا منجھلا بیٹا جب ایف اے میں تھا تو کہنے لگا۔ ''مجھے دو بکریاں لے دیں۔ پیغمبروںؑ نے بکریاں چرائی ہیں' میں بھی چراؤں گا۔''

ہم نے دو بکریاں لے دیں لیکن وہ پانچویں' چھٹے دن روتا ہوا آ گیا اور کہنے لگا۔ ''یہ تو بڑا مشکل کام ہے' میں ایک کو کھیت سے نکالتا ہوں تو دوسری بھاگ کر اُدھر چلی جاتی ہے۔'' پھر اس نے دونوں کے گلے میں رسی ڈال دی۔

میں نے بابا جی سے پوچھا کہ انبیاءؑ کو بکریاں چرانے کا کیوں حکم دیا جاتا تھا؟ تو بابا جی نے فرمایا۔ ''چونکہ آگے چل کر زندگی میں اُنؑ کو نہ ماننے والے لوگوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اُنؑ کا کفار سے واسطہ پڑتا تھا اس لیے اُنؑ کو بکریوں کے ذریعے سے سکھایا جاتا تھا کیونکہ دنیا میں جانوروں میں نہ

مانے والا جانور بکری ہی ہے' اپنی مرضی کرتی ہے۔''
اشفاق احمد کی تصنیف ''زاویہ۲'' سے اقتباس
انتخاب: ساحل ابڑو۔ ڈیرہ اللہ یار

انداز بیاں اور......

شکر ہے تنخواہ روپوں میں ادا کی جاتی ہے۔ اگر یہ چائے کی پتی کی صورت میں ادا کی جاتی تو ملازمین کی تنخواہیں بھی امپورٹ کرنا پڑتیں۔ اس پر تھوڑا بہت کسٹم کا رنگ بھی چڑھایا جاتا۔ کئی دفعہ ملازموں سے یہ خبر بھی سننے کو ملتی کہ افسران بالا ہماری تنخواہ 'پی' گئے ہیں۔ اس پر ڈاکوؤں کے علاوہ وائرس کے حملے کا بھی خطرہ رہتا۔ کبھی تنخواہ باہر سے آتے آتے لیٹ ہوجاتی تو ملازمین چائیں چائیں کرتے پائے جاتے پھر انہیں چائے پانی پر ہی گزارہ کرنا پڑتا۔ بڑی بڑی کمپنیاں اپنی اپنی پتی میں تنخواہ وصول کرنے کی اشتہار بازی کرتیں۔ کھلی پتی والے کم از کم اوور ٹائم کے واجبات کی وصولی کا زور دیتے۔ انکم ٹیکس کے دفاتر چائے کے ذخیروں سے اٹے ہوئے ہوتے بلکہ ان کے کپڑوں سے ہر وقت چائے کی خوشبو آتی رہتی اور یہی ان کی پہچان بنتی۔ بغیر ملاوٹ چائے بھی صرف یہیں سے ملتی اور بڑے بڑے افسروں کو چائے والا کہہ کر پکارا جاتا۔ چائے پر اعتبار کرنا ویسے بھی مشکل ہے' یہ کسی کو جگاتی ہے اور کسی کو سلاتی ہے۔ روپیا واحد کاغذ ہے جس کی ردی میں نے تو آج تک نہیں دیکھی۔ اگر اس کی ردی کہیں سے ملتی تو اسٹیٹ بینک کا گورنر ہی اس کا کباڑیہ ہوتا۔ روپ روپے ہی سے نکلتا ہے۔ روپیا پاس ہو تو یہ کچھ نہ کچھ روپ دے دیتا ہے لیکن کئی دفعہ نو دولتیے کا روپ بھی بگاڑ دیتا ہے۔ واضح رہے کہ دنیا کا ہر قسم کا کھانا منہ میں جانے کے بعد مزہ اور راحت دیتا ہے لیکن روپیا ہاتھ سے جانے کے بعد ہی راحت دے پاتا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ خریدنے والا ہمیشہ فائدے میں رہتا ہے اور بیچنے والا نقصان میں' اس کا تجربہ آپ 'ضمیر بیچ کر' کر سکتے ہیں۔
علی رضا احمد کی تصنیف ''ایرے غیرے'' سے اقتباس
انتخاب: عادل احمد قریشی۔ کراچی

تحائف

تحفوں کے بغیر رومانس تو خیر' چل ہی نہیں سکتا۔ ازدواجی زندگی بھی بے لطف رہتی ہے۔ اگر ادھر موتیوں کی مالا اور زری کی ساڑھی کا انتظار رہتا ہے تو ادھر بھی بجلی کے شیور اور 'پارکر' کے قلم کا اشتیاق کچھ کم نہیں ہوتا لیکن انتظار اور اشتیاق کا یہ سلسلہ اس وقت کمزور پڑنے لگتا ہے جب قدرت انہیں اپنے تحفے یعنی اولاد سے نوازتی ہے۔
قدرت کے عطا کیے ہوئے تحفوں کی گنتی جیسے جیسے بڑھتی ہے' منتظر اور مشتاق کے لائے ہوئے تحفوں کی تعداد گھٹتی جاتی ہے کیونکہ گھر کے میزانیے کو متوازن بنانے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔
تحفہ دینے یا لینے کے لیے موقع کا تعین اب کچھ ضروری نہیں رہا۔ سالگرہ' بچے کی پیدائش' منگنی' شادی' نئے مکان میں منتقلی' امتحان میں کامیابی اور ایسے ہی دوسرے درجنوں مواقع تو خیر' ایسے ہیں کہ جن پر تحفہ نہ دینا مدتوں سے ایسا ہی قابل گرفت جرم سمجھا جاتا رہا ہے جیسا کہ تعزیراتِ پاکستان کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی کرنا۔
اب صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ اگر کوئی چھینکتا بھی ہے تو اہلِ وفا اس کے لیے تحفے لے کر پہنچ جاتے ہیں۔
صبیح محسن کی تصنیف ''قبول فتہ'' سے اقتباس
انتخاب: ماریہ خان۔ کوئٹہ

منجھی کتھے ڈھاواں؟

اس ہوٹل کے کمرے لحد کے سائز سے کچھ ہی بڑے ہوں گے۔ اس کے پلنگ پر آدمی کی کروٹ تو بدل سکتا ہے اور کوئی کام نہیں کرسکتا۔ کروٹ بدلنے کی گنجائش بھی اس لیے رکھی ہے کہ ایئر کنڈیشنر بند ہونے کے بعد آدمی یہ بھی بند نہ کرلے تو کیا کرے۔ آٹھ نو منزل کا ہوٹل ہے۔ یہ ٹوکیو کے بڑے ریلوے اسٹیشن کے نواح میں واقع ہے۔ اس میں بڑے ہوٹلوں کی سی کوئی خصوصیت نہیں ہے سوائے کرائے کے۔ اس لحد نما کمرے کا کرایہ مبلغ دو سو روپیا روزانہ لیتے ہیں۔
روزانہ کیا' سبانہ کہیے کیونکہ دن میں ہوٹل میں ہوتے ہی نہیں' اپنے کام پر باہر ہوتے ہیں۔ یاد رہے کہ اس میں ناشتا شامل نہیں ہے۔ اپنا ملک بہت یاد آیا ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے سامنے سائبانوں تلے منجھیاں یعنی چارپائیاں بچھی ہوئی ہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑی ہوئی ہیں کہ مسافر کو پھلانگ کر جانا پڑے۔ یہ سچ ہے کہ ملحقہ غسل خانے پر چارپائی کے ساتھ نہیں ہوتا لیکن یہ نئی روشنی کا کھڑاگ ہے۔
ہمارے ملک میں کوئی جگہ ایسی نہیں جس کے آس پاس نالی یا نالہ نہ پڑتا ہو تو کوئی کھلا کھیت یا پلاٹ یا سایہ دار ہوتا ہے۔ جب ذرا گرد جھکائی' کرایہ اس منجھی کا چار آنے روز ہوتا ہے۔ اب مہنگائی اور مہنگائی الاؤنس ڈالنے کے بعد آٹھ آنے ہوگا' بارہ آنے ہوگا۔ جی تو ہمارا بھی چاہا تھا کہ ایک منجھی یہیں سے اپنے ساتھ لے جائیں' ٹوکیو اسٹیشن کے سامنے کسی سائبان تلے ڈال لیں گے' بچھا لیں گے۔ کوئی پولیس کا پیادہ پوچھے گا تو چونی' اٹھنی دے کر اسے راضی کرلیں گے لیکن ہوائی جہاز والوں میں تعاون کا جذبہ کم تھا' بولے۔ ''جی نہیں' چارپائی جہاز پر بار کرنے کی اجازت نہیں۔''
اقتباس: ابنِ انشاء کا سفرنامہ ''نگری نگری پھرا مسافر''
انتخاب: فیضان حسین عثمانی۔ حیدرآباد

خیال آرائی

ایثار اور ایمان

یا اللہ! تو اپنے کرم' محبت' مہربانی اور شفقت' توجہ سے اتنا اور کرم کردے کہ ہمارے دلوں اور دماغ' خیال و تصور میں تیری بے انتہا محبت نبی کریم ﷺ کی محبت میں لگن' تڑپ' ذوق و شوق' فکر گہرائی گیرائی اور تصور اتنا پختہ کردے کہ جب ہم سوچیں' سمجھیں' بولیں' ہر لفظ الفاظ خیال و تصور اور مراقبے کے ساتھ سب کے لیے دل کی گہرائیوں سے خود بخود دعائیں نکلتی جائیں۔ اللہ تعالیٰ اور نبی کریم کا ساتھ ہو تو آپ سب کے لیے دعائیں مانگیں' وہ قبول و مقبول ہوں گی انشاء اللہ تعالیٰ! اے اللہ! تو ہم سب کا دل صاف کردے۔ نفس' ضمیر' پاکیزہ' اجلا' چمکتا دمکتا' مہکتا خوشبوؤں میں بسا رہے۔ یا الٰہی! تو کریم' رحیم' مہربان ہے' ستار ہے' غفار' غفور اور رحم اور کرم فرمانے والا ہے۔ اے میرے معبود! تو اپنے کرم' محبت' شفقت اور رحمت سے ہم سب کو معاف فرمادے۔ ہم سب تیرے گناہ گار بندے ہیں' ہم نے اگلے پچھلے جو گناہ کیے ہیں' بھول کر انجانے میں' جان بوجھ کر ان سب گناہوں اور غلطیوں کو درگزر اور معاف فرما۔
اے میرے پیارے معبود! ہمارے ایمان کی قوت اور طاقت عنایت فرما۔ ہمیں محبت' خوش مزاجی' انکساری سے ایک دوسرے کے دکھ درد میں تعاون کریں۔ ہمیں جوش و خروش' جذبۂ صادق عطا فرما۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ تصور سے بھی زیادہ ہمت' صلاحیت' صبر' محبت' خوشی عطا فرما تاکہ ہم سب سچے

جذبے اور عقیدے سے آگے بڑھتے جائیں۔کامیابی کامرانیاں اور شادمانی کے جھنڈے لہراتے جائیں گے۔ہم جہاں بھی جائیں، کامیابی اور فتح اور خوشیاں ہم سے آگے بڑھتے ہوئے راستہ بنائیں۔یااللہ! تو پاکستان کی حفاظت فرما۔یااللہ! تو پاکستان کو قائم و دائم اور شادآباد رکھ۔اے میرے معبود! تو دشمنوں کو ہدایت فرما۔اے اللہ! تو نے اپنے کرم اور نبی کریمؐ کے صدقے میں پورے عالمِ اسلام میں اسلام کا بول بولا اور اونچی شان عطا فرما۔اے اللہ! تو ہمیں اتنی طاقت وقوت اور ناقابل تسخیر اور لاجواب، بے مثال طاقت، جاں نثار طاقت عنایت فرما کہ جب بھی وقت آئے تو ہم سب فوراً باطل کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور ہم سب متحد ہوکر، ہم آواز ہوکر کہیں۔نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر! تو ان نعروں کی گونج سے دشمنوں کے چھکے چھوٹ جائیں۔واہ میرے مولا! جس نے رب سے مانگا، اللہ نے عطا کیا محبت سے۔

خیال آرائی: فرید احمد عطار۔کراچی۔

عورت کی زندگی

زندگی کیسی ہو، روتی ہوئی، سسکتی ہوئی یا پھول کی طرح تروتازہ، ہنستی مسکراتی ہوئی یا اپنے حق، اپنی ذات کی بھیک مانگی ہوئی، زندگی صحرا کی ریت پر پانی کی ایک ایک بوند کو ترستی ہوئی یا جنگل میں تنہا ہیبت سے کانپتی سہمی ہوئی کہ وحشیوں کے خوف سے لرزہ طاری ہو خصوصاً عورت کی زندگی جس کے لیے یہ دنیا ایک جنگل ہے جس میں ہر رنگ، ہر نسل کے درندے موجود ہیں، بس ان کا انہیں چیر پھاڑ کھانے، انہیں ختم کرنے کا انداز مختلف ہے بہ نسبت ان درندوں کے جو بوٹی بوٹی نوچ کھاتے ہیں۔اگر یہ بھی ایسا کریں تو شاید تکلیف کم ہو مگر یہ تو قطرہ قطرہ زندگی کو ختم کرتے ہیں، لمحہ لمحہ موت دیتے ہیں، کبھی ہاتھ سے اور کبھی زبان سے لفظوں کے تیر چلا کر۔

کی جیسے سب سے بیانِ بنت آدم کے حقوق
کچھ اس طرح بھی شیخ جی، رجحان ہونا چاہیے

خیال آرائی: روبینہ خالد۔گجرات۔

عدم اعتماد اور نسلی امتیاز

میرے نزدیک پوری دنیا میں سب سے بے سکون اور سب سے زیادہ فساد کی جڑ انسانوں کے آپس کے عدم اعتماد اور نسلی امتیاز ہے۔اگر تمام انسان خود کو صرف اور صرف انسانی برادری کا رکن سمجھیں تو دنیا کے تمام وسائل اور قوتیں صرف انسانوں کی اصلاح پر استعمال ہوں نہ کہ اپنی دفاعی قوتیں بڑھانے اور ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے لیے مہلک ہتھیار ایجاد کرنے میں، محبت اور پیار کا جذبہ ایک ایسا جذبہ ہے جو ہم انسانوں میں پایا جائے تو آپس میں کبھی بھی کوئی دنگا فساد اور جنگ وغیرہ نہ ہو بلکہ ہر طرف امن ہی امن ہو مگر ایسا کیسے ممکن ہے ......کیا آپ کے پاس اس کا جواب ہے؟

مرسلہ: شیخ معظم الٰہی۔لاہور

انمول خزانہ

سنہری کرنیں

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

☆ خبردار، خواہشات کے پیچھے مت لگو کیونکہ خواہشات اندھا اور بہرہ کردیتی ہیں۔

☆ جب مومن مرتا ہے تو زمین اس پر چالیس دن تک گریہ کرتی ہے۔

☆ جو اپنے وعدے کو پورا نہیں کرتا، اس کا کوئی دین نہیں ہے۔

☆ تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔

☆ مظلوم کی بددعا سے بچے رہو چاہے وہ کافر

کیوں نہ ہو کیونکہ مظلوم اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب حائل نہیں ہوتا۔

☆ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد سب سے بڑی عقل مندی لوگوں کے ساتھ اظہارِ دوستی ہے۔

مرسلہ: شمع اکرام، کراچی۔

اقوال فردوسی

☆ عشقِ حقیقی تو وہ ہے جو جذبۂ عمل کو بھڑکا دے۔

☆ عالم پانی کے بغیر سیراب ہے اور جاہل پانی کی موجوں میں رہ کر بھی تشنہ رہتا ہے۔

☆ شیر کا بچہ شیر ہی بنے گا چاہے اس کی تربیت کہیں بھی ہو۔

☆ حق پر چلنے والوں کا پاؤں شیطان کے سینے پہ ہوتا ہے۔

☆ محبت ایک ایسی چیز ہے جو سیکھنے کے اور کسی کے بتانے کی نہیں۔

☆ علم نر ہے اور عمل مادہ۔دین دنیا کے کام ان کے ملنے سے ہیں۔

مرسلہ: رفیق احمد۔پشاور

دوستی

☆ پھولوں کی دوستی سے پہلے کانٹوں سے دوستی رکھو۔

☆ دوستی ایک پانی ہے جو دل و دماغ کو سیراب کرتی ہے۔

☆ دوستی ایک سمندری لہر کی مانند ہے۔جس طرح لہریں دوسری لہروں کے ساتھ مل کر کبھی سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں چلی جاتی ہیں اور کبھی واضح نظر آتی ہیں۔یہی مثال ایک دوست کی ہے۔

☆ جس کا کوئی دوست نہیں، وہ اس گلشن کی مانند ہے جس میں پودے تو ہیں لیکن پھول نہیں۔

☆ دوستی ایک بلند تخیل ندی کے پانی کی طرح جھلمل کرتا رشتہ، بارش کی بوندوں کی طرح نرم و نازک، چاند کی روشنی کی طرح پرسکون اور تاروں کی طرح چمکتا رشتہ ہے۔

☆ دوستی پیہم رہنے سہنے اور کھانے پینے کا نام نہیں بلکہ یہ دو دلوں کے درمیان باہمی ربط کا نام ہے۔

☆ دوستی ایک ایسے جذبے کا نام ہے جو اعتماد پر قائم ہوتا ہے اور اسی اعتماد کی وجہ سے انسان اپنے دل کے کئی بوجھ ہلکے کرسکتا ہے۔

☆ حقیقی دوست وہ ہوتا ہے جو آپ کی طرف اس وقت آتا ہے جب ساری دنیا آپ کو چھوڑ چکی ہوتی ہے۔

مرسلہ: حسین خواجہ، منچن آباد

سنہرے موتی

☆ سمندر کی حد ہوتی ہے لیکن جذبۂ عشق لامحدود ہوتا ہے۔

☆ محبت ایک بچے کی مانند ہے جو ہر اس چیز کی خواہش کرتی ہے جو اس کے راستے میں آجائے۔

☆ ایک دیو کی سی طاقت رکھنا اچھا ہے لیکن اسے دیو کی طرح استعمال کرنا ظلم و بربریت ہے۔

☆ وہ ناراضگیاں جو غیر منصفانہ ہوتی ہیں، اچھے دوستوں کو کھو دیتی ہیں۔

☆ نہ قرض دو نہ لو، قرضہ دینے سے دوستوں کے کھو جانے کا خدشہ ہوتا ہے اور قرض لینے سے قناعت ختم ہو جاتی ہے۔

☆ غرور ہمیشہ منہ کے بل گرتا ہے اور اس مغرور آدمی کی گردن توڑ دیتا ہے جس نے اس کی پشت پر قبضہ کر رکھا ہے۔

☆ اپنے دوستوں کو آزمائش کے بعد محبت کی آہنی زنجیروں میں جکڑ لو لیکن کسی ناآسودہ نئے ساتھی

کے ساتھ ملاپ نہ رکھو۔

(ولیم شیکسپیئر کے مکالموں سے انتخاب)

مرسلہ: مسز نگہت غفار' کراچی۔

ذرا مسکرائیے

معصومیت

ایک کتا' ایک چھوٹے بچے کے پاؤں چاٹنے لگا۔ بچہ ڈر کے مارے چیخنے لگا۔ دور کھڑی ماں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا ہوا' کتے نے کاٹا تو نہیں؟''

جواب میں بچے نے معصومیت سے کہا۔ ''نہیں امی! ابھی تو صرف چکھ رہا ہے۔''

مرسلہ: شفق شکیلی اقبال' سیالکوٹ۔

پرورش

ایک امیر نوجوان سے بھکاری نے کہا۔ ''صاحب' کیا بات ہے' دو سال پہلے آپ مجھے دس روپے دیا کرتے تھے' پچھلے سال سے آپ نے صرف پانچ ہی روپے دینے شروع کر دیئے اور آج کل تو دو روپے کا سکہ دیتے ہیں؟''

امیر نوجوان بولا۔ ''بھائی' بات دراصل یہ ہے کہ دو سال پہلے میں کنوارہ تھا۔ پچھلے سال میری شادی ہوگئی اور اب میں ایک بچے کا باپ ہوگیا ہوں۔''

بھکاری بے رخی سے بولا۔ ''بہت خوب' تو آپ میرے پیسوں سے اپنے خاندان کی پرورش کر رہے ہیں۔''

عائشہ جواد۔ کراچی

حافظہ

دو ماہر پروفیسر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ پہلے پروفیسر نے اپنے دوست پروفیسر سے پوچھا۔ ''جن مریضوں کی قوتِ حافظہ کمزور ہوتی ہے' ان کے ساتھ آپ کیا کرتے ہیں؟''

دوست پروفیسر نے کہا۔ ''میں علاج شروع کرنے سے پہلے ہی ان سے اپنا بل وصول کر لیتا ہوں کیونکہ حافظہ ٹھیک ہونے پر مریض کہتا ہے کہ کون سا بل اور کیسا بل؟''

مرسلہ: افشاں احمد' کراچی۔

شادی

ایک دن بیربل کی بیوی نے بیربل سے کہا۔ ''اگر میں مرگئی تو کیا کرو گے؟''

بیربل نے جواب دیا۔ ''میں صبر کروں گا۔''

بیوی نے کہا۔ ''تم جھوٹ بولتے ہو' میں جانتی ہوں' تم فوراً دوسری شادی کر لو گے۔''

بیربل نے مسکرا کر کہا۔ ''فوراً نہیں' شادی تو تمہیں دفن کرنے کے بعد کروں گا۔''

خواب

ایک لڑکا نیند میں یہ خواب دیکھ رہا تھا کہ وہ کسی سینما ہال میں پکچر دیکھنے کی غرض سے پہنچا لیکن ہاؤس فل کا بورڈ دیکھ کر بے چارہ مایوس ہو کر واپس ہو رہا ہے کہ ماں نے اسے جگا دیا۔ ''اٹھو بیٹے' یہ بھی کوئی سونے کا وقت ہے؟''

بیٹا فوراً جاگ گیا اور کہنے لگا۔ ''امی جی! وہ تو شکر مناؤ جو مجھے ٹکٹ نہیں ملی ورنہ تمہارا بیٹا تو تین گھنٹے بعد اٹھتا۔''

بلڈ گروپ

میاں' بیوی سے۔ ''خون ٹیسٹ کے لیے دیا تھا' اس کا رزلٹ آگیا ہے۔''

بیوی۔ ''کون کون سا گروپ نکلا؟''

میاں۔ ''نرس نے آ کر بڑی خوشی سے بتایا ہے کہ آپ دونوں کا بلڈ گروپ ایک ہی ہے۔''

بیوی۔ ''نرس کو کیا جواب دیا؟''

میاں۔ ''صاف بات کہی کہ میری بیوی گزشتہ پچیس برس سے میرا خون چوس رہی ہے پھر گروپ تو ایک ہی ہونا تھا۔''

مرسلہ: عمیر احمد' راولپنڈی۔

بزم آرائی

سلام

ختم ہوئے پیغام سلام
اس کے ہجر کے نام سلام
لمحہ بے انجام دعا
دیدۂ بے آرام سلام
ماند پڑا ہر یاد کا چاند
اے گردِ ایام سلام
تیری مرضی دیکھ نہ دیکھ
رہگیروں کا کام سلام
کہنا غزلوں کو مکتوب
لکھنا اس کے نام سلام
جاگ مری صبحِ اعزاز
کرنے آئی شام سلام
لٹتے شہر عذاب بخیر
بجھتے کوچہ و بام سلام
خواہشِ تسکیں عمر دراز
حسرتِ درد انجام سلام
محسن اس کے طور اخیر
ناز' انداز' خرام' سلام

(محسن نقوی)

حسنِ انتخاب: اشعر جواد' کراچی۔

غزل

بہار آئی' کھلے گل زیبِ صحنِ بوستاں ہو کر
عنادل نے مچائی دھوم سرگرمِ فغاں ہو کر
بچھا فرشِ زمرد اہتمامِ سبزۂ تر میں
چلی مستانہ وش بادِ صبا عنبر فشاں ہو کر
عروجِ تشنۂ نشو و نما سے ڈالیاں جھومیں
ترانے گائے مرغانِ چمن نے شادماں ہو کر
بلائیں شاخِ گل کی لیں نسیمِ صبح گاہی نے
ہوئیں کلیاں شگفتہ روئے رنگیں بتاں ہو کر
کیا پھولوں نے شبنم سے وضوِ صحنِ گلستاں میں
صدائے نغمۂ بلبل اٹھی بانگِ اذاں ہو کر

(اکبر الہ آبادی)

حسنِ انتخاب: شفق شکیلی اقبال' سیالکوٹ۔

تم

جیسے رنگ گلابوں میں
پہلا عشق حجابوں میں
تم ہو میرے خوابوں میں
جیسے نین شرابوں میں
سچے لفظ کتابوں میں
تم ہو میرے خوابوں میں
جیسے وہم حسابوں میں
دل کا بھید جوابوں میں
تم ہو میرے خوابوں میں
جیسے جسم شبابوں میں
تازہ خون عذابوں میں
تم ہو میرے خوابوں میں
جیسے چاند سحابوں میں
پیاسی آنکھ سرابوں میں
تم ہی میرے خوابوں میں

(سعد اللہ شاہ)

حسنِ انتخاب: افضال خان' کراچی۔

مشکل

کتنا مشکل ہے زندگی کرنا
جس طرح مجھ سے دوستی کرنا

اک کہانی نہ اور بن جائے
تم ذرا بات سرسری کرنا
ڈوب جاؤں نہ میں اندھیروں میں
ایسی آنکھوں کی روشنی کرنا
کس قدر دل نشین سا لگتا ہے
بے ارادہ تجھے دکھی کرنا
خونِ دل صَرف کرنا پڑتا ہے
دیکھنا' تم نہ شاعری کرنا
کتنا دشوار ہے انا کے لیے
سارے ماحول کی نفی کرنا
(نوشی گیلانی)
حسنِ انتخاب: فیضان حسین عثمانی۔ حیدر آباد۔

محبت کی نظم

اگر کبھی میری یاد آئے
تو چاند راتوں کی نرم دل گیر روشنی میں
کسی ستارے کو دیکھ لینا
اگر وہ نخلِ فلک سے اڑ کر تمہارے قدموں میں
آ گرے تو
یہ جان لینا وہ استعارہ تھا میرے دل کا اگر نہ آئے
مگر یہ ممکن ہی کس طرح ہے کہ تم کسی پر نگاہ ڈالو
تو اس کی دیوارِ جاں نہ ٹوٹے
وہ اپنی ہستی نہ بھول جائے
اگر کبھی میری یاد آئے
گریز کرتی ہوا کی لہروں پہ ہاتھ رکھنا
میں خوشبوؤں میں تمہیں ملوں گا
مجھے گلابوں کی پتیوں میں تلاش کرنا
میں اوس قطروں کے آئینوں میں تمہیں ملوں گا
اگر ستاروں میں نہ پاؤ مجھ کو
تو اپنے قدموں میں دیکھ لینا
میں گرد ہوتی مسافتوں میں تمہیں ملوں گا
کہیں پہ روشن چراغ دیکھو تو جان لینا

کہ ہر پتنگے کے ساتھ میں بھی بکھر چکا ہوں
تم اپنے ہاتھوں سے ان پتنگوں کی خاک دریا میں
ڈال دینا
میں خاک بن کر سمندروں میں سفر کروں گا
کسی نہ دیکھے ہوئے جزیرے پہ رک کے تم کو
صدائیں دوں گا
سمندروں کے سفر پہ نکلو تو اس جزیرے پہ بھی اترنا
(امجد اسلام امجد)
حسنِ انتخاب: رضوانہ کوثر' لاہور۔

دنیا

اسے کہنا' یہ دنیا ہے
یہاں ہر موڑ پر ایسے بہت سے لوگ ملتے ہیں
جو اندر تک اترتے ہیں
ابد تک ساتھ رہنے کی
اکٹھے درد سہنے کی
ہمیشہ بات کرتے ہیں
اسے کہنا' یہ دنیا ہے
یہاں ہر شخص مطلب کی
حدوں تک ساتھ چلتا ہے
جونہی موسم بدلتا ہے'
محبت کے سبھی دعوے
سبھی قسمیں' سبھی وعدے
اچانک ٹوٹ جاتے ہیں' اسے کہنا' یہ دنیا' دنیا ہے
یہاں ہر موڑ پر اپنی سدا آنکھیں کھلی رکھنا
کوئی کتنا بھی اچھا ہو'
کوئی کتنا بھی سچا ہو'
مگر اعتبار مت کرنا
اسے کہنا' یہ دنیا ہے' یہاں پر پیار مت کرنا
(عنصر خان نیازی)
حسنِ انتخاب: عالیہ نثار۔ اسلام آباد
☆☆......☆☆

مختصر خبروں پر مختصر تیکھا تبصرہ



م۔ش۔خ

☆...... ملکی وسائل ہڑپ کیے گئے یہ برداشت نہیں کیا جائے گا' شہباز شریف

جی بالکل سہی اور ہاں بڑے بھائی صاحب کو بھی سمجھا دیں

☆...... نواز شریف کی ہٹ دھرمی ملک کے لیے زہر قاتل ہے' افتخار چوہدری

اگر یہ ہٹ دھرمی نہ دکھاتے تو آپ کبھی چیف جسٹس نہ بنتے

☆...... تربیت مکمل کرنے والے 3500 ٹریفک اہلکار جلد ڈیوٹی پر آجائیں گے' ایک خبر

قوم کی یا وزراء کے پروٹوکول کی یہ نہیں بتایا گیا

☆...... کشمیریوں پر مظالم اجاگر کرتے رہیں گے' مصطفیٰ کمال

جی وہ تو آپ کے بچپن سے اجاگر کیے جا رہے ہیں کوئی نیا راستہ تلاش کریں

☆...... دنیا کی بہترین جامعات میں پاکستان ایشیائی اور اسلامی ممالک سے بھی پیچھے' برطانوی ادارے گیواس

ہمارے سیاست دان ایشیائی اور اسلامی ممالک کے سیاست دانوں سے بہت زیادہ ایماندار ہیں

☆...... مسلم لیگی رہنماؤں نے جے ٹی آئی کو جیمز بونڈ کی فلم کہہ دیا' ایک خبر

فلم کا اختتام بہت خراب ہوا بے چارہ ہیرو در بدر ہو گیا

☆...... جمہوریت کے لیے پی پی پی سے زیادہ قربانیاں کسی نے نہیں دیں' نثار کھوڑو

جی ہاں تھر کے لوگ بھی یہی کہہ رہے ہیں

☆...... سول اسپتال سے سیاسی جماعتوں کے جھنڈے اتارنے کا حکم' ایک خبر

دوائیاں تو ملتی نہیں کم از کم جھنڈے تو لگے رہنے دیں

☆...... سادہ لباس محافظ اور اسلحہ کی نمائش پر پابندی' ایک خبر

صرف کاغذوں کی حد تک

☆...... کراچی سونے کے ہزاروں انڈے دینے والی مرغی ہے' ایک خبر

انڈے تو سیاست دان پروٹوکول میڈیکل کے فرائی پان میں کھا جاتے ہیں چھلکا عوام کھاتی ہے

☆...... ترکی کے سرکاری اسکولوں میں اردو زبان نصاب میں شامل ترکی کا آئین اس بات کی اجازت دیتا ہے' ایک خبر

ہمارا آئین تو اجازت نہیں دے رہا آپ کا آئین کس نے بنایا ہے ہمارے آئین سے سبق حاصل کریں۔

☆...... مندر کی گھنٹیوں اور اذان کی آواز سے اٹھتی ہوں' پوجا بھٹ

کمال ہے کہ آپ بھی سوتی ہیں

☆...... حکمرانوں نے کرپشن کی وجہ سے کراچی کو کھنڈرات بنا دیا ہے' سنی تحریک

جبھی تو اب لوگ موہنجوداڑو نہیں جاتے

☆...... پاکستان میں ایک یونیورسٹی نہیں بنی جبکہ بھارت میں 52 بنیں' ایک خبر

جب بنی بنائی یونیورسٹیوں سے سیاست دانوں کو اور ضرورت کے تحت جعلی ڈگریاں مل جاتی ہیں تو نئی بنانے کی کیا ضرورت ہے۔

☆...... پنجاب میں گدھوں کی تعداد بڑھانے کا فیصلہ' ایک خبر

آغاز اسلام آباد سے کیجیے گا۔

☆...... نواز شریف کی نااہلی کا انتقام لیں گے' مریم نواز

بقول گلوکار غلام علی کے یہ کہانی پھر سہی

☆...... اربوں روپے مالیت کا 6 کروڑ گز ممنوعہ کپڑا انٹیلی جنس نے پکڑ لیا' ایک خبر

صوبہ سندھ بھیج دیں روٹی کپڑا اور مکان کا جو نعرہ ہے اُس میں کپڑا کا نعرہ یقیناً پورا ہو جائے گا۔

☆...... مظفر گڑھ میں 78 سال کا دولہا اور 76 سال کی دلہن دونوں خوش ہیں' ایک خبر

اگر دو چار کیس اور ہو گئے تو پھر خاندانی منصوبہ بندی کے آفس بند ہو جائیں گے۔

☆...... پی آئی اے کے پائلٹ کی چینی خاتون کو کاک پٹ میں بٹھا کر پرواز' ایک خبر

پی آئی اے پاوس اسی اے دیں نہیں ہیں

☆...... وزیراعظم کا جے آئی ٹی میں پیش ہونا پارلیمانی وقار کے خلاف' سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی

نااہل وزیراعظم ایسوسی ایشن زندہ باد

☆...... چوہدری نثار کے خلاف ایف آئی آر کٹوائیں گے' پی پی پی

2018ء میں جیت جاؤ تو کٹوا دینا۔

لاأُبالی اخبارنویس

اوا وکمن ٹائز امریکہ کا مشہور و معروف کالم نویس تھا۔ اس کے کالم کا عنوان تھا روزمرہ کا نیویارک' یہ کالم امریکہ کے چار سو اٹھانوے اخبار شائع کرتے اور تقریباً دو کروڑ لوگ یہ کالم روزانہ پڑھتے۔ مکن ٹائز کی ماہانہ آمدنی صدر امریکہ تنخواہ سے بھی کہیں زیادہ تھی لیکن وہ لاپرواہ اور لاأُبالی آدمی تھا۔ اسے ہجوم سے بے حد نفرت تھی۔ ایک مرتبہ وہ اپنی قیام گاہ سے پورا ایک برس باہر نہ نکلا وہ ہر وقت چیونگم کھاتا رہتا۔ اس کے پاس دنیا کی سب سے قیمتی کار رولس رائس تھی لیکن وہ اکثر پیدل چلا کرتا اور اپنا لباس نیویارک کے بہترین درزی سے سلواتا تھا مگر اسے یہ لباس پہننے کی فرصت نہ ملتی وہ سارا سارا دن اپنا ڈریسنگ گون اور پاجامہ پہنے کام کرتا رہتا۔

☆...... ملک میں کم از کم تنخواہ لوگوں کی 16000 کی جائے' سینیٹ اراکین

تو پھر اس کا آغاز سینیٹ سے کیا جائے۔

☆...... ٹریفک کنٹرول کرنے کے لیے حیدرآباد میں خواتین تعینات' ایک خبر

مردوں سے تو کچھ نہیں ہوا اب آخری حربہ یہی رہ گیا تھا۔

☆...... خواتین سے ناانصافی برداشت نہیں کریں گے' ماروی میمن

اخبارات میں خواتین پر ظلم کے حوالے سے روز خبریں آتی ہیں سیاسی بیان مبارک ہو۔

☆...... چوروں کو وی آئی پی پروٹوکول مل رہا ہے' عمران خان

سیاسی چوروں کو کچھ نہ کہو خان صاحب یہ جلدی بیمار ہو جاتے ہیں مریضوں کا خیال رکھیں۔

☆...... دوران سروس مرنے والوں کو تنخواہ اور رہائش ملے گی اطلاق فروری 1918ء سے ہوگا' ایک

خبر

نومبر، دسمبر، جنوری مرنے سے دور رہیں

☆......معذور نوجوان بھی معاشرے کا حصہ ہیں، ایک خبر

صرف معاشرے کا حصہ ہیں اس میں نوکریاں اور حقوق شامل نہیں

☆......بلاول بھٹو کے فاطمہ بھٹو اور جونیئر ذوالفقار بھٹو سے رابطے سیاست دان پریشان، ایک خبر

لوگوں کو کیا تکلیف ہے بھیا ماموں زاد بہن بھائی ہیں۔

☆......نالوں کی صفائی کے لیے حکومت نے 43 کروڑ جاری کیے مگر نالے صاف نہ ہوئے، ایک خبر

وہ پیسے نالے میں بہہ گئے وہ بھی پیٹ کے نالے میں

☆......ریلوے کیٹرنگ ورکرز نے ہڑتال کر دی، ایک خبر

وفاقی وزیر اپوزیشن والوں کے خلاف ہڑتال پر ہیں سب ہڑتال پر ہوں گے تو ریل کیسے چلے گی۔

☆......بل گیٹس دنیا کے امیر ترین شخص نہیں رہے، ایک خبر

یقیناً پھر کوئی پاکستانی سیاست دان ہوگا نام چھپایا جا رہا ہے یہ عوام برداشت نہیں کرے گی۔

☆......شاہد خاقان عباسی نواز شریف کی پالیسیوں کا تسلسل جاری رکھیں گے، (ن) لیگ

کون سا تسلسل کام کے حوالے سے یا جس سے نااہل ہوئے ہیں۔

☆......کرپشن نہیں بیٹے سے تنخواہ لینے پر نااہل کیا گیا وزیراعظم کو، مولانا فضل الرحمٰن

مولانا نیک آدمی ہیں دوستوں کی دل جوئی میں لگے رہتے ہیں

☆......ایٹمی طاقت بننے کی سزا وزیراعظم کو دی گئی، سعد رفیق

ایٹم بم کا آغاز تو بھٹو، ضیاء الحق مرحوم اور ڈاکٹر قدیر خان نے کیا تھا بھائی میاں صاحب نے تو صرف بٹن دبایا تھا۔

☆☆......☆☆

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا دقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ **300/=** روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی 300/= روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

II 88-C۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

□ رضیہ احمد۔ حیدرآباد۔

o محترم بابا جی! السلام علیکم! بابا جی! مسئلہ میرے جیٹھ کا ہے' اُن کا کوئی نوکری یا کام کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ ایک جگہ کام لگواؤ تو بمشکل ایک ہفتہ کام کرکے چھوڑ دیتے ہیں۔ گھر کا خرچ چلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اَب تو دکان والے نے بھی ادھار راشن دینے سے انکار کر دیا ہے۔ بابا جی! میری جیٹھانی کے پڑھنے کے لیے کوئی وظیفہ دے دیں۔ اُن کے حالات ٹھیک ہو جائیں اور وہ دل لگا کر کام کرنے لگیں۔

☆ بیٹی رضیہ! اس مسئلے کے لیے بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ واقعہ ضرور پڑھو۔ مدت 21 روز ہے۔

□ ارم ایوب۔ لاہور۔

o بابا جی! السلام علیکم! گزارش ہے کہ میں نے آپ کو تین خط لکھے لیکن آپ نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ بابا جی! آپ نے مجھے سورۃ احزاب رشتے کے لیے پڑھنے کو دی (41) دن تک فجر کی نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کی مہربانی' آپ کی دُعا سے ایک اچھا رشتہ آیا ہے۔ تقریباً بات پکی ہے۔ ہمارے سب گھر والوں کو رشتہ بہت پسند آیا ہے لیکن میرے دو بھائی اور دو بھابیاں ناراض ہیں۔ میری والدہ چاہتی ہیں کہ یہ بھی ناراضگی ختم کر دیں۔ بابا جی! جب سے میرا رشتہ آیا ہے' محلے والے پتا نہیں کیوں جل رہے ہیں؟ آپ سے والدہ کی گزارش ہے کہ ایسا وظیفہ دیں کہ لڑکے والے کسی کے بہکانے میں نہیں آئیں۔ میری والدہ کو ڈر ہے کہ محلے والے لڑکے والوں کو بہکا دیں گے اس لیے والدہ چاہتی ہیں کہ ایسا وظیفہ دیں کہ شادی ہونے تک کوئی مسئلہ نہ ہو۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی اور ہاں' میں نے وظیفہ ابھی جاری رکھا ہوا ہے۔ آپ کے اور اللہ کے سوا کوئی ہمارا نہیں۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی ارم ! اللہ تمہیں بے شمار خوشیاں عطا فرمائے۔ وظیفہ ترک کر دو۔ نماز کی پابندی رکھو اور سب سے پہلے شکرانے کے دو نفل ضرور ادا کرو۔ بندے کو چاہیے کہ جب وہ مشکل میں اللہ سے مدد مانگے اور اللہ اُس کی دُعا قبول فرمالے تو سب سے پہلے اُس پاک ذات کا شکر ادا کرے کیونکہ اس کی مرضی کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ جہاں تک بھائیوں کی ناراضگی کا تعلق ہے تو والدہ سے کہو کہ اُن دونوں کو بلائیں اور محبت سے سمجھائیں کہ خوشی کے موقع پر ناراضگی اچھی بات نہیں۔ بیٹی! تم **سُبحانَ اللہ** کا بکثرت وِرد کرو اور صدقہ خیرات ضرور نکالتی رہنا۔ اللہ سب خیر رکھے گا۔

□ ثمینہ خان۔ مقام نامعلوم۔

o محترم بابا جی! السلام علیکم! بابا جی! میں بہت پریشان ہوں' میرے سُسرال والوں نے مجھے بہت زیادہ پریشان کیا ہوا ہے۔ بابا جی! میں نے اس سے پہلے اپنی امی کے لیے آپ سے وظیفہ لیا تھا۔ میرا اس دنیا میں سوائے ماں کے کوئی نہیں۔ میری امی میرے ساتھ رہتی تھیں مگر میرے سسرال والوں نے انہیں گھر میں رکھنے سے انکار کر دیا کیونکہ میری امی ذہنی مریضہ ہیں۔ بابا جی! میری نندیں اور سُسر ہر وقت مجھے ڈانٹتے رہتے ہیں۔ چھوٹی نند تک میری عزت نہیں کرتی۔ شادی شدہ نند بھی آتی ہے تو مجھے برا بھلا کہتی ہے۔ بابا جی! میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ سسر اور نندوں کو سمجھائیں۔ انہوں نے کوشش کی تو میرے سسر نے پھر انہیں بھی برا کہنا شروع کر دیا اور کہنے لگے۔ ''نکل جاؤ گھر سے۔'' میرے شوہر کہتے ہیں کہ میں الگ نہیں ہوں گا' تمہیں طلاق لینی ہے تو لے لو۔ میرے سسر اور نندوں کے کہنے پر انہوں نے مجھے مارا بھی ہے۔ بابا جی! میرا دل چاہتا ہے کہ میں مر جاؤں۔ بابا جی! میرا ایک ڈیڑھ سال کا بچہ بھی ہے' صرف اُس کی وجہ سے میں سب برداشت کر رہی ہوں۔ بابا جی! اللہ کے واسطے' مجھے ایسا تعویذ یا وظیفہ دے دیں پڑھنے کے لیے کہ میرا شوہر الگ ہو جائے۔ میں بھی سکون سے رہ سکوں۔ میری نند کہتی ہے کہ میرا بھائی کبھی الگ نہیں ہوگا۔ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ دے گا۔ بابا جی! کہیں میری نند اور سسر نے میرے شوہر پر تعویذ وغیرہ تو نہیں کروایا؟ بابا جی! پلیز' میری مدد کریں۔ اللہ آپ کو اَجر دے گا۔

☆ بیٹی ثمینہ! اللہ تمہارے شوہر کو عقلِ سلیم عطا فرمائے اور وہ اپنے گھر والوں میں اور بیوی بچے میں توازن رکھ سکے۔ مرد کو عورت سے زیادہ طاقتور بھی اسی لیے کہا گیا ہے کہ وہ بیک وقت کئی طرح کی ذمے داریاں سنبھالتا ہے مگر افسوس کہ آج کل مرد صرف ہاتھ اٹھا کر گالی گلوچ کرکے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بیٹی! تم صبر اور ہمت سے کام لو۔ زیادتی کرنے والوں کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دو۔ اللہ تمہاری والدہ کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ تمہارا بچہ بہت چھوٹا ہے' اس لیے بہت سہل ورد بتا رہا ہوں' پابندی کے ساتھ کرو۔ کرم ہوگا۔ چلتے پھرتے **یَامَالِکَ الْمُلْکِ** کثرت سے پڑھا کرو۔ معاملات میں بالکل خاموشی رکھو' اللہ سب خیر کرے گا۔ مجھے 41 دن بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ روبینہ الماس۔ کراچی۔

☆ بیٹی روبینہ......! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ جو خط مجھ تک پہنچ جاتے ہیں' میں اُن کے جواب ضرور دیتا ہوں۔ خط میں یہ ضرور لکھا کرو کہ اَب تک کون سے وظائف کیے ہیں تاکہ میں اُس کے مطابق جواب دے سکوں۔ بہرحال نمازِ عشاء کے بعد سورۃ النساء آیت 11 بکثرت پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 21 روز ہے۔

□ سحر۔ دادو۔

☆ بیٹی سحر......! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور نمازِ فجر کے بعد سورۃ البقرہ آیت 9 ......7 بار پڑھو اول و آخر دُرود شریف پھر حاجت بیان کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ نسیمہ۔ نواب شاہ۔

☆ بیٹی نسیمہ......! اللہ تمہارے حال پر رحم فرمائے۔ درست سمت میں کوشش کرو' ضرور کامیابی ملے گی۔ بچے سب معصوم ہوتے ہیں۔ جو انہیں محبت سے پالتا ہے' وہ اُسی کا سہارا بنتے ہیں۔ یہ بات ضرور یاد رکھنا' نمازِ فجر اور عشاء کے بعد سورۃ آلِ عمران آیت 18...... 99-99 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ ر۔ح۔ حیدرآباد۔

☆ بیٹی......! اللہ تمہارے شوہر کو عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! تمہیں صرف صبر اور ہمت سے کام لینا

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: C II-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 021-35893121 - 35893122

ہوگا۔ معاملات میں خاموشی رکھو اور بکثرت یَا رحمٰنُ کا وِرد کرو۔ طاق راتوں میں بیٹھ کر خاص طور سے اپنے لیے دُعا کرو' ضرور کرم ہوگا۔ مجھے عید کے بعد حالات سے آگاہ کرنا۔

□ بٹی۔ کراچی۔

☆ بیٹی! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ جو حالات تم نے لکھے ہیں' اُس میں مناسب یہی ہے کہ مجھ سے تعویذ منگوالو۔ طریقۂ کار کے لیے جوابی لفافہ اِرسال ضرور کرو۔

□ ص۔ ر۔ بھکر۔

☆ بیٹی! استخارے دونوں حق میں ہیں۔

□ مریم۔ کراچی۔

☆ بیٹی مریم! اگر یہ چاہتی ہو کہ رزق میں برکت رہے اور کبھی تنگی نہ آئے تو حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور کیا کرو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 3-3 تسبیح حَسبُنَا اللّٰہُ وَنعم الوکیل ضرور پڑھو اور دُعا کرو۔ اول و آخر دُرود شریف 3-3 بار پھر حاجت بیان کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ ز۔ ن۔ اسلام آباد۔

☆ بیٹی! اللہ تمہیں مکمل صحت عطا فرمائے۔ وظیفہ ترک کردو مگر رات کو گرم دودھ پینا عادت میں شامل کرلو۔ پیٹ کم کرنے کے لیے ورزش کرو جس میں سب سے زیادہ سود مند ورزش سیڑھیاں چڑھنا اور اترنا ہے۔ یہ ورزش 3 ماہ وقفے وقفے سے کرو۔ انشاء اللہ' ضرور فائدہ ہوگا۔

□ انعم۔ مقام نامعلوم۔

☆ بیٹی انعم! اللہ تمہاری حاجات قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو۔ بیٹی! دنیا میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو حل نہیں کیا جاسکتا ہو۔ ضرورت صرف اِس بات کی ہے کہ انسان کو اپنے اللہ پر اور پھر اپنے اوپر بھروسا ہو۔ بہن کی طرف سے پریشان مت ہو' وہ خوش

رہے گی۔ یہ شروع کے دن ہیں' آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ جہاں تک تمہارے مسئلے کا تعلق ہے تو بیٹی! بعد نمازِ عشاء ایک بار سورۃ اُحزاب پڑھو اور دُعا کرو۔ والدہ سے کہو' وہ اپنے تمام بچوں کے لیے خیر کی دُعا ضرور کیا کریں۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ ثمرین۔ پشاور۔

o محترم و مکرم باباجی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ صحت تندرستی کے ساتھ تادیر قائم رکھے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم لوگ ایک سال پہلے گھر شفٹ کرکے نئے علاقے میں آئے ہیں' سارا محلّہ اچھا ہے' سامنے والے گھر سے زیادہ آنا جانا رہا۔ شروع میں تو احساس نہ ہوا لیکن آہستہ آہستہ اُن کی شرانگیزیاں سامنے آنے لگیں۔ انہوں نے ہمارے لیے کافی مشکلات پیدا کی ہیں۔ اس وقت آنا جانا بند ہے۔ ایک دوسرے کی شکل سے نفرت پیدا ہوچکی ہے۔ میں اُن کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے کوئی وظیفہ چاہتی ہوں۔ وہ لوگ یا تو گھر چھوڑ کر جائیں یا پھر ہمارے گھر کی اچھی قیمت لگ جائے۔ اس وقت جو صورت ہے' اس میں بہتری یہی ہے کہ دونوں میں سے ایک فیملی چلی جائے ورنہ گاہے بگاہے تو تو میں میں ہوتی رہے گی۔ آپ اس مسئلے کا بہترین حل بتائیے۔ ان کے گھر میں 5 افراد ہیں۔ صاحب' اُن کی بیگم اور 3 لڑکے۔

☆ بیٹی ثمرین! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ بے شک اچھا ہمسایہ بھی نعمت ہے اور برے ہمسایوں سے بڑی مشکل کوئی نہیں۔ بہرحال میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ جلد از جلد مجھ سے تعویذ منگوالو اور طریقۂ

کار کے لیے جوابی لفافہ اِرسال کرو۔

□ روبینہ طارق۔ ایبٹ آباد۔

o باباسائیں! السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ اللہ آپ کو لمبی عمر عطا کرے اور آپ یونہی ضرورت مندوں کی مدد کرتے رہیں۔ (آمین!) باباسائیں! متعدد بار آپ کو منی آرڈر اور جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھا لیکن پتا نہیں آپ کو خط ملا یا نہیں؟ کیوں کہ مجھے ایک بار بھی آپ کی طرف سے کوئی جوابی خط نہیں ملا اس لیے ایک بار پھر آپ کو تکلیف دے رہی ہوں۔ باباسائیں! آج سے تقریباً تین سال پہلے میری بیٹی کے ذریعے میں آپ سے رابطے میں تھی پھر اچانک رابطہ منقطع ہوگیا۔ میں اپنی بیٹی کے لیے ہی آپ سے رابطے میں تھی۔ باباسائیں! اس کے رشتے کا مسئلہ اَب تک حل نہیں ہوسکا ہے۔ اَب 23 سال کی ہوگئی ہے۔ ماشاءاللہ M.B.B.S کا صرف ایک سال رہ گیا ہے۔ اَب اُس کی شادی ہوجانی چاہیے۔ اُس کے لیے میری نظر میں ایک لڑکا ہے۔ میں اپنی بیٹی کا رشتہ اُسی لڑکے سے طے کرنا چاہتی ہوں اور اَب بھی میری یہی خواہش ہے کہ میری بیٹی کا رشتہ اُسی لڑکے کے ساتھ ہی طے ہو۔ باباسائیں! پڑھا لکھا' نمازی' اچھے خاندان کا اور پھر دیکھا بھالا ہے۔ میری بیٹی کے لیے ہر لحاظ سے بہتر ہے۔

☆ بیٹی روبینہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر اور ظہر اور عشاء کے بعد 3-3 تسبیح سورۃ المائدہ آیت 3 پڑھو اول و آخر دُرود شریف 3-3 بار پھر دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ ظاہر شاہ۔ کوئٹہ

o محترم باباجی! السلام علیکم! بعد آداب و تسلیمات کے عرض ہے کہ میں سعودی عرب میں گزشتہ 4 سال سے کام کررہا ہوں۔ میری پریشانی یہ ہے کہ میں جب آدمی کو دیکھتا ہوں تو غصہ آتا ہے۔ دماغ بھی کبھی کبھی بہت خراب رہتا ہے۔ دل بہت بے چین رہتا ہے۔ کوئی بولتا ہے کہ آپ پر تعویذ کیے گئے ہیں' کوئی کیا بولتا ہے' میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ میری کیا بیماری ہے؟

☆ بیٹے ظاہر! میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ مجھ سے تعویذ منگوا کر رکھ لو۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ چلتے پھرتے سورۃ الناس وِرد میں رکھا کرو۔ کرم ہوگا۔

□ رعنا سلیم۔ پنڈی۔

o پیارے باباجی! السلام علیکم! اللہ پاک آپ کو صحت عطا کرے۔ (آمین!) باباجی! آپ کا جواب موصول ہوا تھا۔ میری بیماری کے سلسلے میں آپ نے جو سورۃ البقرہ کی آیت 44 ہر نماز کے بعد پڑھنے کو دی تھی تو وہ میں ہر نماز کے بعد پڑھتی ہوں مگر کتنی بار؟ یہ آپ نے نہیں بتایا ہے۔ پلیز' تعداد بتادیجیے تاکہ میں اِس آیت کو ہمیشہ پڑھتی رہوں۔ باباجی! اپنی دُعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ آج کل ریڑھ کی ہڈی میں شدید درد اٹھا ہوا ہے۔ اٹھنا' بیٹھنا اور جھکنا مشکل ہوا ہوا ہے۔ بس اپنے اللہ پاک پر بھروسا ہے کہ وہ دوبارہ کبھی اِس مرض کا شکار نہیں کرے گا۔ انشاء اللہ! اَب رہا میری بچی کا مسئلہ تو باباجی! میں نے آپ کو

بتایا تھا کہ میری بیٹی کی بات آج سے دو سال پہلے میں نے اپنے بھانجے سے طے کر دی تھی مگر اَب جب شادی میں تھوڑا وقت رہ گیا تھا تو بھانجا یہ شادی نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے یہ بات آپ کو بتائی تھی تو آپ نے جواب میں مجھے ابھی خاموش رہنے کی ہدایت کی تھی مگر اَب جو بات سامنے آئی ہے' وہ یہ ہے کہ بھانجا ایک لڑکی کے چکر میں ہے جس کو وہ ٹیوشن پڑھاتا ہے۔ اُس لڑکی کا نام جویریہ ہے اور اُس کی ماں کا نام انجم ہے جو میرے بہنوئی کے آفس میں کام بھی کرتی ہے۔ جب میری بیٹی نے بھانجے سے بات کی تو اس نے بتایا کہ ہاں' جویریہ میرے ٹائپ کی لڑکی ہے' میں اُس کو پسند کرتا ہوں۔ تم تو کبھی فون تک نہیں کرتی ہو جبکہ وہ ہر وقت مجھ سے موبائل پر بات کرتی رہتی ہے۔ میں اپنے ماں باپ کے کہنے پر تم سے شادی تو کر لوں گا مگر اُس کو بھی نہیں چھوڑوں گا کیونکہ وہ اَب میری پسند ہے۔ بابا جی! اَب یہ بتائیے کہ اِن حالات میں' میں اپنی بیٹی کی زندگی کیسے برباد کر لوں؟ میں نے آپ سے استخارے کے لیے بھی کہا تھا۔ پلیز' بتا دیجیے گا کہ استخارے میں کیا جواب آیا ہے؟ اور اَب آپ کا کیا مشورہ ہے؟ میں اور میرے شوہر ہم دونوں ہی بہت پریشان ہیں۔ جب یہ بات سارے خاندان کو پتا چلے گی تو کتنی شرمندگی ہوگی۔ میری ہنستی مسکراتی سی بیٹی بھی خاموش سی ہو کر رہ گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ یہ مسئلے مجھ کو پاگل کر دیں گے۔ اللہ آپ کو اِن نیک کاموں کا اَجر دے۔ (آمین!)

☆ بیٹی رعنا! استخارہ حق میں نہیں ہے۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ معاملات میں خاموشی رکھنا مناسب نہیں۔ لڑکے کو بلا کر واضح بات کرو' یہی مناسب ہے۔

□ بیٹی ۔ ژوب۔

☆ بیٹی! اللہ تمہیں مزید خوشیاں عطا فرمائے۔ تمہاری بہن حیات ہے اور جلد واپس بھی آئے گی۔ جہاں تک بھائی کا تعلق ہے تو اس کے لیے دونوں بہن بھائی بکثرت یَامُذِلُّ کا وِرد کیا کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

□ نواز چیمہ۔ سرگودھا۔

○ بابا جی! میں آپ کا بہت پرانا مرید ہوں۔ میرے گھر والوں نے ہمیشہ ہر مسئلے کے لیے آپ سے ہی رابطہ کیا اور اللہ کے فضل سے مسئلہ حل بھی ہوا۔ بابا جی! آج میں آپ کو جو مسئلہ بتا رہا ہوں' وہ شاید پڑھنے میں اتنی شدید نوعیت کا نہ لگے مگر میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔ بابا جی! میری شادی تین سال قبل میری پسند سے ہوئی۔ میری بیوی بہت اچھی اور سمجھ دار ہے مگر میرے ماں باپ کو بالکل برداشت نہیں کرتی۔ اَصل میں بابا جی! میری ماں نے کچھ زیادتیاں کی ہیں جس کے بعد اُس کا دل بالکل صاف نہیں ہو رہا۔ وہ کوشش بہت کرتی ہے مگر پرانی باتیں یاد کر کے بہت روتی ہے۔ بابا جی! میں جانتا ہوں' میری والدہ نے بہت زیادتی کی ہے مگر ماں باپ سے کٹ کر رہنا بھی ممکن نہیں۔ میں اچھا کماتا کھاتا ہوں اور چاہتا ہوں' والدین کو اپنے ساتھ رکھ کر اُن کی خدمت کر سکوں۔ میں والدین کو بھی سمجھاتا ہوں نہ وہ بات سمجھتے ہیں اور نہ بیوی۔ آپ اِس سلسلے میں میری مدد فرمائیں تاکہ یہ مسئلہ حل ہو سکے۔

☆ بیٹے نواز! بڑوں کو سمجھنا چاہیے کہ جب تک

چھوٹوں کو وہ محبت کا راستہ نہیں دکھائیں گے' چھوٹے کیسے اُن کی عزت کریں گے؟ اچھائی کا انجام اچھائی ہے اور برائی کا انجام برائی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر وقت چھوٹے ہی غلط ہوں۔ تم اپنا رویہ متوازن رکھو' بیوی پر بہت بوجھ مت ڈالو۔ ہاں' تم خود اپنے والدین کا خیال رکھو' رفتہ رفتہ حالات ٹھیک ہوں گے۔

□ شبنم۔ اوکاڑہ۔

○ بابا جی! میں آپ کو بہت امید سے خط لکھ رہی ہوں۔ میری شادی بھی آپ سے وظیفہ لینے کے بعد ہوئی تھی اور اَب اولاد کا مسئلہ ہے۔ شادی کے تین سال بعد بھی کوئی امید نہیں ہوئی۔ پہلے تو میرے شوہر کچھ نہیں کہتے تھے مگر اَب تھوڑے چڑچڑے سے ہو رہے ہیں۔ بابا جی! میں اِس صورتِ حال سے بہت پریشان ہوں۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ کوئی خرابی نہیں۔ اللہ کی طرف سے دیر ہے۔ باقی کوئی مسئلہ نہیں۔ بابا جی! میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر گزارش کرتی ہوں کہ میرا یہ مسئلہ حل کر دیں۔ مجھے بھی تعویذ عنایت فرمائیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے غصہ بہت آتا ہے۔ پہلے تو کبھی کبھی آتا تھا مگر بابا جی! اَب مجھ سے ذرا سی بھی بات برداشت نہیں ہوتی۔ ہر وقت سر میں درد رہتا ہے۔ میں اپنی اِس کیفیت سے خود بہت پریشان ہوں۔ میرے لیے خصوصی دُعا بھی فرما دیں۔

☆ بیٹی شبنم! تم شدید قسم کی بدنظر کا شکار ہو۔ میں تمہارے لیے تعویذ تیار کر دوں گا۔ مختصر سا وظیفہ بھی بتاؤں گا۔ انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔ بیٹی! خوب صدقہ خیرات کرو۔ مجھے واپسی والے پتے کے ساتھ خط لکھو تاکہ تفصیل سے جواب دیا جا سکے۔

□ عامر۔ کرک۔

○ بابا جی! میرا مسئلہ روزگار کا ہے۔ گھر میں 8 افراد ہیں اور میرا کام کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔ بابا جی! پیٹ کو تو روٹی چاہیے۔ بچے بھی ہر وقت روتے رہتے ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ میری مدد کریں۔

☆ بیٹے عامر! اللہ تمہاری مشکل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمٰن پڑھو اور دُعا کرو۔ وظیفے کی مدت ایک ماہ ہے۔

□ ثانیہ احمد۔ U.K

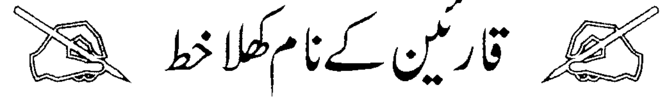
○ بابا جان! میری اردو بہت اچھی نہیں' اِس لیے کوئی غلطی ہو تو معاف کر دیں۔ بابا جان! میں جلد ہی پاکستان آؤں گی' کیا میں آپ سے مل سکتی ہوں؟ مجھے بہت شوق ہے کہ آپ کو دیکھوں۔ آج سے دس سال پہلے جب اپنی والدہ کے ساتھ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے دفتر آئی تھی' تب آپ کی ایک جھلک دیکھی تھی تب سے اَرمان ہے کہ آپ کو دیکھوں۔

☆ بیٹی ثانیہ! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ میں اَب اپنا سارا وقت عبادت میں صَرف کرتا ہوں اس لیے گھر سے نکلنا ہی برائے نام کر دیا ہے پھر ملنا ضروری بھی نہیں۔ میں اپنے بچوں کو ہمیشہ اپنی دُعاؤں میں یاد رکھتا ہوں۔

□ زینب علی۔ دبئی۔

○ بابا جی! آپ کی دُعاؤں کی برکت سے 3 ماہ قبل میری شادی ہو گئی۔ تمام معاملات بخیر وخوبی طے پا گئے۔ بابا جی! اَب میں چاہتی ہوں کہ دوبارہ سے کوئی اچھی سی جاب کر لوں۔ میں کسی پرائیویٹ کمپنی کو جوائن کرنا چاہتی ہوں۔ میرے دبئی آنے کے بعد سے گھر میں کافی مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ ابا نے شادی پر جو قرض لیا تھا' وہ بھی میری ہی ذمے داری ہے۔ اِس کے علاوہ بابا جی! میرے لیے خصوصی دُعا کریں کہ میں ایک کامیاب زندگی گزاروں۔

☆ بیٹی زینب! اللہ تمہیں مزید خوشیاں عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور بکثرت پہلا کلمہ پڑھو۔ بعد نمازِ فجر 700 بار سورۃ البقرہ آیت 7 پڑھو اول و آخر دُرود شریف 7-7 بار پھر حاجت بیان کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔



محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آئیے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

□ نعیم خان۔ کرک۔

○ باباجی! اللہ آپ کو صحت دے۔ میرے دونوں بیٹے ایک عرصے سے باہر جانا چاہ رہے ہیں۔ آپ نے وظیفہ دیا تھا اُن کی ماں کے پڑھنے کے لیے۔ اُس کی برکت سے لڑکوں کی بڑی بہن نے اُن کا ویزہ بھیج دیا ہے۔ اب میری آپ سے یہ گزارش ہے کہ ایسا جلالی وظیفہ دیں کہ دونوں کو وہاں اچھا کام مل جائے اور اُن کا دل بھی لگ جائے۔ میں اور میرے گھر والے آپ کے شکر گزار رہیں گے۔

☆ بیٹے نعیم......! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ والدہ سے کہو حسبِ استطاعت صدقہ خیرات کیا کریں۔ بعد نمازِ عشا 1100 بار سورۃ المائدہ آیت 6 پڑھیں اور دُعا کریں۔ مدت 41 دن ہے۔

□ سائرہ فضل۔ گجرات۔

○ باباجی! ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ ہمارا ایک ہی بھائی ہے، شادی سے پہلے وہ ہم بہنوں اور ماں باپ کا بہت خیال کرتا تھا مگر اب بہت بدل گیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری بھابی اُس پر جادو کرتی ہے۔ آپ ایسا تعویذ دیں کہ وہ پھر سے ہماری بات ماننے والا بن جائے۔ اِس کے علاوہ باباجان! ایک مسئلہ اور ہے، وہ یہ کہ ہمارے ابو بت گندی گندی گالیاں دیتے ہیں اور ہماری ماں پر ہاتھ بھی اٹھاتے ہیں، اس کا بھی حل بتائیے۔

☆ بیٹی سائرہ! تم نے اپنے رویے کی وجہ سے بھائی کو دور کیا ہے۔ پہلے وہ مجبور تھا مگر اب اُس کا اپنا کنبہ ہے۔ اولاد ہونے کے بعد وہ اور دور ہو جائے گا لہٰذا تم لوگ اپنا رویہ بدلو، اس کی بیوی کو پریشان مت کرو۔ معاملات میں خاموشی رکھا کرو اور ہر نماز کے بعد یَا صَغِیرُ یَا کَبِیرُ کا بہت وِرد کیا کرو۔ مدت 21 روز ہے۔

□ رحمان۔ سیالکوٹ۔

○ پیارے باباجان! السلام علیکم! سدا سلامت رہیں۔ (آمین!) باباجان! بڑی امید لے کر حاضر ہوں۔ بہت زیادہ پریشان ہوں۔ والد فوت ہو چکے ہیں۔ میں عرصہ آٹھ سال سے دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ دو مرتبہ کراچی میں ملازمت کے لیے جا چکا ہوں، لیکن کہیں بھی کام نہیں بنتا ہے۔ جہاں بھی کام کرتا ہوں، کوئی نہ کوئی رکاوٹ ہو جاتی ہے۔ اپنا درزی والا کام شروع کیا، اس میں بھی بہت نقصان ہوا ہے۔ اب تو زندگی سے ہی مایوس ہوں۔ بوڑھی والدہ روز اِس آسرے پر میرا انتظار کرتی ہیں کہ کوئی کام مل گیا ہوگا لیکن انہیں مایوس کرتا ہوں۔ نہ معلوم کسی نے کیا جادو یا بندش کر دی ہے کہ پریشانی نے گھر کا راستہ دیکھ لیا ہے؟ باباجی! آپ کو خدا اور رسولِ کریم پاک نبی کریم کا واسطہ ہے، میرے لیے کوئی تعویذ یا وظیفہ دیں۔ میں نماز کا پابند ہوں۔ رزقِ حلال چاہتا ہوں۔ کئی مرتبہ تبلیغ کے لیے بھی والدہ کے ساتھ جا چکا ہوں۔ گھر میں ٹی وی، ٹیپ کچھ بھی نہیں ہے پھر بھی مقدر خراب ہو گیا ہے۔ نہ معلوم میرے لیے اچھے دن کب آئیں گے؟

☆ بیٹے رحمان! نماز کی پابندی رکھو اور نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمٰن پڑھو رزق میں برکت کی دُعا کرو۔ بیٹے! ایک بات یاد رکھو، جو لوگ اللہ کو یاد رکھتے ہیں، اللہ بھی انہیں یاد رکھتا ہے۔

□ عائشہ جنید۔ چارسدہ۔

○ باباجی! السلام علیکم! مسئلہ یہ ہے کہ دوسری شادی کے لیے میرا کوئی رشتہ نہیں آتا۔ میری عمر 26 سال ہے۔ جس شخص سے میری پہلی شادی ہوئی تھی، وہ میرے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ وہ بہت گندہ آدمی تھا۔ اب میں چاہتی ہوں کہ دوسری شادی کرلوں۔ میرے بوڑھے ماں باپ بھلا کب تک میرا خیال رکھیں گے؟ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے، مجھے دورے بھی

رٹتے ہیں اور جب میری طبیعت خراب ہوتی ہے تو مجھے کچھ بھی پتا نہیں چلتا کہ میں کیا کررہی ہوں؟ باباجی! کوئی اچھا سا وظیفہ بتادیں کہ میرے دورے ختم ہوجائیں۔ میری شادی کے لیے بھی کوئی اچھا سا وظیفہ بتادیں کہ میں بھی اپنے گھر کی ہوجاؤں۔ بابا جی! میرے خط کا جواب ذرا جلدی دیجیے گا' شکریہ!

☆بٹی عائشہ! اللہ تمہیں مکمل شِفاء عطا فرمائے۔ تمہیں پہلے اپنا مکمل علاج کرانا چاہیے۔ تم نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۃ جن پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 14 دن ہے۔

□ زاہدہ۔ رائے ونڈ۔

o باباجی! مسئلہ میری بہن کا ہے۔ رشتے آتے ہیں لیکن لوگ پلٹ کر دوبارہ نہیں آتے۔ جس نے جو پڑھنے کا بتادیا' وہ پڑھا۔ بہت وظیفے پڑھے ہیں لیکن شادی کا مسئلہ جوں کا توں ہے۔ عمر تیزی سے بیت رہی ہے۔ اس کے بعد ایک اور بہن اور ایک بھائی ہیں' اُن کی بھی شادی کی عمر ہورہی ہے۔ آپ سے تعویذ منگوایا تھا جو کہ کافی عرصے پہنا پھر اتار دیا اور ٹھنڈا بھی کردیا۔ آپ کو دوبارہ خط لکھا' آپ نے کہا کہ تعویذ ٹھنڈا نہیں کرنا تھا۔ اَب ہم سے غلطی ہوگئی ہے۔ اللہ ہمیں معاف کردے۔ آپ سے بھی معافی مانگتے ہیں۔ اَب آپ کیا کہتے ہیں کہ دوبارہ تعویذ منگوالیں؟ جواب ضرور دیجیے گا۔ ہم سب بہت پریشان ہیں۔ میری راتوں کی نیند اُڑگئی ہے۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔

☆بٹی زاہدہ! یہ مسئلہ بہت عام ہوتا جارہا ہے۔ لڑکی والے بہتر سے بہتر کی تلاش میں اور لڑکے والے مالی آسودگی کے انتظار میں مسائل کو بڑھارہے ہیں۔ شادی کی ایک عمر اور خاص وقت ہوتا ہے' وہ گزر جائے پھر بہت مشکل ہوجاتی ہے۔ بہرحال تعویذ دوبارہ منگوالو۔

☆☆......☆☆

اس ٹریول گائیڈ میں مختلف ممالک کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کی جائیں گی

ملیشیاء ایک دنیا

دیس دیس گھومیے......!

زین شمسی

ملک......(ملیشیاء)

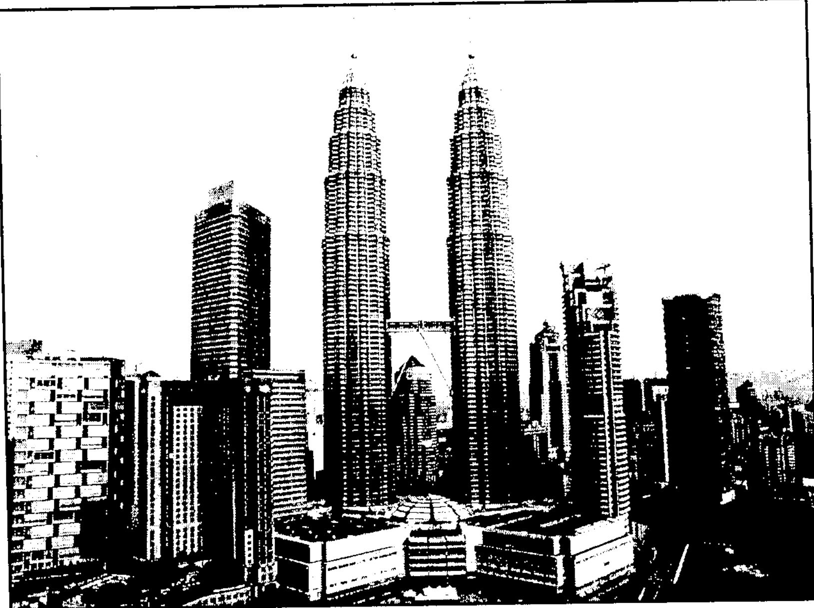
دارالحکومت (Kulala Lumpur)

کرنسی......(Ringit)

آبادی...(31,696,000)

زبان......(مالے)

ملیشیاء جنوب مشرقی ایشیا میں واقع مسلم ملک ہے۔ اس کی سرحدیں تھائی لینڈ' میانمار اور انڈونیشیا سے ملتی ہیں۔ امن پسند اور محنتی لوگوں کا ملک ہمارے

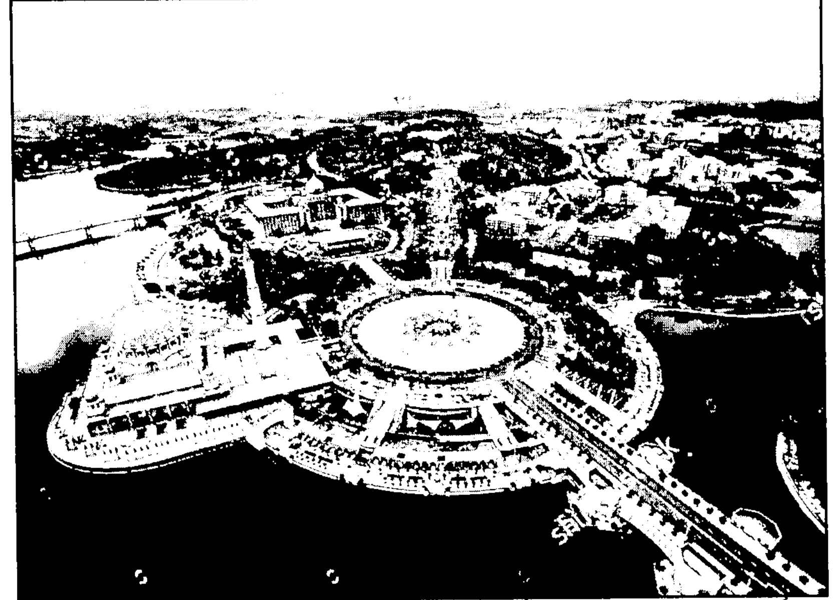


پاکستان سے چھوٹا ہے۔

سب سے پہلے تو ان تمام لوگوں کا شکریہ جن کو یہ سلسلہ پسند آیا۔ امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے جیسا کہ آپ سے وعدہ کیا تھا کہ ہر ماہ ایک نئی جگہ کا چھوٹا سا تعارف لے کر حاضر ہوں گے اسی لیے اس دفعہ ایک ایسی جگہ کی روداد پیش کر رہا ہوں۔ جو میری زندگی کا دوسرا سفر تھا۔

Towers جن کو بچپن سے ہی ٹی وی پر دیکھا تھا اب زندگی نے موقع دیا تھا کہ ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔

کوالالمپور ایک بہت بڑا شہر ہے دنیا بھر سے سیاح یہاں گھومنے کے لیے آتے ہیں۔ کوالالمپور گھومنے کے لیے اور اچھا وقت گزارنے کے لیے بہت سارے مقام ہیں۔ خوبصورت پارکس'



کہتے ہیں کہ انسان سفر سے بہت سیکھتا ہے تو جناب میں نے بھی اس سفر سے بہت کچھ سیکھا جس جگہ کا ذکر کرنے جا رہا ہوں اس ملک کا نام ہے ملیشیاء ۔ ملیشیا کا سفر مختصر تھا صرف 7 دن میں پوری طرح گھومنا اور معلومات حاصل کرنا ناممکن تھا لیکن پھر بھی بہت دلچسپ معلومات حاصل ہوئیں۔

ملیشیاء کا سب سے مشہور اور بڑا شہر KualaLumpur میں ہی 7 دن قیام کیا۔ یہ شہر ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے صاف ستھرا اور پُر امن شہر' لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ایک دلچسپ منظر پیش کر رہے تھے۔ پہنچنے کے ساتھ ہی کچھ جگہوں کو دیکھنا بہت ضروری تھا جیسے کہ Petronas

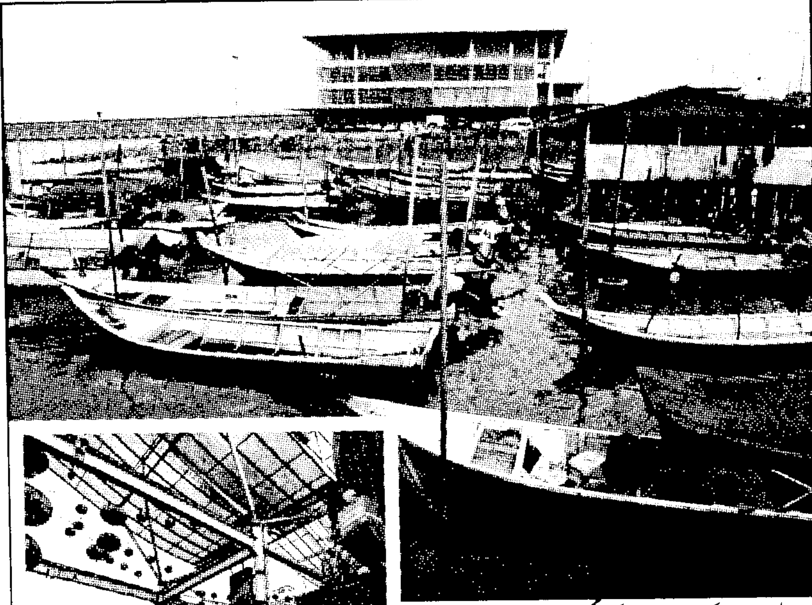
بڑے بڑے شاپنگ مال اور مختلف تفریحی مقام' خوبصورت نظاروں اور جگہوں سے بھرپور اس شہر میں مجھے سب سے اچھی جگہ China Town لگی جہاں دنیا بھر کا سامان خریداری کے لیے موجود تھا۔

China Town ایک بہت بڑی مارکیٹ ہے جہاں گھومنے کے لیے ایک پورا دن بھی کافی نہیں ہے ۔ کوالالمپور میں کچھ دن گھومنے کے بعد کئی پاکستانی لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ جنہوں نے یہ بتایا کہ کوالالمپور سے کچھ فاصلے پر کافی خوبصورت نظارے موجود ہیں ۔ پہلے Pelebuhan) (Klang جانے کا موقع ملا جو کہ ایک چھوٹی سی بندرگاہ ہے یہاں سے لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر قریبی

جاتے ہیں۔

ان جزیروں پر پہنچ کر پہلی دفعہ دنیا کے مختلف مذاہب سے آشنائی ہوئی۔ جو کہ پہلے تو کافی حیران کن تھا لیکن یہ منظر کافی دلچسپ اور منفرد بھی لگے۔ غیر

دیسی کھانے کھاتے ہوئے گزرا۔ ملیشیا گھومنے کے اعتبار سے ایک بہترین ملک ہے مہنگائی بھی نہیں ہے اور خوبصورت مناظر بہت سارے ہیں' یہاں کے لوگ بھی اپنے کام سے کام رکھنے والے اور دھیمے





معمولی ہیت کے اژدھوں کے مجسمے' بڑے بڑے مندر اور جلتے ہوئے کاغذ دیکھ کر حیرانگی ہوئی بالکل ایسے ہی جیسے کسی بھی نئی چیز کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ مخصوص قسم کے کاغذ جلانا مذہبی فریضہ مانا جاتا ہے۔

کوالالمپور سے چند منٹ دور ایک خوبصورت اور چھوٹا سا شہر موجود ہے۔ ٹرین سے یہاں پہنچنے میں مجھے 30 منٹ لگے اس شہر کا Jaya Putra ہے جہاں سرکاری دفتر کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اس شہر کی سب سے اچھی اور مشہور بات یہ ہے کہ بے شمار بڑی چھوٹی نہریں اور باغات موجود ہیں یہاں بھی سیاحوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ مجھے Jayaputra بالکل اسلام آباد جیسا خوبصورت اور سرسبز لگا۔

کھانے پینے کے اعتبار سے ملیشیاء کافی اچھی جگہ ہے۔ ہر قسم کے کھانے موجود ہیں۔ میرا زیادہ وقت'

مزاج کے ہیں۔

مجھے ملیشیاء چھٹیاں گزارنے کے اعتبار سے ایک بہترین جگہ لگی۔ دوبارہ موقع ملا تو پھر جاؤں گا اور ان سب جگہوں پر جانے کی کوشش کروں گا جہاں نہیں جا پایا۔ جن لوگوں کو سفر کرنے کا شوق ہے وہ ملیشیاء کو ایک بہترین جگہ پائیں گے۔

اگلی دفعہ انشاء اللہ ایک نئے اور منفرد سفر کے ساتھ ملاقات ہوگی امید ہے آپ کو اس ماہ کا سفر پسند آیا ہوگا۔

☆☆......☆☆

معروف شعراء کے مجموعہ کلام پر سیر حاصل تبصرے

نعیم ابرار یا رازی فاروقی؟



علی حیدر ملک

ہمہ جہتی کسی شاعر یا ادیب کی بڑی خوبی خیال کی جاتی ہے اور یہ کچھ غلط بھی نہیں مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاعر یا ادیب کی ہمہ جہتی اکثر قاری اور ناقد کے لیے پریشانی کا سبب بھی بنتی ہے۔

عصرِ رواں کے ہمہ جہت شاعروں اور ادیبوں میں نعیم ابرار رازی فاروقی کا نام بھی شامل ہے نعیم ابرار ان کا اصل اور رازی فاروقی قلمی نام ہے کہیں ان کا اصل نام نعیم ابرار بھی چھپتا ہے کہیں قلمی نام رازی فاروقی اور کہیں بیک وقت دونوں۔

نعیم ابرار صحافت کے پیشے سے وابستہ ہیں اور انہوں نے بڑے اور کثیر الاشاعت اخبار و جریدے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور اب بھی دے رہے ہیں۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو وہ زمانہ طالب علمی سے شعر کہہ رہے ہیں نظموں اور غزلوں پر مشتمل ان کا پہلا مجموعہ کلام ''دھوپ الاؤ'' طالب علمی کے دور میں ہی شائع ہوا تھا۔

اس کے بعد ان کی چار تصانیف شائع ہوئیں۔ نثری نظموں کا مجموعہ ''ریگستان میں دوپہر'' بچوں کے لیے نظموں کا مجموعہ ''رم جھم گاؤ'' طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''داؤ پیچ'' (دوسرا نظر ثانی شدہ ایڈیشن ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا) اور نظموں اور غزلوں کا ایک مجموعہ ''نیا لہجہ محبت کا''۔

غزل اردو کی ایک ممتاز منفرد اور سب سے مقبول صنف ہے اگرچہ اس پر اعتراضات بھی کیے گئے مگر اس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی اپنی ہیئتی اور تکنیکی محدودات کے باوجود اس نے ہر زمانے کا ساتھ دیا اور ہر عہد کے مسائل کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی کوشش کی عہدِ حاضر میں بھی غزل کثرت سے کہی جارہی ہے۔

غزل کہنے والوں کی صف میں کہنہ مشق اور مستند شاعروں کے ساتھ ساتھ نسبتاً نئے

مگر باصلاحیت شعرا بھی موجود ہیں نعیم ابرار یقینی طور پر ان میں سے ایک ہیں۔

نعیم ابرار نے اپنی غزلوں میں اپنے عہد کی سوچ اور حسیت کو گرفت میں لینے کی سعی مشکور کی ہے۔

اس عہد میں ہر شخص رزق کی تلاش میں سرگرداں ہے اور رزق تلاش کرتے کرتے وہ آدھا رہ جاتا ہے۔ گویا آدمی میں جہاں کھاتا ہے وہاں رزق بھی آدمی کو کھاتا رہتا ہے نعیم ابرار کہتے ہیں:

تلاشِ رزق میں رد کر کے خود کو
یہاں ہر شخص آدھا ہو رہا ہے

محبت کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا ہے لیکن بعض دانشوروں کے نزدیک یہ آخری تجزیے میں کسی اور سے نہیں خود اپنی ذات یا اپنی انا سے محبت ثابت ہوتی ہے نعیم ابرار کا شعر ہے:

مجھے تم سے محبت ہی رہے گی
سبب یہ ہے کہ تم میری انا ہو

جدید دور کی ایک دین یہ ہے کہ گھر آنگن سے محروم ہو گئے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ

آنگن ختم ہوئے تو بچے کھیل رہے ہیں سڑکوں پر
کاش کوئی گھر بچ جاتا بستی میں کوئی آنگن ہوتا

زندگی کی کچھ اقدار ہوتی ہیں ان اقدار سے روگردانی کر کے آدمی محض ایک کاروباری وجود بن کر رہ جاتا ہے:

آپ اقدار کے لیے جی لیں
ورنہ بازار کے لیے جی لیں

نعیم ابرار کی غزلوں سے بلا تبصرہ چند اور شعر ملاحظہ فرمایئے جن سے ان کے زاویہ فکر اور تخلیقی ہنرمندی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے:

بے وفا نکلے بہت ہم تو یہیں کے ہو رہے
آسماں کے آدمی تھے اور زمیں کے ہو رہے

....

سفر کی ابتدا میں صبح تھے ہم
مگر لگتا ہے کہ اب شام ہو گئے

....

لگتا ہے آپ میرے بہت ہی قریب ہیں
یعنی کہ میرے خواب ابھی تک عجیب ہیں

....

اب بالکل معدوم ہوئے
ہم بھی ایک ہجوم ہوئے

نعیم ابرار کی زیادہ تر نظمیں بھی محبت کے گرد گھومتی ہیں مگر ان میں محبت کو بھی نئے ماحول اور نئے تناظر میں پیش کیا گیا ہے ان پر صنعتی عہد اور ٹیکنالوجی کی ایجادات کے سائے بہت گہرے ہیں۔ اس سلسلے میں' میں تبدیل نہیں ہونا چاہتا۔ پاس ورڈ' میرا سایہ اور کلوننگ وغیرہ مثالوں کی حیثیت رکھتی ہیں نمونے کے طور پر نظموں کے صرف دو دو ابتدائی مصرعے ملاحظہ ہوں:

تم جس شاپنگ مال کے بک اسٹال پر ہو
میں بھی اس کے ریستوران میں بیٹھا ہوں
(میں تبدیل نہیں ہونا چاہتا)

تم میری زندگی کی اک ناگزیر ضرورت ہو
پاس ورڈ کی طرح سے تم کو یاد رکھوں گا میں
(پاس ورڈ)

بہت دنوں سے کوئی کال بھی نہیں آئی
بہت دنوں سے ایس ایم ایس کوئی نہیں آیا
(میرا سایہ)

میں دوبارہ جنم نہیں لے سکتا کیا؟
بالکل ویسے ہی جیسے میں خود چاہوں
(کلوننگ)

''ریگستان میں دوپہر'' رازی فاروقی کی

طویل نثری نظم ہے جسے نثری نظموں کا مجموعہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے اس کے چھبیس حصے ہیں ان حصوں کو الگ الگ پڑھا جائے تو یہ الگ الگ نظمیں معلوم ہوں گی اور اگر انہیں ملا کر ایک ساتھ پڑھا جائے تو ان سے ایک مسلسل نظم کا تاثر پیدا ہوگا۔

نثری نظم کو بعض حلقوں میں اب بھی متنازعہ سمجھا جاتا ہے کچھ لوگ اس کے نام پر معترض ہیں تو کچھ اس کی ہیت اور شعری یا عروضی قواعد سے آزادی پر۔

نثری نظم کیا ہے، اور کیوں ہے۔ اسے ادبی صنف کے طور پر تسلیم کیا جانا چاہیے یا نہیں یہ ایک علیحدہ اور طویل بحث ہے۔ اس بحث سے گریز کرتے ہوئے اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ بعض لوگ نثری نظم کہنے کا حق صرف ان شاعروں کو دینا چاہتے ہیں جو غزلیں اور نظمیں کہہ چکے ہوں یا کہہ سکتے ہوں۔

ان کا کہنا ہے کہ تجریدی مصوری کا حق بھی صرف اس مصور کو حاصل ہے جو پورٹریٹ اور لینڈ اسکیپ بنا سکتا ہو رازی فاروقی اس شرط پر پورے اترتے ہیں۔

ریگستان میں دوپہر ایک ایسی نظم ہے جو ٹی ایس ایلیٹ کی شہرہ آفاق نظم ''ویسٹ لینڈ'' کی یاد دلاتی ہے۔

دو عالمی جنگوں نے بیسویں صدی میں دنیا کو ایک خرابے میں تبدیل کر دیا تھا۔ یہ خرابہ پھیلتے پھیلتے اکیسویں صدی میں اب ریگستان میں دوپہر تک آ پہنچا ہے۔ اس نظم کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

ہماری چیخیں صدیوں سے ہمارے سینوں میں
دبی ہوئی ہیں
اب وہ وقت قریب ہے
جب ہم سب مل کر
اپنی قیامت کا صور
خود پھونکیں گے

یہ نظم آج کی پُر خوف زندگی اور پُر خطر دنیا کا استعارہ بھی ہے اور انسان کی تاریخ کا آئینہ بھی۔ اسے انسانی مقدر کا اشاریہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ نظم کا اختتام اس طرح ہوتا ہے:

وہ
چرمراتے سکوت
میں آگے بڑھے
ابابیل کے پر سمیٹے
اس کے
مردہ وجود کے بوسے لیے
پھول اپنے اپنے
سینوں پر سجائے
شکستہ غار میں
داخل ہوگئے
ان کے سائے آگے بڑھتے رہے
معدومیت
کی منزل تک
جنگل اب بھی ان میں جل رہے تھے

☆☆

نعیم ابرار کی ایک نظم ''مستقبل'' ملاحظہ فرمائیے:

اب ہم کو بھی نہیں ضرورت
خوابوں کی
اور تم کو بھی نہیں ضرورت
خوابوں کی
تو پھر مستقبل ہی کیا ہے خوابوں کا

رازی فاروقی کی شاعری میں جدت بھی ہے اور تازگی بھی مگر یہاں وضاحت ضروری ہے کہ جدت اکثر معنویت سے عاری اور تازگی کاغذی پھولوں کے مانند بھی ہوتی ہے لیکن رازی فاروقی کے یہاں ایسا نہیں ہے۔ ان کی جدت معنویت کی حامل ہے اور تازگی گل نو شگفتہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

میں نے یہ رائے ان کی غزلوں، نظموں اور نثری نظموں کے مطالعے کے بعد قائم کی ہے۔ ان کی رباعیات، قطعات اور ہائیکو کا ذکر میں نے یہاں نہیں کیا۔

اسی طرح بچوں کے لیے ان کی نظموں اور فکاہیہ مضامین سے بھی بحث نہیں کی جس کی وجہ وہی ہے جو میں نے ابتدا میں بیان کی تھی یعنی یہ کہ ادیب یا شاعر کی ہمہ جہتی ایک بڑی خوبی خیال کی جاتی ہے مگر قاری اور ناقد کے لیے پریشانی کا سبب بھی بنتی ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا نعیم ابرار کا تعلق صحافت کے شعبے سے ہے۔

ان کی صحافتی تحریریں بھی اسی نام سے شائع ہوتی ہیں جبکہ ادبی نگارشات، قلمی نام رازی فاروقی کے نام سے سامنے آتی ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ مستقبل میں نعیم ابرار رازی فاروقی پر غالب آجاتے ہیں یا رازی فاروقی نعیم ابرار پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔

یا پھر دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے قرطاس و قلم کی شاہراہ پر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔

فیصلہ نعیم ابرار اور نعیم ابرار سے زیادہ وقت کرے گا۔

☆☆......☆☆

غزل

نعیم ابرار

منزل کا نشاں دیکھنے والے کو ملے گا
اور اس کا صلہ پاؤں کے چھالے کو ملے گا

جلنا تو مجھی کو ہے دیا بن کے مسلسل
لیکن مرا انعام اُجالے کو ملے گا

کیا نور بصیرت پہ بھی سانپوں کے ہیں پہرے
کیا اس کا اُجالا کسی ''کالے'' کو ملے گا

ہم کو تو ابھی مانگنا آیا ہی نہیں ہے
سنتے ہیں کہ تُو مانگنے والے کو ملے گا

خوابوں کے لئے درد کو سہنا ہے ضروری
سپنا کہاں تعبیر کے پالے کو ملے گا

جو لوگ حوالے کے بناء جی نہیں سکتے
اُن کا یہاں حاصل بھی حوالے کو ملے گا

پیالہ میرے ہونٹوں سے گریزاں نہیں ہوتا
کیونکہ جو بچے گا وہ پیالے کو ملے گا

ہائیکو......نعیم ابرار

مطلع ابر آلود
لیکن جو بوندیں ٹپکیں
سب ہیں زہر آلود

جہاں گلابوں کی کاشت ہوتی ہے

گلابوں سے مہکتا ایک میدانِ جنگ......!
ان گلابوں میں شہیدوں کا لہو شامل ہے......!!

اختر حفیظ

پھولوں کا تصور ذہن میں آتے ہی ایک مسحور کن احساس سرائیت کرنے لگتا ہے۔ پھول محبت اور امن کی علامت مانے جاتے ہیں مگر یہ پھول جو کبھی کسی کے گلے کا ہار بنتے ہیں، کبھی کلائی کا کنگن تو کبھی کسی حسین عورت کی زلفوں کو مہکاتے ہیں، ان کے کھلنے اور ہم تک پہنچنے کا عمل اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ انسان سے پھولوں کا رشتہ اس کے پیدا ہونے سے لے کر رخصت ہونے تک رہتا ہے۔

حیدرآباد سے 18 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ وانکی وسی کئی دہائیوں سے گلابوں کی خوشبو سے مہک رہا ہے۔ یہاں کئی سو ایکڑ پر گلاب کے پھولوں کے کھیت آج بھی رنگوں اور خوشبوؤں سے لوگوں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ میں اپنے دو دوستوں کے ساتھ جب اس قصبے میں پہنچا تو مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تاحد نظر یہاں گلاب کھلے ہوں گے۔ اس وقت صبح کے چھ بجے تھے اور سورج طلوع ہونے کو تھا۔ ہر کھیت گلابوں سے سجا تھا مگر دھند نے ایسا گھیرا ڈال رکھا تھا کہ سب کچھ دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔



کھیتوں میں کام کرتے مزدور مظفر نے مجھے پھولوں پر غور کرتے دیکھا تو کہنے لگا۔

''ان گلابوں میں شہیدوں کا لہو شامل ہے۔''

اس کا اشارہ جنگ میانی کی طرف تھا جو سندھ کے تالپوروں نے انگریزوں کے خلاف 1843ء میں لڑی تھی۔ اس جنگ کا ہیرو ہوش محمد 'ہوشو شیدی' کو مانا جاتا ہے۔ میانی کے میدان میں کئی انگریز سپاہیوں کی اجتماعی قبریں بھی ہیں۔

یونانی روایت کے مطابق گلاب کو محبت کی دیوی ایفروڈائٹ نے اپنے آنسوؤں اور اپنے محبوب ایڈونس کے خون سے تخلیق کیا، جبکہ ایک عربی روایت کہتی ہے کہ گلاب اس وقت تک سفید تھا جب تک ایک بلبل اس کی ٹہنی پر نہ بیٹھا تھا۔ اس سے قبل ایسے سریلے سروں کی خبر نہ تھی، بلبل کی آواز کچھ اور تھی، مگر اس پھول سے اس کی انسیت اتنی بڑھ گئی کہ اس نے پہلی بار اپنے گلے سے مدھر آواز نکالی۔ اس کا پیار اتنا شدید تھا کہ اس نے پھول کو دبوچا تو ایک کانٹا اس کے دل میں پیوست ہوا اور پھر سفید پھول ہمیشہ کے لیے سرخ ہو گیا۔



ایک اندازے کے مطابق گلاب ہماری دھرتی پر ساڑھے تین کروڑ سال سے ہے۔ جس کی کئی اقسام ہیں چین میں 5000 ہزار سال قبل گلاب کی کاشت ہوئی جس کے بعد یہ مشرقی وسطیٰ سے ہوتا ہوا ایشیا پہنچا۔

کھیتوں میں داخل ہوتے ہی احساس ہوا کہ شبنم ساری رات گلابوں کے چہرے دھو رہی تھی اور گلابوں کی پتیوں اور ٹہنیوں پر شبنم کے قطرے موتیوں کی مانند لگ رہے تھے۔ جیسے جیسے سورج کی کرنیں پھولوں کے جسم پر پڑیں، شبنمی قطرے موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے قبل ہی لوگ کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔

گلاب کے پھولوں کو چننے کا عمل عموماً 5 بجے شروع ہوتا ہے، مگر صبح 4 بجے بھی مزدور سر پر ٹارچ لگا کر پھول چننا شروع کر دیتے ہیں۔ ویسے تو گلاب کے کھیتوں میں سارا سال پھول کھلے ہوتے ہیں اور انہیں بازار تک پہنچانے کا کام بھی جاری رہتا ہے، مگر جون جولائی میں اس میں کمی آ جاتی ہے۔ سردیوں کے موسم میں گلابوں کو صبح کے وقت جمع کیا جاتا ہے جبکہ موسم گرما میں شام کے وقت پھول چنے جاتے ہیں۔

جو ہاتھ پھول چنتے چنتے اُن کی خوشبو سے مہک جاتے ہیں ان ہاتھوں میں کانٹے بھی چبھتے ہیں مگر وہ ہاتھ اتنی جرأت نہیں حاصل کر پاتے کہ اپنا گزر بسر بہتر انداز سے کر سکیں۔ خادم حسین روز صبح اٹھ کر پھول چنتا ہے اور پچھلے دس برس سے پھولوں سے اس کا رشتہ قائم ہے مگر اسے ایک



کلو پھول چننے پر 37 روپے ملتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ تاجروں کی اجارہ داری کی وجہ سے جنوری کے ماہ سے اب تک 32 روپے ملیں گے۔ اگر وہ 10 کلو پھول جمع کرتا ہے تو اسے یومیہ 370 روپے ملیں گے مگر کچھ روز بعد یہ رقم بھی کم ہوجائے گی۔

ان پھولوں کو بوریوں میں بھر کر کانٹے تک لایا جاتا ہے' جہاں انہیں تولا جاتا ہے۔ ہر ٹوکری یا چھلی میں دس کلو پھول تولے جاتے ہیں۔ یہاں پر 'بندی' کا حساب ہوتا ہے۔ بندی سے مراد پھول چننے والا ایک سال تک کانٹے کے مالک سے ایک غیر تحریر شدہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ کس حساب سے ایک کلو پھول سال بھر دے گا۔ وزن کرنے کے بعد انہیں بڑی بالٹیوں میں رکھا جاتا ہے جس میں ٹھنڈا پانی اور برف ڈالی جاتی ہے تاکہ پھول زیادہ دیر تک تازہ رہیں۔ اس کے بعد ان بالٹیوں کو ٹرک میں ترتیب سے رکھ کر کراچی' حیدرآباد اور ملک کے دیگر شہروں کے لیے روانہ کیا جاتا ہے۔ مگر اب کچھ وقت سے ماحولیاتی تبدیلیوں اور دیگر عوامل کی وجہ سے پھولوں کی کاشت متاثر ہوئی ہے۔ مظفر کا کہنا ہے کہ خرچ نکالنے کے بعد سال میں ڈھائی سے تین لاکھ روپے کی بچت ہوتی ہے

مگر نقلی کھاد اور سیم کی وجہ سے اب پھولوں کی کاشت سخت متاثر ہورہی ہے۔ جبکہ زرعی ماہر بھی اس سلسلے میں کچھ کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ یہاں پر 2000 ایکڑ سے بھی زیادہ رقبے پر پھولوں کی کاشت ہوتی ہے۔ گلاب کے پھولوں کی کاشت کے یہاں تین مراکز ہیں' جن میں مسو بھرگڑی' ہٹڑی' اور وانکی وسی شامل ہیں۔ ویسے تو یہاں سفید گلاب کی کاشت بھی ہوتی ہے مگر اس وقت سفید پھول نہیں تھے۔

اس کہانی کا ایک دردناک پہلو یہ بھی ہے کہ کچھ زمیندار جو کہ کانٹے پر پھول بیچنے کے محتاج نہیں ہیں وہ بچوں سے جبری مشقت کرواتے ہیں۔ وہ بچے اور بچیاں اسکول نہیں جاتے اور کھیتوں میں مزدوری کررہے ہیں مگر ان کے حوالے سے کوئی آواز نہیں اٹھائی جاتی۔ کھلتے ہوئے پھولوں کو چننے والے بچوں کے چہرے مرجھائے ہوئے لگتے ہیں۔

اس گاؤں میں آپ کو کارل مارکس' لینن' چی گویرا اور ماؤزے تنگ کے شیدائی بھی ملیں گے جو ابھی بھی اپنے نظریات سے ٹس سے مس نہیں ہوئے' ان کا منہ بولتا ثبوت وانکی وسی میں قائم ایک قدیم عمارت کی وہ خستہ حال دیوار ہے جس پر آج بھی چی گویرا کی بڑی سی تصویر آویزاں ہے۔ رنگوں اور خوشبوؤں کی دنیا سے نکلتے ہوئے میں نے خادم حسین سے پوچھا کہ اس کی زندگی پھولوں کے ساتھ کیسی گزر رہی ہے۔ اس نے بس اتنا کہا۔

''ہم پھول چنتے ہیں مگر زندگی میں دکھوں کے اتنے کانٹے ہیں جن پر کسی بھی موسم میں بہار نہیں آتی۔''

☆☆..........☆☆

ان خاص لوگوں کی کہانیاں اور باتیں جن کے کام نے زمانے پر اپنے اثرات مرتب کیے

وحید مراد

افسانوی کرداروں سے شہرت پانے والے چاکلیٹی ہیرو کی امر کتھا

23 نومبر کو جن کی برسی منائی جارہی ہے

عمر خطاب خان

کتنی عجیب بات ہے کہ موت جو انسان سے سب کچھ چھین لیتی ہے! عزت، دولت، شہرت، دنیا اور اس کے معاملات، بے معنی ہوجاتے ہیں وہاں وحید مراد نے مرنے کے بعد ایسا دائمی عروج پالیا ہے کہ جسے فن اور فنکار کی



کہانی رہنے تک بھی زوال نہیں آئے گا اسی عروج اور کامرانی کی توقع وہ زندگی میں چاہتا تھا مگر نہیں جان سکا کہ یہ سب کچھ چھن جانے پر اس کی حالت کیا ہوسکتی ہے جو ساری زندگی شہرت کے نشے میں دھت رہا۔ وحید بھی جب تنہا رہ گیا تو ناکامی کا گھن اسے اندر ہی اندر چاٹتا رہا اور پھر ایک دن وہ سب کو بیقرار کرکے قرار پاگیا۔

سلور اسکرین کا چاکلیٹی ہیرو لیڈی کلر ویدو، مداح جس کے دیوانے تھے وہ صرف اس کی مدح سرائی ہی نہ کرتے تھے، عشق کرتے تھے اس لیے کہ ویدو نے ان کے دل میں گھر کرلیا تھا، اپنی فلموں میں اس نے اداکاری کے وہ انمٹ نقوش چھوڑے کہ ہر ایک کے تصور میں اس کا ماہتاب چہرہ کسی شہزادے کی تصویر کی طرح محفوظ ہوگیا۔ ایک زمانہ تھا جب لڑکیاں اپنے پرس میں ویدو کی تصویریں چھپائے پھرتی تھیں۔ نصابی کتابوں میں مطالعے کی آڑ میں ویدو کے دیدار کیے جاتے تھے، صرف یہی نہیں ٹین ایجرز اور کالج گوئنگ

لڑکوں میں بھی اس کا اتنا کریز تھا کہ سیلون بارز میں اس کے قد آور پوسٹرز سجے ہوتے تھے اور ہر دیوانہ اپنے پیارے ویدو کے اسٹائل میں ہیر کٹنگ کروانے کی فرمائش کرتا نظر آتا تھا...... پھر کیا ہوا؟ ویدو کے سارے دوست، سارے دیوانے کہاں چلے گئے؟ وحید کی فلمیں دھڑا دھڑ فلاپ ہونے لگیں اور اس کا دورِ زوال آیا تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ گیا! کبھی اسکرین پر ویدو کو اپنے مخصوص انداز میں گانا پکچرائز کراتے دیکھ کر سینما ہال میں موجود لوگ اس کی اداؤں پر جھوم اٹھتے تھے۔ میرے خیالوں پر چھائی ہے...... تھری چیئرز فار بھابھی ہپ ہپ ہرے...... جھوم اے دل کہ میرا جان بہار آیا ہے...... سوچا تھا پیار نہ کریں گے...... اور کتنے ہی سپر ہٹ ہیں جنہیں وحید کی وجہ سے بے حد مقبولیت ملی لیکن جب وہ ہیرو اپنوں



کے پرائے ہونے کے غم سے شناسا ہوا تو پھر اس نے اپنے چاہنے والوں کی اس صدا پر بھی دھیان نہ دیا کہ جوان کے دل سے نکلی آواز تھی...... اکیلے نہ جانا ہمیں چھوڑ کر تم تمہارے بنا ہم بھلا کیا جئیں گے......

اپنی پہلی پلاٹینم جوبلی ہٹ ارمان میں زیبا کے سنگ یہ گیت گنگنانے والے ویدو کو اندازہ نہ تھا کہ اس کے چلے جانے سے دنیا کا کوئی کام نہیں رکے گا اور نہ ہی اس کی کمی شدت سے محسوس کی



جائے گی کہ یہ اس دنیا کی ریت ہے جو زندوں سے زندہ رہنے کا حق چھین لیتی ہے لیکن مرنے والوں کی یہاں پرستش کی جانے لگتی ہے، وحید کے ساتھ بھی یہی ظلم ہوا، اس کی کہانی بھی دوسروں سے مختلف نہیں ہے لیکن وہ مر کر امر ہوگیا۔ ان روایتی فلمی کہانیوں کے ہیرو کی طرح جو اپنی محبت پانے میں ناکامی کے بعد جان دے دیتا ہے اور لوگوں کی ہمدردیاں پالیتا ہے، وحید نے بھی اپنی زندگی کے آخری ایام بے حد کرب میں گزارے ،کوئی اسے حوصلہ دینے والا نہ تھا، بیوی امریکہ میں تھی، ماں لاہور میں اور خود وحید کراچی میں کرنل ایوب کی کوٹھی میں زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ایسے میں اس ہیرو کے پاس کوئی چارہ نہ تھا کہ اپنی زندگی کی بازی ہار کر امر ہو جائے۔ آخر ویدو نے جان دے دی اور ہارتے ہارتے جیت گیا۔ 23 نومبر 83ء کی صبح وحید کے انتقال کی دلخراش خبر کے ساتھ طلوع ہوئی۔ تو کون نہیں جانتا تھا کہ موت وحید کے لیے سکون کا سامان کر

گئی، اگر وہ اور زندہ رہتا تو نہ جانے کتنے دکھ کتنی تکلیفیں اور الیے اسے مزید ستاتے۔

ایک ایسا ہیرو جو کبھی نہ غروب ہونے کے ارادے سے طلوع ہوا جب اس کی شہرت کو زوال آیا تو تقدیر نے اسے کیا کچھ نہ دکھایا۔ ویدو کی شخصیت ازدواجی زندگی اور کیریر کے حوالے سے کئی سوالات ہیں جو ہنوز معمہ ہیں۔

ہیرا اور پتھر، ارمان، دیور بھابھی، دوراہا،



ناگ منی، شمع، وقت اور جانے کتنی ہی ایسی فلمیں ہیں جن میں وحید مراد کے ساتھ لوگ ہنستے اور روتے نظر آئے۔ وحید کی چارمنگ پرسنالٹی میں وہ خاص کشش تھی کہ مداح اس پر دیوانہ وار فریفتہ تھے خصوصاً لڑکیوں کا یہ عالم تھا کہ وہ ویدو کی تصویریں اپنے پرس اور کتابوں میں چھپائے دل سے لگائے رکھتی تھیں۔ پاکستانی سینما کے حوالے سے شاید ہی ایسی کوئی دوسری مثال ملتی ہو کہ کسی اسکرین اسٹار نے اس حد تک مقبولیت حاصل کی کہ اسے فینومنیا کا درجہ حاصل ہوا۔ وحید کے بالوں کا اسٹائل، گانے پکچرائز کرنے اور ڈرامائی مکالمے ادا کرنے کا انداز ڈریسز اور جوتوں کا فیشن اس قدر پاپولر ہوئے کہ ان کا کریز سرحدیں عبور کرتا پڑوسی ملک بھارت میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔

سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والے وحید نے مستحکم کاروباری شخصیت نثار مراد کے گھر 2 اکتوبر 1938 کو آنکھ کھولی۔ نثار مراد اور ان کی بیگم شیریں ننھے وحید کی پیدائش پر اس لیے بھی بہت خوش تھے کہ وحید ان کے گھر آنے والی پہلی خوشی تھی۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے ان دونوں نے وحید کو بڑے ناز و نعم سے پالا اور اس کی ہر جائز و ناجائز فرمائش پوری کی گئی نتیجتاً بابا (گھر والے اسے پیار سے بابا کہتے تھے) ضدی اور خودسر ہوگیا۔ کھلنڈرے پن کا عنصر بچپن میں ہی اس کی شخصیت میں شامل ہوگیا اور وہ ایک ناپختہ انسان کے طور پر عمر کے تمام مراحل سے گزرتا چلا گیا۔ وحید کی موت کے عوامل پر ایک ماہر نفسیات نے تجزیہ کیا کہ چونکہ وحید نے بچپن میں بہت لاڈ و پیار دیکھا اور زندگی کی ان مشکلات کا سامنا نہیں کیا جو عام انسان کی راہ میں حائل ہوتی ہیں اور جو ایک انسان کو مضبوط، پختہ اور حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل بناتی ہیں لہٰذا اس کی شخصیت لاابالی پن کا شکار ہوگئی۔ یہی اسباب تھے کہ جن کی وجہ سے وہ اپنے زوال کے پیریڈ میں خاصا چڑچڑا، ہٹ دھرم اور مایوس ہوگیا تھا۔ نثار مراد نے بیٹے کو زندگی کی ہر آسائش دی اور ماں شیریں بیگم کی جانب سے اسے بے پناہ

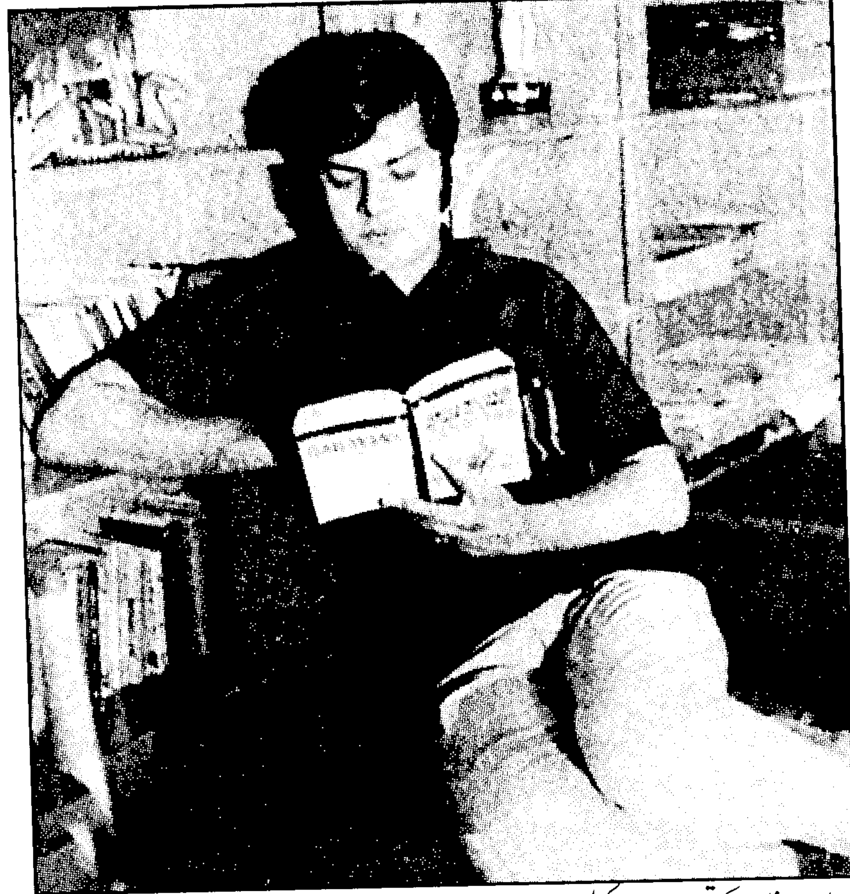


پیار ملا انہی رویوں کی توقع وہ دنیا سے بھی کرتا تھا لیکن جب ویدو نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو اسے احساس ہوا کہ یہ دنیا تو اس کے گھر کے ماحول سے بے حد مختلف اور متضاد ہے۔

ابتدا میں جب وحید نے اپنے والد کا ادارہ پاکستان فلمز جوائن کیا تو اسٹاف کے لوگوں نے بھی وحید کو سر آنکھوں پر بٹھایا اور اسے دنیا کی کم ظرفی اور سختیوں کا احساس نہیں ہونے دیا' لیکن جب وحید نے فلمسازی کی فیلڈ اپنائی اور اپنا پروڈکشن ہاؤس فلم آرٹس کے نام سے قائم کیا تو دھیرے دھیرے اسے لوگوں کے رویے سمجھنے کا موقع ملا، مگر اس نے ان چیزوں کو کبھی اہمیت نہ دی وہ اپنی ہی دنیا میں مگن رہا اور ان دنیاوی حقیقتوں سے کوئی سروکار نہ رکھا جن کو سیکھے اور جانے بغیر اور ان تلخ سچائیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے مقابلہ کیے بغیر کوئی انسان کندن بننے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ ان بنیادی تجربات سے محرومی کا احساس وحید کو تب ہوا جب اپنے آس پاس موجود لوگوں نے اسے نظر انداز کرنا شروع کردیا اور وہ دوستوں کی بے وفائی کے زخموں سے گھائل ہوا۔

لاابالی اور کھلنڈرا ہونے کے باوجود وحید نے تعلیمی میدان میں اپنے والدین کی امیدوں کو نہ توڑا اور ایوریج اسٹوڈنٹ کہلانے کے باوجود اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ نصاب

کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں وحید کا ریکارڈ بے حد شاندار رہا اور اسپورٹس کے علاوہ ڈرامیٹک فیلڈ میں بھی اس نے اپنے تعلیمی اداروں کا نام روشن کیا۔ وحید نے میری کلاکو سیکنڈری اسکول سے 1952 میں میٹرک (بی گریڈ) کیا' ان دنوں وحید کا گھر کراچی میں لسبیلہ



جماعت خانہ کے قریب اور اسکول سابقہ ناز سنیما (ایم اے جناح روڈ) کے عقب میں واقع تھا۔ وحید کے کلاس فیلوز میں ہدایت کار پرویز ملک اور موسیقار سہیل رعنا بھی آگے چل کر فلم لائن سے وابستہ ہوئے۔ اس اسکول کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں کئی فلمی اور قومی ہیروز نے تعلیم حاصل کی خصوصاً فلم انڈسٹری سے منسلک کئی اہم شخصیات کی اولادوں نے اس اسکول سے تعلیم پائی۔

میٹرک کے بعد وحید کے ساتھیوں سے راستے جدا ہوگئے اور وحید مراد سندھ مسلم سائنس کالج آگیا جہاں اس نے ایف ایس سی کیا اور جب سائنس مشکل لگی تو ایس ایم آرٹس کالج میں ایڈمیشن لے کر اس تعلیمی ادارے سے بی اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ دوستوں کا حلقہ

محدود ہونے کے باعث وحید کا زیادہ وقت اپنے گھر پر ہی کتابوں سے دل بہلاتے گزرتا خصوصاً انگلش کلاسیکی ادب میں اس کی دلچسپی گہری تھی۔ اس رجحان کے سبب وحید نے جب ایم اے کے لیے تیاری شروع کی تو ماسٹرز کرنے کے لیے انگلش لٹریچر جیسے مشکل مضمون کا انتخاب کیا جس میں وحید کی دلچسپی بہت زیادہ تھی۔ انگریزی ادب کے مطالعے اور پھر اس شعبے میں ماسٹرز کرنے کا فائدہ وحید کو اپنی اداکاری نکھارنے، اسکرپٹ لکھنے اور اپنی فلموں کے لیے موضوعات کے انتخاب میں مددگار ثابت ہوا۔ وحید نے کراچی یونیورسٹی سے 68 میں ماسٹرز ڈگری لی۔ ان دنوں وحید فلم انڈسٹری میں بے حد مصروف تھا اور نہ صرف فلم پروڈکشن کر رہا تھا بلکہ بطور اداکار بھی اس کی کئی فلمیں سیٹس پر تھیں جن کی شوٹنگز مکمل کرانے کے ساتھ ساتھ وہ ایگزام کی تیاری بھی کرتا رہتا۔ جن دنوں وحید کو 'اولاد' میں کاسٹ کیا گیا تھا اس وقت بھی سچویشن یہ تھی کہ وحید رات بھر فلم کی شوٹنگ کے لیے لاہور میں موجود رہتا اور پھر صبح کی فلائٹ سے کراچی آجاتا، جہاں اسے بی اے فائنل ایئر کا ایگزام دینا تھا، پیپر دینے کے بعد فوراً لاہور پہنچ جاتا، ان حالات میں بھی اس کے پیپرز اچھے ہوئے کیونکہ تعلیمی میدان میں وحید نے کبھی کمپرومائز نہیں کیا۔

وحید کے والد اور والدہ دونوں کا تعلق سیالکوٹ سے تھا اور اس پس منظر کے حوالے سے وہ ایک پنجابی فیملی سے تعلق رکھتے تھے لیکن گھر میں اردو اور انگریزی کا چلن زیادہ تھا کہ پوری فیملی ہی پڑھی لکھی اور رکھ رکھاؤ والی تھی۔ وحید نے فلم لائن میں 1960 میں بطور فلم ساز قدم رکھا مگر بطور اداکار اس کی پہلی فلم اولاد تھی' وحید کی شہرت کا سورج دراصل ہیرا اور پتھر کی کامیابی سے طلوع ہوا۔ یہ فلم 1964 میں ریلیز ہوئی اور اسی سال وحید نے سلمیٰ مراد سے شادی کر لی جو اس کی اپنی پسند اور والدین کی مرضی سے ہوئی۔

سلور اسکرین کے ہیروز کے حوالے سے مشہور ہے کہ شادی کر لینے کے بعد ان کی فین فالوئنگ متاثر ہوتی ہے لیکن دلچسپ بات ہے کہ شادی کی خبریں منظر عام پر آنے کے بعد بھی وحید مراد کی مقبولیت اور شہرت کے سلسلے کو بریک نہیں لگا اور وہ مقبول سے مقبول تر ہوتا چلا گیا۔ شادی کے بعد ہی اسے اسکرین پر اپنی ہیروئنز کے جذبات سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے الزام میں لیڈی کلر اور چاکلیٹی ہیرو کے خطابات سے نوازا گیا اور یہ وہ اعزازات تھے جو اس کی شخصیت کے ساتھ چپک کر رہ گئے اور وہ تمام زندگی اس امیج سے چھٹکارا نہ پا سکا۔

'ہیرا اور پتھر' کئی حوالوں سے وحید کے کیریر میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس فلم سے وحید، زیبا پیئر ہٹ ہوا، پرویز ملک، سہیل رعنا، وحید مراد پر مشتمل کامیاب تکون بنی اور نہ صرف فلم آرٹس نے اس فلم سے بے حد کمایا اور مستحکم پوزیشن حاصل کی بلکہ وحید مراد کو بھی راتوں رات صفِ اول کا ہیرو بنا دیا۔ ہیرا اور پتھر باکس آفس پر زبردست ہٹ ہوئی اور گولڈن جوبلی اسٹیٹس حاصل کیا۔ یہ وہ دور تھا جب فلمیں صرف ایک سینما پر ہی گولڈن اور ڈائمنڈ جوبلی منایا کرتی تھیں۔ ہیرا اور پتھر کے لیے وحید نے اپنی کاروباری دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے جو ٹیم اکٹھی کی وہ اپنے اپنے شعبوں میں قابل اور باصلاحیت افراد پر مشتمل تھی۔ میوزک ڈیپارٹمنٹ میں سہیل رعنا، نغمہ نگار مسرور انور، گلوکار احمد رشدی اور ڈائریکشن کے لیے پرویز ملک کا انتخاب زمانے کی ایک بہترین ٹیم کے جنم کا باعث بنا۔ پرویز ملک

ان دنوں نئے نئے امریکہ سے سینماٹوگرافی کا کورس کر کے آئے تھے اور کام کی تلاش میں تھے وحید چونکہ پرویز ملک کے بچپن کے دوست تھے اور ان کے ٹیلنٹ سے بخوبی واقف تھے لہٰذا جب وحید نے ہیرا اور پتھر پلان کی تو اس کے یونٹ میں اپنے دوست پرویز ملک کو بھی شامل کر لیا جو فلم آرٹس کا ایسا حصہ بن گئے کہ پھر اس ٹیم نے ارمان (پلاٹینم جوبلی)، احسان (گولڈن جوبلی) دوراہا (سلور جوبلی) جہاں تم وہاں ہم (سلور جوبلی) جیسی فلمیں بنائیں بدقسمتی سے جہاں تم وہاں ہم کے بعد یہ ٹیم اختلافات کا شکار ہو کر ٹوٹ گئی اور اس کا ذمے دار وحید مراد کے رویے کو ٹھہرایا گیا۔

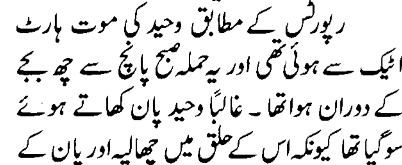
اگرچہ وحید کا عروج ہیرا اور پتھر سے شروع ہو چکا تھا لیکن جس فلم نے انہیں سپر اسٹار کی صف میں لاکھڑا کیا وہ اس کے ذاتی ادارے کی پروڈکشن ارمان تھی جسے پاکستانی سینما کی فرسٹ پلاٹینم جوبلی فلم ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ 1966ء کی ریلیز اس فلم میں وحید زیبا کی رومانوی جوڑی نے اسکرین پر ایسی زبردست کیمسٹری شو کی کہ دیگر ہیروئنز کو اپنے مستقبل کی فکر لاحق ہونے لگی اس فلم کے تمام گانے ہٹ ہوئے اور یہیں سے وحید کے کا گانے پکچرائزیشن کا انداز پاپولر ہوا۔ ارمان کے سپر ہٹ گانوں میں اکیلے نہ جانا، میرے خیالوں پر چھائی ہے...... اور جب پیار میں دو دل ملتے ہیں، اسٹریٹ پاپولرٹی کے درجے کو پہنچے اور ہر نوجوان وحید مراد کے انداز میں ماتھے پر پف گرائے نظر آنے لگا۔ ارمان سے فلم آرٹس نے اتنا کمایا کہ ادارہ مستحکم ہو گیا۔ کامیابی کا ہما وحید مراد کے ماتھے پر سجا دکھائی دینے لگا ارمان کے بعد وحید ایک کے بعد ایک ہٹ فلم دیتا چلا گیا اور حسن طارق، اقبال یوسف، شباب کیرانوی، خلیل قیصر، ایم اے رشید، فرید احمد، ایس سلیمان، افتخار خان اور نذرالاسلام جیسے بڑے ڈائریکٹرز وحید کو اپنی فلموں میں کاسٹ کر کے اس کے کریز کو کیش کراتے رہے۔ وحید کے لیے خصوصی کردار لکھے جانے لگے اور ہر فلم میں اس پر تین چار گانے بھی ضرور فلمائے جاتے کیونکہ اس شعبے میں اسے ماسٹر کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ لولی ووڈ کے سینئر ڈائریکٹرز اور موجودہ دور کے فلم میکرز کی متفقہ رائے ہے کہ وحید سے بہتر لپ سنگ کرنے والا کوئی اور ہیرو لولی وڈ میں نہیں آیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وحید کو میوزک کی سمجھ بوجھ تھی اور وہ موسیقی کی باریکیوں اور اس کی لطافتوں کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا یہ سمجھ بوجھ اس پر فلمائے گئے گانوں سے محسوس ہوتی ہے کو کو رینا...... جب رات ڈھلی...... بھولی ہوئی ہوں داستاں...... سوچا تھا پیار نہ کریں گے...... میرے دل کی ہے آواز...... اور دل کو جلانا ہم نے چھوڑ دیا...... جیسے ورائٹی سانگز میں وحید اپنے انداز سے ان گانوں میں رنگ بھرتا نظر آتا ہے کوریوگرافر کے اشاروں کو جس تیزی سے وحید پک کرتا تھا شاید ہی کوئی اور ہیرو اس حوالے سے اس

کا ثانی کہلا سکے۔ ارمان کے بعد وحید مراد کی شہرت کی گڈی اونچی اڑان اڑنے لگی تھی اور وہ دونوں فلمی مراکز لاہور اور کراچی میں اتنا مصروف ہو چکا تھا کہ اس کا ایک پاؤں کراچی میں ہوتا تھا اور دوسرا لاہور میں۔

شبنم کے ساتھ وحید نے آٹھ فلمیں کیں جن میں سے عندلیب، بندگی، نصیب اپنا اپنا اور سہیلی قابل ذکر ہیں۔ رانی کے ساتھ وحید نے سب سے زیادہ (بیس) فلمیں کیں جن میں دیور بھابی، دل میرا دھڑکن تیری، ناگ منی، انجمن اور لیلیٰ مجنوں ’بہارو پھول برساؤ‘ وغیرہ قابل ذکر اور یادگار ہیں۔ زیبا کے ساتھ وحید کی جوڑی ہیرا اور پتھر، ارمان کے علاوہ انسانیت احسان اور رشتہ ہے پیار کا وغیرہ میں پسند کی گئی۔ وحید مراد نے اپنے ذاتی فلم ساز ادارے فلم آرٹس کے بینر تلے بطور پروڈیوسر بارہ فلمیں بنائیں جن میں ارمان، احسان، مستانہ ماہی، ماں بیٹا، نصیب اپنا اپنا، انسان بدلتا ہے نے کامیابیاں حاصل کیں۔ جب سے دیکھا ہے تمہیں، سمندر، اشارہ، ماں بیٹا، جال، اور ہیرو بھی پروڈیوس کیں بطور مصنف وحید نے انسان بدلتا ہے کا اسکرپٹ اور آخری فلم ہیرو کے مکالمے تحریر کیے ایک فلم اشارہ کی ڈائریکشن بھی دی۔ اس کے علاوہ ایک فلم میں گلوکاری کا تجربہ بھی کیا۔

اسی کی دہائی کا آغاز وحید کے لیے مایوسیوں کی انتہا تھا۔ اوپر تلے پیش آنے والے حادثات نے اس کی زندگی کو ایک نیا رخ دے دیا۔ تقدیر وحید کے ساتھ جو کھیل کھیل رہی تھی اس کے لیے یہ سب حالات غیر متوقع تھے۔ 79 کی ایک چمکتی دوپہر لاہور میں فلم اسٹار کرکٹ کلب کی طرف سے دوستانہ میچ کھیلتے ہوئے ایک بیٹسمین کی تیز رفتار گیند وحید کی ہتھیلی کو چیرتی ہوئی نکل گئی زخم اتنا گہرا تھا کہ ہتھیلی پر سات ٹانکے آئے۔ اس حادثے کے نتیجے میں وہ کئی ہفتے تک کسی فلم کی شوٹنگ میں حصہ نہ لے سکا۔ 5 ستمبر 90 کو وحید شدید بیماری کے سبب بھی کئی دنوں تک اسٹوڈیوز کی لائف اور شوٹنگز سے دور ہو گیا۔ بیماری کا ایک اور شدید حملہ 6 جولائی 82 کو ہوا جس میں وہ بری طرح کمزور اور نڈھال ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کی تو السر سامنے آیا۔ 83ء میں وحید کے معدے کا ایک خطرناک آپریشن ہوا۔ اس آپریشن کے دوران جب خون کی فراہمی کے لیے اخبار میں تشہیر کی گئی تو ہزاروں مداح خون دینے کے لیے جمع ہو گئے۔ اس واقعہ سے اُن فلم میکرز کو وحید کی مقبولیت کا درست اندازہ ہوا جو اسے فلاپ ہیرو کہہ کر مسترد کر چکے تھے۔ 27 ستمبر 83 کو پیش آنے والا حادثہ دراصل وحید کے ارادوں کو متزلزل کرنے کے لیے آخری حملہ ثابت ہوا۔ ایک کار کے ایکسیڈنٹ میں اس کے ماتھے پر گہرا زخم آیا جو سر اسٹیرنگ سے ٹکرانے کے باعث شدید چوٹ کا نتیجہ تھا۔ زخم تو بھر گیا لیکن نشان رہ گیا جسے چھپانے کے لیے وحید بالوں کی پف بنا کر اسے ماتھے پر پھیلائے رکھتا۔ ان دنوں وحید کی ذاتی فلم ہیرو کی عکس بندی جاری تھی جو اس کی آخری پروڈکشن ثابت ہوئی۔ وحید کی یہ فلم وفات کے وقت نامکمل تھی جسے اقبال یوسف نے جیسے تیسے مکمل کر کے ریلیز کے قابل بنایا اس فلم میں وحید کا کردار اور ٹائٹل وحید کی اس سوچ کی عکاسی کرتا ہے کہ اس نے آخری وقت تک بھی اپنی ناکامی یا شکست کو قبول نہیں کیا تھا وہ ہیرو تھا اور ہیرو کی حیثیت سے ہی رخصت ہوا۔

22 نومبر کی شب وحید رات گئے تک گھر والوں سے گپ شپ کرتا رہا اور اس کے بعد اپنے کمرے میں سونے چلا گیا۔ وحید کا معمول تھا کہ وہ بیڈ پر جانے کے بعد دو ڈھائی گھنٹے بعد سوتا تھا اور اس



دوران کتابوں یا میوزک سے دل بہلاتا رہتا تھا۔ پان کھانا بھی اس کا مرغوب شوق تھا اور یہ سارے معمولات اس رات بھی وحید نے پورے کیے۔ لیکن جب صبح معمول کے مطابق دس بجے گھر کی ملازمہ وحید کو جگانے کے لیے گئی تو دروازہ اندر سے نہ کھلا! مکینوں کی تشویش فطری تھی لہٰذا کمرے کا دروازہ توڑ دیا گیا۔ دروازہ کھلتے ہی جو منظر ان کی آنکھوں نے دیکھا اس کے کرب اور اذیت سے وہی واقف ہیں جو اس وقت وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ وحید بستر سے گر کر فرش پر اوندھے منہ پڑا تھا اور نہ جانے کب سے اس حالت میں تھا۔ کرنل ایوب نے ڈاکٹر کو فون کیا جس نے چیک اپ کے بعد وحید کی موت کی تصدیق کر دی۔

رپورٹس کے مطابق وحید کی موت ہارٹ اٹیک سے ہوئی تھی اور یہ حملہ صبح پانچ سے چھ بجے کے دوران ہوا تھا۔ غالباً وحید پان کھاتے ہوئے سو گیا تھا کیونکہ اس کے حلق میں چھالیہ اور پان کے لوازمات موجود تھے۔ وحید کے انتقال کی اطلاع جونہی باہر آئی پورے ملک میں صف ماتم بچھ گئی۔ دوست دشمن سبھی مایوس پرملال اور اداس تھے۔ وحید کی والدہ کی حالت غیر تھی۔ ان کی خواہش کے مطابق میت لاہور لے جانے کا بندوبست کر دیا گیا، مگر کراچی میں موجود وحید کے دوستوں مداحوں اور پریس تک کو اس بات سے بے خبر رکھا گیا۔ انتہائی خاموشی اور راز داری کے ساتھ میت کو ایک تابوت میں رکھ کر چند لوگوں کی موجودگی میں لاہور کے لیے پی آئی اے کی پرواز سے روانہ کر دیا گیا جہاں وحید کے چچا سلیم مراد نے چند انتہائی قریبی رشتے داروں اور انڈسٹری کے گنے چنے لوگوں کے ساتھ میت وصول کی۔ کراچی سے صرف عادل مراد اور بیگم ممتاز ایوب ہی وحید کے قریبی رشتے داروں میں شامل تھے۔

24 نومبر 83 کو ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں وحید کا جنازہ اٹھا تو ہر آنکھ اشکبار تھی۔ وحید کی کوٹھی 5-72 واقع گلبرگ تھری کے باہر ہزاروں پرستاروں نے جنازہ اٹھنے سے پہلے ہی ڈیرے ڈال دیے تھے جو دور دراز علاقوں سے آئے تھے۔ وحید کی آخری آرام گاہ گھر کے عقب میں واقع قبرستان میں والد نثار مراد مرحوم کے پہلو میں تجویز کی گئی جہاں لاکھوں دلوں کی دھڑکن وحید کو دفنا دیا گیا۔ اس جنازے میں موجود وحید کے دوستوں کو بھی وحید کی جانب سے مذاق میں کہی وہ بات یقیناً یاد آئی ہو گی جب اس نے قبرستان کے قریب رہائش اختیار کرنے پر دوستوں کے استفسار پر جواب دیا تھا:

’’میں نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد اپنے دوستوں پر بوجھ بنوں، اسی لیے قبرستان کے قریب رہائش رکھی ہے!‘‘

☆☆......☆☆

مفلس کی جیب

W SOMERSET MAUGHAM

انگریزی سے ترجمہ: نجیب عمر

تھیٹر میں ڈرامے کے دوران میری اس پر نظر پڑی۔ اس کے اشاراتی سلام کے جواب میں وقفے کے دوران میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر جا بیٹھا۔ ایک عرصے قبل میں نے اسے دیکھا تھا۔ کسی نے اس کا نام لیا تو میری یادداشت پوری طرح جاگی ورنہ شاید میں اسے پہچان نہیں پاتا۔ اس نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔

”کئی سال گزر گئے جب ہم پہلی مرتبہ ملے تھے۔ وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے اب ہم دونوں میں سے کوئی بھی کمسن نہیں رہا تمہیں یاد ہے ہماری پہلی ملاقات۔ تم نے مجھے ایک لنچ کے لیے مدعو کیا تھا۔“

میرے خیالات ماضی کا در کھٹکھٹانے لگے۔

کوئی بیس برس پرانی بات ہے جب میں پیرس میں رہتا تھا۔ لیٹن کوارٹر Latin Quarter میں میرا ایک بہت ہی مختصر سا اپارٹمنٹ، شہر خموشاں کے پہلو میں تھا۔ میری آمدنی بہ مشکل اتنی تھی کہ میں اپنے جسم اور روح کے رشتے کو برقرار رکھ پاتا۔ اس نے میری کوئی کتاب پڑھی تھی اور میرے لیے ایک ستائشی خط لکھا تھا جواباً میں نے اس کا شکریہ ادا کیا' پھر مجھے اس کا خط ملا کہ وہ پیرس سے گزر رہی ہے اور ملاقات کی خواہش مند ہے۔ لیکن اس کے پاس وقت محدود ہے اور صرف آنے والی جمعرات میں قدرے فراغت ہے وہ صبح لکسمبرگ سے گزر رہی ہے اور کیا میں اسے ایک چھوٹے سے لنچ کے لیے فویوٹس Foyot`s میں مدعو کرسکوں گا؟

فویوٹس، پیرس کا وہ ریستوران ہے جہاں فرنچ سینیٹر کھانے کے لیے تشریف لایا کرتے ہیں چونکہ وہ میری استطاعت سے بہت پرے تھا لہذا میں نے کبھی وہاں جانے کا خیال تک دل میں نہیں لایا۔

میں اس کی چرب زبانی کا شکار ہوا دراصل میں اتنا کم عمر تھا کہ خواتین کو انکار کرنا ابھی سیکھ نہیں

پایا تھا

یہاں میں یہ اعتراف کرتا چلوں کہ خواتین کو انکار کرنے کا فن سن رسیدہ لوگ ہی جانتے ہیں کیوں کہ اس عمر میں انکار یا اثبات سے ان کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

میرے پاس فقط اسی فرانک تھے۔ میں طلائی فرانک کی بات کر رہا ہوں جو مہینے بھر کے لیے بڑی مشکل سے کافی ہوسکتا تھا اور ایک محدود لنچ میں پندرہ فرانک سے زیادہ خرچ نہیں ہونا چاہیے مہینے کے باقی دنوں میں کافی کی قربانی دے کر میں اس خسارے کو پورا کرسکتا تھا۔

میں نے اپنی دوست کو جواباً مطلع کیا کہ ساڑھے بارہ بجے دن ”فویوٹس“ میں اس کا منتظر رہوں گا۔

میری توقع کے خلاف اب وہ اتنی کم عمر نہیں رہی تھی' خود کو پرکشش ظاہر کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اب وہ چالیس سال کی معمر خاتون تھی۔ یہ عمر بھی اتنی زیادہ نہیں ہوتی لیکن پہلی نظر میں مقابل کے جذبات کو اتھل پتھل کرنے کی صلاحیت سے محروم۔ اس نے اپنے بڑے بڑے سفید اور ہموار دانتوں کی نمائش کی جس کی قطعی ضرورت نہیں تھی خصوصاً کسی عملی مقصد کے لیے۔ وہ باتونی تھی لیکن اس وقت مجھ سے متعلق گفتگو پر مائل تھی میں نے خود کو ایک مستحسن سامع کے طور پر پیش کیا۔

جب مینو میرے سامنے آیا تو قیمت دیکھ کر میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا جو میرے اندازے سے بہت زیادہ تھی۔

”میں لنچ میں کبھی کچھ نہیں کھاتی۔“ اس نے مجھے متوجہ کیا۔

”ایسا نہ کہیں۔“ میں نے فرماں برداری کا مظاہرہ کیا۔

”میں مختصر سی ایک ڈش کے علاوہ لنچ میں کچھ اور نہیں لیتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ آج کل لوگ بہت زیادہ کھاتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی مچھلی میرے لیے کافی ہوگی خوشگوار حیرت ہوگی اگر ان کے پاس سالمن Salmon ہو۔“

”اس موسم میں سالمن دستیاب نہیں ہوتا اسی لیے مینو میں بھی مذکور نہیں۔ لیکن میں ویٹر سے پوچھ لیتا ہوں، اگر ممکن ہو۔“

ویٹر نے خندہ پیشانی سے جواب دیا ابھی ابھی ایک خوبصورت سی سالمن ریستوران میں لائی گئی ہے۔ یہ پہلا سالمن ہوگا جسے پیش کرنے کا اعزاز ہم حاصل کریں گے۔

میں نے بوجھل دل سے اپنی مہمان کے لیے آرڈر دے دیا۔ ویٹر نے نہایت مودبانہ طریقے سے دریافت کیا کہ جب تک سالمن تیار ہو مادام کی خدمت میں کچھ اور پیش کیا جائے۔

”نہیں“ اس نے جواب دیا۔ ”میں لنچ میں ایک سے زیادہ کوئی دوسری چیز نہیں لیتی سوائے اس کے تمہارے پاس تھوڑا سا کیویارے Caviare (مچھلی کا انڈہ جسے اشتہا انگیزی کے لیے کھایا جاتا ہے۔) بس اس کی اجازت ہے۔“

میرا دل ڈوبنے لگا کیوں کہ کیویارے کی قیمت چکانے کے قابل نہیں تھا۔ لیکن میں کسی طور اس کا اظہار نہیں کرسکا۔ میں نے تمام قوت مجتمع کرکے ویٹر سے کہا ”کیویارے لائے“ اور اپنے لیے سب سے سستی ڈش مٹن چاپ پسند کیا۔

”میں سمجھتی ہوں کہ مٹن کھا کر تم کسی عقلمندی کا مظاہرہ نہیں کررہے۔“ اس نے کہا

”تم چاپ جیسی بھاری چیز کھا کر کام کیسے کرسکو گے۔ میں ہرگز تمہاری طرح اپنے پیٹ کو

گراں بار نہیں کر سکتی۔''

اس کے بعد مشروب کی باری آئی۔

''میں لنچ میں کوئی مشروب نہیں لیتی۔''

میں نے خود اتفاق کیا ''میں بھی لنچ میں مشروب سے پرہیز کرتا ہوں۔''

''سوائے سفید شراب کے۔'' اس نے اس طرح اضافہ کیا جیسے میری سنی ہی نہیں۔

''فرانسیسی سفید شراب نہ صرف ہلکی ہوتی ہے بلکہ ہاضمے کے لیے معاون بھی۔''

اس نے روشن روشن اپنے سفید دانتوں کی خوشامدانہ جھلک دکھائی اور کہا ''میرا ڈاکٹر مجھے Champagne کے علاوہ اور پینے کی اجازت نہیں دیتا۔

یہ سن کر میرا چہرہ زرد پڑ گیا۔ میں نے نصف بوتل کا آرڈر دیا اور اسے بتایا کہ میرے ڈاکٹر نے مجھے شمپین پینے سے سختی سے روک رکھا ہے۔''

''تو پھر تم کیا پینے والے ہو۔''

''پانی۔'' میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

اس نے کیویارے کے بعد سالمن پر ہاتھ صاف کیا۔ اس دوران میں وہ آرٹ ادب اور موسیقی پر پرجوش گفتگو بھی کرتی جا رہی تھی اور میں اس فکر میں مبتلا تھا کہ بل کا کیا بنے گا۔

جب مٹن چاپ میرے سامنے لا کر رکھا گیا تو اس نے بڑی توجہ سے مجھے سمجھانا شروع کیا۔

''میں دیکھ رہی ہوں کہ تم بہت گراں بار لنچ لینے کے عادی ہو۔ تم یہ غلط کرتے ہو تمہیں میری تقلید کرنی چاہیے۔ لنچ میں سوائے ایک ڈش کے اور کچھ نہیں لینا چاہیے۔ اگر تم اس پر عمل کرو تو اس کا فائدہ محسوس کرو گے۔''

میں ویٹر کو اپنی جانب مینو لے کر آتا دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھا ''میں نے صرف ایک ہی چیز کھانی ہے۔''

محترمہ نے ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ویٹر کو اپنی جانب بلایا۔

''نہ نہ، میں لنچ میں ایک چیز کے علاوہ کچھ اور لے ہی نہیں سکتی۔ لیکن ایک ٹکڑا، فقط ایک ٹکڑا۔ اس سے زیادہ مجھے ہرگز نہیں چاہیے اور وہ اضافی ٹکڑا بھی صرف گفتگو کے درمیان چبانے کے لیے...... ناممکن ہے کہ میں اس کے علاوہ کچھ اور کھا سکوں۔ میں Asparagus کی بات کر رہی ہوں (ایک مخصوص سمندری پودا جس کے ڈنٹھل کے گودے سے بنی ہوئی ڈش) ان کے پاس اگر وہ بڑے Asparagus ہوں تو اسے نوش کیے بغیر میں پیرس چھوڑنے کا تصور نہیں کر سکتی۔''

میرا دل بری طرح سے ڈوبنے لگا۔ میں Asparagus دکانوں پر دیکھ چکا تھا وہ انتہائی مہنگے ہوتے ہیں۔ میرے منہ میں اکثر اسے دیکھ کر پانی بھر آیا لیکن کھانے کے متعلق کبھی سوچا بھی نہیں۔

میں نے بے دلی سے ویٹر سے دریافت کیا کہ مادام جاننا چاہتی ہے کہ اگر آپ لوگوں کے پاس بڑے اسپراگس ہوں۔

میں نے اپنے تئیں پوری کوشش کی کہ ویٹر کا جواب انکار کی صورت میں آئے۔ لیکن اس کے چوڑے چکلے جذبات سے عاری چہرے پر ایک مسکراہٹ افقی سطح پر پھیل گئی۔

اس نے یقین دلایا کہ ان کے پاس بہت بڑے شاندار اور انتہائی گداز اسپراگس موجود ہیں جو بے مثال ہیں۔

''میری بھوک قطعی معدوم ہو گئی ہے۔'' میری مہمان نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو میں تھوڑا سا لے لوں گی۔''

میں نے آرڈر دے دیا۔

ویٹر نے پوچھا آپ نہیں لیں گے؟ میں نے جواب دیا۔

''میں اسپراگس نہیں کھاتا۔''

''میں ایسے لوگوں کو جانتی ہوں جو اسپراگس پسند نہیں کرتے اور حقیقت یہ ہے کہ تم نے مٹن چاپ سے ہونٹ کا بالائی حصہ تک لتھڑ لیا ہے۔ اب تم حلق سے کچھ اتار نہیں سکتے۔''

میری خاموشی، فرماں برداری کے اعلیٰ معیار کا مظہر تھی۔

ہم انتظار کرتے رہے اسپراگس پک کر ہماری میز تک آئے۔

خوف نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ اب سوال یہ نہیں تھا کہ مہینہ کے باقی ماندہ دنوں کے لیے کتنے فرانک بچ رہتے ہیں۔ اب تو یہ غم لاحق تھا کہ سارا بل دے پاؤں گا' یا شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔

مجھے شرم سے پانی پانی کر دینے کے لیے یہی کافی تھا کہ چند فرانک کم پڑ جائیں اور مجھے اپنی مہمان کے سامنے دست سوال پھیلانا پڑے اور یہ مجھ سے کسی طور ہو نہیں سکتا تھا۔

یہ تو میرے علم میں تھا کہ میری جیب میں کتنی رقم ہے۔ جب بل آئے گا تو میں اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ڈراما کروں گا کہ میری جیب کٹ چکی ہے۔

لیکن کیسی عجیب بات ہوگی اگر مہمان خاتون کے پاس بھی ادائیگی کے لیے رقم نہ ہو تو پھر یہی صورت رہ جائے گی کہ میں اپنی گھڑی کیشیئر کے پاس یہ کہہ کر چھوڑ جاؤں کہ میں بعد میں ادائیگی کر کے لے جاؤں گا۔''

اب اسپراگس ہمارے سامنے تھا۔ وہ بہت شاندار، گداز اور اشتہا انگیز تھے۔ اس پر چھڑکے مکھن کی بو میرے نتھنوں کو پھڑکا رہی تھی جیسے دیوتا کے نتھنے اپنے سامنے تلی ہوئی مخلوق کو دیکھ کر

معتبر کر دے!

بس تجھ سے یہ نہیں کہتی کہ معتبر کر دے
میرے خدا میرے نالوں میں کچھ اثر کر دے

تیرے اشارہ، کُن فیکون پہ ہے یقیں مجھ کو
غمِ حیات کی راتوں میں بھی سحر کر دے

میری دعاؤں کو ہو گر قبولیت کا شرف
تیرا کرم ہو کہ اِس ماں کو سرخرو کر دے

میں سربسجود رہوں کاش صحنِ کعبہ میں
نصیب کوئے مدینہ میرا سفر کر دے

الٰہی وقتِ نزع یہ ہوں مشکلیں آساں
بصد سکون میرا آخری سفر کر دے

عندلیب سلمیٰ

پھڑ کتے ہیں۔

میں اس لاپروا خاتون کو اپنے حلق میں اسپراگس کے بڑے بڑے قاش کو ندیدے پن سے گھسیڑتے ہوئے دیکھتا رہا اور میں اپنی فرماں برداری میں اس کے سامنے بالکن Balkan میں ہونے والے ڈراموں پر تبصرہ کرتا رہا۔

بالآخر اس نے پلیٹ صاف کر دی۔

''کافی ؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں ایک آئسکریم پھر کافی۔''

اب میں اس کی مدارات سے ہاتھ کھینچنے جا رہا تھا۔

لہذا میں نے اپنے لیے صرف کافی اور اس کے لیے حسب منشا آرڈر دیا۔

''تمہارے علم میں ہوگا کہ میں اس پر سو فیصد یقین رکھتی ہوں۔'' جیسے ہی اس نے آئسکریم ختم کیا' گویا ہوئی'' کھانے سے اس وقت ہاتھ کھینچ لینا چاہیے جب تھوڑی سی بھوک باقی رہ جائے۔''

''کیا تم اب بھی بھوکی ہو۔'' میں نے مردہ لہجے میں پوچھا

''ارے نہیں میں سیر ہو چکی ہوں۔ آپ دیکھیں میں لنچ کرتی ہی نہیں۔ صبح ایک کپ کافی۔ اس کے بعد رات کا کھانا۔ لنچ میں فقط کوئی ایک چیز لیتی ہوں۔ یہ تو میں تمہارے لیے کہہ رہی ہوں۔''

''اچھا' میں سمجھا۔''

اس کے بعد ایک وحشت کا سامنا تھا' ظاہر ہے میرے لیے۔

ہم جب کافی کا انتظار کررہے تھے۔ ہیڈ ویٹر اپنے مکار چہرے پر خوشامدانہ مسکراہٹ سجائے ایک بڑی سی ٹوکری میں بڑے بڑے آڑو لیے حاضر ہوا۔

ان پر ایک معصوم لڑکی کے گالوں کی لالی تھی۔

ان پر اٹلی کے سبزہ زاروں کا گاڑھا رنگ بھی تھا لیکن یہ آڑو کا موسم ہرگز نہیں تھا۔ ان دنوں ان کی کیا قیمت ہوگی...... یا خدا جانتا تھا یا میں۔

چند لمحوں بعد میری مہمان نے گفتگو کے درمیان بے خیالی میں ایک آڑو اٹھا لیا۔

''اب دیکھیں آپ نے اپنا پیٹ گوشت سے پر کر لیا ہے۔'' (میرے اکیلے وتنہا مٹن چاپ کا ذکر ہو رہا ہے۔) ''اب تم اور کچھ نہیں کھا سکتے۔ چونکہ میں نے معمولی سا لنچ لیا ہے اس لیے آڑو سے لطف اٹھا رہی ہوں۔''

جب بل آیا تو میں نے دیکھا کہ ادائیگی کے بعد میرے پاس ٹپ کے لیے غیر مناسب رقم بچی ہے۔

ایک لمحے کے لیے اس کی نگاہیں میز پر رکھے تین فرانک پر لمحے بھر کو رکیں جو میں نے ویٹر کے لیے بطور ٹپ چھوڑا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ خاتون مجھے کنجوس سمجھ رہی ہوگی۔

جب میں فویوٹس سے باہر نکلا تو میرے سامنے مہینہ پڑا تھا اور جیب میں ایک پینی بھی نہیں۔

''میری مثال سامنے رکھو۔'' اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا'' لنچ میں ایک سے زیادہ کوئی دوسری چیز نہ کھاؤ۔''

''میں اس سے زیادہ پر عمل کروں گا۔'' میں نے طنز کیا۔

''آج رات میں کچھ بھی نہیں کھاؤں گا۔''

اس نے خوشی سے چیختے ہوئے کہا ''ہمیشہ کے خوش مزاج۔''

لیکن میں نے بھی انتقام لے ہی لیا تھا۔ اگرچہ میں منتقم مزاج نہیں ہوں لیکن جب لافانی دیوتا کسی معاملے میں کود پڑتے ہیں آپ کا اطمینان سے نتیجہ دیکھنا قابل معافی ہوجاتا ہے۔

آج اس کا وزن یقیناً بڑھ جائے گا۔

☆☆......☆☆